کبوتر با کبوتر
ابدال بیلا

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
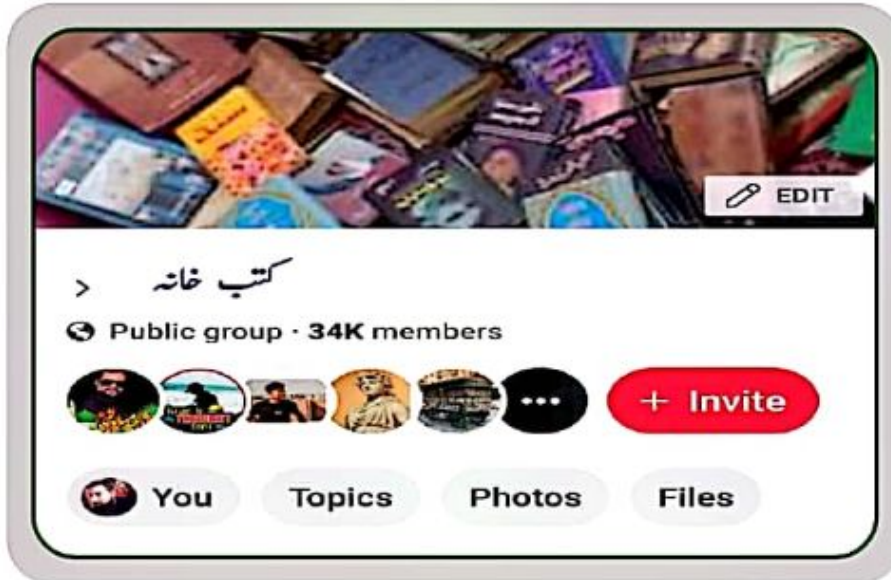
عقاب : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

ابدال بیلا

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

اپنی لاڈلی بیٹی

لائبہ ابدال بیلا

کے نام

جو میرے قلم

اور میری لکھی کتابوں کی وارث ہے

ابدال بیلا

891.4394 Bela, Abdaal
Kabootar Ba Kabootar/ Abdaal
Bela.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2014.
280pp.
1. Urdu Literature - Essays.
I. Title.

2014ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2768-2
ISBN-13: 978-969-35-2768-1

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

کبوتر با کبوتر
ابدال بیلا

ترتیب

شخصیات

مونچھ مروڑ

سیانے کہتے ہیں کہ ہر شخص کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جسمی، ذہنی اور جذباتی۔ عام طور پر ان تینوں میں ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ انسانی شخصیت کی ہوری میں یہ پہلی رنگ پچکاری ہے۔ ابدال بیلا کی جسمی عمر ۳۵/۳۴ سال ہے۔ اس کی ذہنی عمر کسی صورت ۶۰ سے کم نہیں اور جذباتی عمر کوششوں کے باوجود ۱۶ سال سے آگے نہیں جا سکی۔

ظاہر ہے کہ اس کی شخصیت میں ایک بے ربط محفل بجی ہوئی ہے۔ ایک طرف مونچھ مروڑنے والا جوان اور دوسری طرف سوچوں کا مارا ہوا دانا پردانا ہے اور تیسری طرف ایک کھلنڈرہ منہ زور بچہ۔ پتہ نہیں ان تینوں کی آپس میں کیسے نبھ رہی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انوکھا سازینہ بج رہا ہے۔ ایک ساز کی لے درت ہے دوسرے کی بلمپت تیسرے کی پاپ۔

ابدال بیلا کو باہر سے دیکھو تو ایک پہلوان کھڑا ہے۔

ماجھے کا راجپوت مونچھ مروڑ رہا ہے۔

ایک لیڈیز مین گلیڈ آئی چمکا رہا ہے۔ مسکا رہا ہے۔

ایک فوجی جوان وطن کی محبت میں سرشار منتظر ہے کہ کب جہاد کا حکم ملے۔

جائنٹ فیملی کا سردار طرہ لگائے ایستادہ ہے جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔

قریب جاؤ تو نہ وہ پہلوان رہتا ہے نہ ماجھے کا بنرا، ایک ذہنی آدمی ہے سوچوں میں ڈوبا ہوا۔ گردوپیش منصوبوں کے جالے بنے ہوئے ہیں۔

ادبی منصوبے

ثقافتی منصوبے

حیرت کی بات ہے کہ یہ منصوبے ذات سے تعلق نہیں رکھتے۔

معاشرے سے متعلق پاکستان سے متعلق

باہر سے دیکھو تو لگتا ہے کہ بیلا ایک فیکیڈ ہے عالی شان فیکیڈ۔ صرف فرنٹ ہی فرنٹ۔ جس کے اندر کچھ نہیں ہے بلکہ اندر وجود ہی نہیں رکھتا۔ صرف باہر ہی باہر ہے۔

عجیب بات ہے کہ اندر کی روشنی باہر تک نہیں پہنچتی۔ کیسے پہنچے۔ باہر ہنڈوں کی جگمگ ہے، اندر کے مٹی کے دیے کی لو باہر کی جگمگ میں سہمی کمنی رہتی ہے۔

ابدال بیلا کے اندر باہر میں ایسا تضاد ہے جیسے تربوز میں ہوتا ہے۔ باہر ہرا کچور اندر لال سوہا

یہ اندر باہر کا تضاد ہی شخصیت کی سج دھج ہے

یہی رونق خانہ ہے

یہی مسرت بھرے قہقہے ہیں

یہی دکھ بھرے آنسو اور ٹھنڈی آہیں ہیں

پرانے قلمکار بڑے سیانے تھے وہ شخصیت کی بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ اس پرزم کی ہفت رنگی کی بات نہیں کرتے تھے بلکہ باہر کھڑے ہو کر جائزہ لیتے

تھے۔ جبھی انہوں نے شخصیت کو خاکہ نگاری کا نام دے رکھا تھا کہ قد کیسا ہے۔ جسم بھرا بھرا ہے سکڑو۔ قلم کون سی جیب میں رکھتے ہیں۔ ڈیسک پر بیٹھ کر لکھتے ہیں یا میز پر۔ مطلب ہے صرف آؤٹ لائن ہی آؤٹ لائن۔ لکیریں ہی لکیریں۔ اندر کی گھمن گھیریاں نہیں۔ باہر کی آڑی ترچھی لکیریں۔ ابدال بیلا کی باہر کی لکیریں دیکھو تو عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے مشہور گیت کا بول چھم سے آ کھڑا ہوتا ہے۔

تینوں چک کے لے جانا میانوالی۔ تینوں چک کے

یہ گورکھ دھندا مجھ پر ۱۹۷۹ء میں نازل ہوا۔ نزول کی تفصیلات یوں ہیں کہ ایک روز ڈاک سے مجھے ایک کتاب موصول ہوئی ایک خط ملفوف تھا۔ یہ میرے شائع شدہ افسانوں کے پہلے مجموعے کی پروف کاپی ہے۔ جب تک آپ اس پہ اپنی رائے قلم بند نہیں کریں گے۔ یہ کتاب شائع نہیں ہوگی۔

واہ کیا انوکھی دھونس ہے میں نے سوچا۔ نئے افسانے نگاروں کی جانب سے مطالبات تو اکثر موصول ہوتے رہتے تھے۔ ایسی کھلی دھونس کبھی موصول نہ ہوئی تھی۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ کتاب کے وہ پروف کھلے کاغذات کی شکل میں نہ تھے۔ انہیں کتاب کی شکل میں سی کر جلد بندی کی ہوئی تھی۔ یا اللہ اتنا اہتمام۔ ایک طرف جذبے کی شدت دوسری جانب کر دکھانے والا عمل۔

خط کے نیچے ابدال بیلا کے ساتھ طالب علم فائنل ایم بی بی ایس دیکھ کر میرا فلوس اڑ گیا۔

یا اللہ یہ ابدال بیلا کیا چیز ہے۔

ایم بی بی ایس کا آخری سال تو سر کھجانے نہیں دیتا اور یہ میاں افسانہ نویسی اور مجموعہ بازی کے اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔

بہر طور ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ اس شخص کو ٹرخانا آسان کام نہیں۔ کہانیاں

پڑھیں تو حیرت ہوئی، سیدھی سادھی کہانیاں ایک تھا بادشاہ، اس کی ایک رانی۔

نہ علامت نہ تجرید

نہ کھوج لگاؤ نہ راستہ تلاش کرو

ابدال بیلا کی شخصیت کے متعلق میرے ذہن میں کھچڑی سی پک گئی

ماڈرن بھی ہے

روایت بھی ہے

خوابوں کا مارا ہوا ہے

سراسر عمل بھی ہے

کہانیوں میں بڑی جان ہے۔

انداز بیان میں خود اعتمادی ہے

پبلک ریلیشنز کا یہ عالم ہے کہ طالب علمی کے دور میں پبلشر کو پھنسایا ہے اور وہ بھی صف اوّل کا پبلشر۔

جذبے میں شدت ہے

پلاننگ میں دور اندیشی ہے

عقیدت کا قوام بڑا گاڑھا ہے۔

اور ساتھ دھونس بھی ہے۔

یا اللہ یہ ابدال بیلا کیا چیز ہے۔

ابدال بیلا سے پہلی ملاقات پر میں چکرا گیا۔

میرے روبرو ایک اجنبی کھڑا تھا۔ مونچھیں تنی ہوئی تھیں۔

آنکھوں سے لگاؤ کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

کہنے لگا میں ابدال بیلا ہوں۔

مجھے یقین نہ آیا۔ سمجھا کوئی بہروپیہ ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ ایسے حلیے والا میرا کوئی دوست نہ تھا۔ بلکہ ایسے حلیے والا شخص میرا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان اجنبیت کا دبیز پردہ پڑا رہا پھر اس کی باتوں نے آہستہ آہستہ برف پگھلائی۔

جب ہماری بے تکلفی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ میں نے کہا ایک بات بتاؤ۔ تم نے اپنی کتاب گڈ مڈ تبصرے کے لیے مجھے کیوں بھیجی تھی۔ میں تو ناقد نہیں ہوں۔

اس نے کہا میں نے ''گڈ مڈ'' اپنی مرضی سے آپ کو نہیں بھیجی تھی۔ تو پھر میں نے پوچھا۔

بولا ساری شرارت ''لبیک'' کی تھی۔ مجھے ''لبیک'' ہو گئی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ''لبیک'' کے مصنف سے ضرور ملوں گا اینڈ ہیر آئی ایم، تمہیں لبیک کیسے ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

بولا پتہ نہیں۔ اتفاق سے ہاتھ لگ گئی۔ پڑھی تو چھٹ گئی۔ ان دنوں میں ہوسٹل کی ڈارمیٹری میں رہتا تھا۔ وہاں شوقیہ لیٹ نائٹ مطالعہ مناسب نہ تھا اس لیے میں اسے گریز اناٹمی میں چھپا کر پڑھتا رہا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ پڑھتے پڑھتے آنسو نکل آئے۔ پھر دو تین کراہیں نکل گئیں۔ ڈارمیٹری کے لڑکے حیرت زدہ ہو گئے۔ ارے یہ بیلا کو کیا ہوا گریز اناٹمی پڑھتے ہوئے آنسو بہا رہا ہے، کراہ رہا ہے جیسے محبوبہ کا خط پڑھ رہا ہو۔ پھر لبیک میں جب وہ باب آیا جہاں اللہ حرم کے باہر کھڑا لوگوں سے کہتا ہے کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اس ڈارمیٹری میں آ گیا بولا آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا ذرا ٹھہرو۔ میں نے وضو کیا کپڑے بدلے خوشبو لگائی اور اللہ کی انگلی پکڑ لی۔ وہ مجھے قریبی مسجد میں لے گیا۔

دن چڑھے واپس آیا تو لڑکے پوچھنے لگے اب او ڈان جان کے بچے یہ والی نئی

محبوبہ کون سی ہے جسے تم ملنے گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت، پہلے غسل کیا پھر کپڑے بدلے خوشبو لگائی۔ ہم کانی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔

ابدال بیلا۔ پولیس، دیانت، اینٹی فیملی پلاننگ، ایڈونچر اور عشق کی پیداوار ہے۔ دو آبے کے اونچے لمبے۔ سواچھی فٹی مونچھ مروڑ خاندان کا فرد ہے۔ بزرگوں کو کثرت اولاد کی بیماری لاحق تھی۔ نانا کے ۷ بھائی تھے۔ والد فوت ہوئے تو ترکہ میں چھ بیٹے تین بیٹیاں اور ڈبل بیرل بارہ بور بندوق چھوڑ گئے۔ بیلا کے آباؤ اجداد سب پلسیئے تھے۔

والد چالیس سال پولیس کی نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پولیس میں اسلام اور دیانت کی بیماری عام تھی۔ آج کل تو اللہ کے فضل سے پولیس صحت مند ہو چکی ہے کچھ زیادہ ہی صحت مند۔

اس زمانے میں تفتیشی حوالدار تفتیش پر دیہات میں جاتا تھا تو مٹی کے لوٹے میں آٹا اور گڑ کی بھیلی ساتھ لے جاتا تھا۔ مسجد کے حجرے میں قیام کرتا تھا۔ مونچھ مروڑ کر باہر نکلتا تو غنڈے تھر تھر کانپتے تھے۔ تھر تھر کانپنا حوالداری یا قد کاٹھ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ لوٹا بھر آٹا اور گڑ کی بھیلی کی وجہ سے تھا۔

آج بھی دیانت دار افراد پولیس میں ملتے ہیں۔ خال خال سہی پر ہیں۔ پتہ نہیں اللہ کا یہ کیسا دستور ہے۔

غلاظت سے ہرا بوٹا اگاتا ہے۔

شر کے ڈھیرے سے خیر کا پھول کھلاتا ہے۔

مجھے ایک ایسے ایس ایچ او سے ملنے کا اعزاز حاصل ہے۔ جس کا گھوڑا مفت کی گھاس کو منہ نہ لگاتا تھا۔ ابدال بیلا اس دور کے پولیس تھانوں میں پل کر جوان ہوا۔ باپ کے ساتھ تفتیش پر جانا اس کے لیے بڑی عشرت تھی۔ پیدل چلتا۔ لوٹے کے آٹے کی روٹی گڑ کے ساتھ کھاتا اور مونچھ مروڑتا۔ ابدال بیلا کو عشق ورثہ میں ملا ہے۔

والد ساری زندگی بری طرح عشق میں سرشار رہے۔ اپنا سارا کیریر عشق کی بھینٹ چڑھا دیا۔ افسر محبوبہ کے طعنے دیتے رہے۔ انہوں نے چودھری فضل دین کی ترقی بند کردی۔ چودھری نے کہا کہ کچھ پرواہ نہیں۔ بریشم قلندر۔ محبوبہ جان کی قربانی مانگے تو وہ بھی حاضر ہے۔ یہ محبوبہ بی بی مسلم لیگ تھی۔ پاکستان تھی۔ جس کا عشق چودھری فضل دین کے زندگی بھر سر پر سوار رہا۔

ابدال بیلا کو وراثت میں جو عشق ملا اس کی کوئی سمت نہ تھی۔ خالی خولی عشق۔ صرف شدت ہی شدت، مجنونانہ بھی۔ فرہادی عشق۔

سب سے پہلا دورہ اس وقت پڑا جب بیلا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے چار ایک نہریں کھود دیں۔ گمان غالب ہے کہ بیلا ایوان ادب میں عشق کے دروازے سے داخل ہوا۔ لکھنے کے شوق کی ابتدا لولیٹرز سے ہوئی۔

بیلا لولیٹر لکھنے میں اپنے وقت کا ابوکلام جمع ابوالاثر ہے۔

اس کے عشقیہ خطوط کے سامنے مثنوی زہر عشق کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

جن لڑکیوں کو بیلا نے لولیٹر نہیں لکھے انہیں اللہ کے حضور دو نفل شکرانے کے ادا کرنے چاہئیں۔

کالج میں بیلا پہلے تو مضمون نگاری کے پردے میں عشق جھاڑتا رہا۔ پھر اس پر انکشاف ہوا کہ کہانی کے پردے میں بھی لولیٹر لکھا جا سکتا ہے۔ گورنمنٹ کالج میں مرزا محمد منور اور مشکور حسین یاد جیسے اساتذہ ملے۔ سونے پر سہاگا ہوگیا۔ راوی کا نائب مدیر بن گیا۔

میڈیکل کالج میں کوایجوکیشن تھی لہٰذا خوب کھل کھیلا۔

ایک جانب عشق۔

دوسری جانب ادب۔

دونوں کو پیسے لگ گئے۔

قمیضوں پر لپ سٹک کے نشان بھابھیوں سے چھپ چھپ کر خود ہی دھوتا۔ جوں جوں قمیضوں پر نشانات شوخ ہوتے گئے توں توں کہانیاں ''جنگ'' اور ''نوائے وقت'' میں توجہ طلب ہوتی گئیں۔

ہاؤس سرجن ہوا تو نوائے وقت میں خبر چھپی۔

''خدا جانے بیلا کے کس ہاتھ میں قلم ہے اور کس ہاتھ میں نشتر۔''

سارا اعجاز لو لیٹرز کا تھا۔ صاحبو آپ ان لو لیٹرز کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

میں وہ بد قسمت ہوں جو لگا سکتا ہوں۔

۱۹۸۴ء میں گنگا رام کے ایمر جنسی وارڈ میں بیلا نے ایک مریضہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تو اپنی نبضیں چھوٹ گئیں۔

پھر لو لیٹرز کا ایک طوفان آ گیا۔

آپ جانتے ہیں کہ عشق کے مارے ہوئے کو ایک رازداں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میری بد قسمتی کہ بیلا نے اس کارِ خیر کے لیے مجھے چن لیا۔

زبردستی۔

پہلا راز نامہ جو مجھے موصول ہوا وہ محبوبہ کے خدوخال کے بارے میں تھا۔ کہ ناک کیسی ہے۔ آنکھ کیسی ہے نگاہ کی دھار کتنی تیز ہے بولتی ہے تو کس طرح پھول جھڑتے ہیں۔ مسکاتی ہے تو کتنے وولٹ بجلی کی کرنٹ جزیٹ ہوتی ہے۔ یہ خط سراپا پر محدود تھا پورے گیارہ فل سکیپ لیٹر پیپرز پہ سراپا کہانی لکھی ہوئی تھی۔

دوسرا خط صرف بالوں پر تھا۔ کتنے لمبے ہیں کتنے چمکیلے ہیں۔ لٹیں کیسے اڑتی ہیں۔ نگاہیں کیسے ''سلجھا جا'' کی دعوت دیتی ہیں مجھے تو دس دس صفحات کے راز نامے آتے تھے۔ محبوبہ کو چار چار پیڈوں کے خط موصول ہوتے تھے۔ اپنا تو یہ عالم تھا کہ خط

پڑھ کر جی چاہتا تھا کہ دنیا چھوڑ کر پہاڑ کی کسی ڈھلان پر کٹیا میں جا رہا ہوں اور باقی زندگی اللہ اللہ کر کے گزار دوں۔ پتہ نہیں محبوبہ کی کیا حالت تھی۔

سیانے کہتے ہیں کہ جب عاشق چھ فٹی مونچھ مروڑ ہو اور مجسم ''تینوں چک کے لے جانا میانوالی'' ہو تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سچ کہتے ہیں۔

محبوبہ اس وقت بیلا کی بیوی ہے۔

صاحبو مجھے ہر اس خاتون سے بے پناہ ہمدردی ہے جو محبوبہ سے بیوی ہو جاتی ہے۔ بیچاری۔ وہ ایک برس جذبات کی جگ مگ چکا چوند میں رہنے کے بعد باقی ساری زندگی لالٹین کی ٹم ٹم روشنی میں بسر کرنی پڑتی ہے۔

ممتاز مفتی

22- گلی نمبر 32، سیکٹر F 6/1 اسلام آباد

بیلا کہانی

الیکٹرانک میڈیا کی یلغار نے بنتے بستے گھرانوں کو پھوٹی کر نے غرض مندی کے کھتوں میں اتار دیا ہے اور پورے معاشرے کو کھوکھلا کر کے اس کی نزع بجا دی ہے۔ خاص طور پر صحافت نے تو ذہنوں کو اس قدر پراگندہ اور سراسیمہ کو دیا ہے، کہ اب کسی بھلے تصور کا بھی ادھر سے گزر نہیں ہوتا اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی کا سماں بندھ گیا ہے۔ ان حالات میں اگر کہانی کہنے اور بات کرنے کا فن غیر محسوس طریقے سے رخصت ہو رہا ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ اس وقت کہانی لکھنا تو ایک طرف، کہانی پڑھنا بھی مشقت بلکہ خواہ مخواہ کی مشقت خیال کیا جانے لگا ہے۔

لیکن اس بڑی افتاد کی آبشار کے نیچے کچھ دیوانے ابھی کہانی بننے کے اڈے لگائے بیٹھے ہیں اور اپنی بساط سے بڑھ کر خردہ مال تیار کر رہے ہیں۔ ابدال بیلا بھی ایسے ہی دیوانوں میں سے ایک ہے جو ایک دیوانے پن کے ساتھ کہانی پہ کہانی لکھے جا رہا ہے، مگر کہانی لکھتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں بیٹھے چوکس سیانے کو اونگنے نہیں دیتا۔

بیلا کی کہانیوں میں کلاسیکی کہانیوں کا رنگ ماجود ہے کہ ہر کہانی واقع کردار اور ماحول کے فریم ورک میں شطرنج کی چال چلتی ہے۔ لیکن یہی اس کا اصل کمال نہیں۔ بیلا کے فن کی برتری اس کے موضوعات کا انتخاب ہے۔ بہت سے ایسے واقعات اور مشاہدات جن پر آپ کی، میری ہم سب کی نظر ہوتی ہے اور جن کو ہم اصل مسئلے کا منہ ماتھا سمجھ کر اس کی چارہ گری میں مصروف ہوتے ہیں، بیلا کے نزدیک ایک پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ اس بڑے مسئلے کی بازو والی گلی سے ایک ایسا معاملہ برآمد کر لیتا ہے۔ جس کی وائرس سے بڑا معاملہ متاثر ہو کر متعفن ہو رہا تھا۔ پھر وہ اس معاملے کے ساتھ وہ کرتا ہے جو بندر سانپ کی سری ہاتھ میں پکڑ کر پتھر کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

ابدال بیلا کی کہانیوں میں جزئیات نگاری کا ایک اپنا ہی اسلوب ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب افسانہ نگار جزئیات نگاری پر آتا ہے، تو کہانی بوجھل سی ہونے لگتی اور قاری جزئیات کی گرد سے اس قدر اٹ جاتا ہے کہ ذہن کو اچھوں لگ جاتا ہے۔ لیکن جب آپ ان کہانیوں کو دیکھیں گے تو آپ ایک نہایت ہی خوشگوار اور خوش کنار ترشح کی لپیٹ میں آ جائیں گے، اس میں رنگ اور بو کے ساتھ دھیمے سے دباؤ اور ہلکے سے ذائقے کا احساس بھی ہوگا۔ بیلا نے جزئیات نگاری اتنی مہارت اور فنی چابکدستی سے کی ہے، کہ نہ تو کہانی کی ذات پر اُس کا اثر پڑتا ہے، اور نہ ہی اس کی بنیادی صفت کسی پہلو سے مجروح ہوتی ہے۔ یہ کمال اس عہد کے بہت کم کہانی کاروں کے حصے میں آیا ہے۔

ابدال بیلا ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ جرنل ازم، ابلاغیات، لائبریری سائنس، کمپیوٹر سائنس اور بزنس ایڈمنسٹریشن کا بھی طالب علم رہا ہے۔ ان ''ہشت رخ'' دلچسپیوں کے حامل شخص کے لیے ممکن تو نہیں کہ وہ کہانی کاری کے مست ملنگ فن سے بھی وابستہ ہو سکتا، لیکن بیلا چونکہ ایک حساس روح کا مالک ہے اور کہانی کہنے کی فطری

صلاحیت سے آراستہ ہے، اس لئے یہ رنگ رنگ دلچسپیاں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوئیں بلکہ ان علوم نے اس کے فن کی گہرائی، گیرائی اور وسعت عطا کی ہے۔ اس کے علاوہ...... لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ میں ان کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کی بجائے پہلے آپ کو یہ کہانیاں پڑھنے دوں، اس دیباچے کو تقریر نہ بناؤں، بلکہ ان کہانیوں میں جو سحر ہے، جو تازگی ہے، جو رنگ رنگی اور شیرینی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جو تلخیاں ہیں اور لطف ہے اور جو منظر ہیں، جو پس منظر ہیں، جب یہ سب آپ پر خود بخود برس جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو پھر میں کیوں آپ کا راستہ روکوں۔ میری تو بس اتنی دعا ہے کہ رب کریم ابدال بیلا کی کہانیوں کو مطالعہ گاہوں سے لا کر چوپالوں تک رسائی دے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھ سکیں، اور ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اشفاق احمد

جامِ جہاں نما —— دروازہ کھلتا ہے

''جب میں نے ''دروازہ کھلتا ہے'' دیکھا تو سوچا یہ تو آلۂ قتل کے طور پر بخوبی استعمال ہوسکتا ہے۔ مگر جوں جوں اسے پڑھا قتل بلکہ شہید ہوتی چلی گئی۔ میں فطری طور پر بہت کاہل اور ست الوجود ہوں۔ کچھ لکھنے سے جان جاتی ہے۔ پتا نہیں کیسے، کیوں اور کب ''دروازہ کھلتا ہے'' پہ لکھ ڈالا۔ میرے لفظوں میں کوئی خوبی نہ ہوگی۔ صرف یہ کہ اس کا ہر لفظ میں نے باوضو لکھا ہے۔ میری زبان درود شریف اور کلمہ شریف کا ورد خود بخود کرتی رہی کہ آپ کے ناول نے یہی سکھایا جو زندگی کا حاصل ہے۔'' (عقیلہ شاہین)

زندگی کی پہلی کہانی نے آدم، حوا اور شیطان کی تکون سے جنم لیا۔ آدم کے زمین پر قدم رکھنے اور دوسری طرف پتھر اور پتوں کی تہذیب سے شہریت کی طرف جاری سفر اور نامعلوم سے معلوم کی تلاش نے اظہار کی کئی شکلیں اختیار کیں۔ حقیقت اور

ماورائے حقیقت کہیں سات سروں میں ڈھل گئی تو کہیں رنگوں اور لکیروں کا بے خود کرنے والا حسن بن گئی۔ اسی تخلیقی صلاحیت کے نقش بابل، نینوا، اہرام مصر، موہن جوڈارو، ہڑپا، ٹیکسلا اور گندھارا کی زندہ تہذیبوں میں نظر آنے لگے۔ یہ تہذیبیں تو مٹ گئی مگر اپنی ذہنی فکری اور تخلیقی سرگرمیوں کے آثار پتھروں پہ نقش کر گئیں۔ فنونِ لطیفہ میں اُدب وہ شعبہ ہے جس میں سب سے زیادہ حیات کی سرگرمیوں اور حرکت پذیر رجحانات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ نیا شعور، نیا طرزِ احساس اور نئی حقیقتیں نئی جہات وہیئتوں میں پیش کی جانے لگیں۔ چنانچہ جب فن کار نے عالمی گاؤں کا فرد ہونے کی حیثیت سے اپنے جذبہ، احساس اور خواب وخیال کو حقیقی، خارجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں دیکھا تو اُسے کا ناول کہا گیا۔ آج کا ناول زندگی کو تمام تر وسعتوں اور صداقتوں کے ساتھ یوں پیش کرتا ہے۔ کہ ہم زندگی کو ویسے ہی جاننے لگتے ہیں جیسے اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ بقول رالف فاکس۔

''ناول فطرت سے بحث کرتا ہے۔ یہ فرد کی سوسائٹی اور فطرت کے خلاف جدوجہد کا رزمیہ ہے۔''(۱)

چنانچہ ناول غیر منظم اور غیر مربوط سماج جہاں قدیم مگر سچے معاشرتی اور تمدنی نمونے تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ وجود میں آتا ہے۔ سماج کی نئی تشکیل کو منعکس کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ماضی کی یاد، حال کا منظر نامہ اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔

ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اسی مثلث کی جذباتی، فکری اور فلسفیانہ تفسیر ہے۔

یہ ناول وقت، زمان و مکاں، شعور حیات، التباس زندگی، محبت، تصوف اور تاریخ وتہذیب کا عجائب گھر ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' بظاہر ایک دروازہ ہے لیکن اس مرکزی دروازے سے جسم کی غلام گردشوں اور روح کے کئی بہشتی دروازے کھلتے ہیں۔

ابدال بیلا کی ہنرمندی یہ ہے کہ اُس نے وسیع کینوس پہ پھیلے ہوئے ہر دروازے پر تاریخ وتہذیب کی جو کہانی لکھی ہے وہ فطری طور پر خود بخود مرکزی دروازے سے آن ملتی ہے۔اس دروازے پر صرف ایک لفظ تحریر ہے اور وہ لفظ ہے ''محبت''۔

محبت ابدال بیلا کا لفظ ہے۔

محبت جو جسم کی پیاس سے نکل کر اُجلی روح کی پرواز بن جاتی ہے۔محبت کی کئی زندگیاں ''دروازہ کھلتا ہے'' کا موضوع ہیں۔جن کے سرے تاریخ کے دائرے میں سفر کرتے ہوئے بالآخر ایک ہو جاتے ہیں اور ہمارے سامنے وہ دروازہ کھلتا ہے جو صوفیاء، اولیاء، اور باباؤں گمشدہ سلطنت یعنی پاکستان ہے۔ پچپن ابواب کے اس ناول میں بیتے سفر کی روداد ہے جو کئی نسلوں کی داستان ہے۔ یہ وہ آپ بیتی ہے جو ابدال بیلا نے جنم لینے سے پہلے بیت لی۔ وہ روح کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔اس یقین کے ساتھ کہ رسائی خود بخود ہو جائے گی۔

ناول کے ہر باب کا عنوان بذاتِ خود ایک کہانی ہے۔

لیکن تمام کہانیاں ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ابدال بیلا الف لیلیٰ کی شہرزاد ہے جو کہانی در کہانی تکنیک سے اپنی زندگی کی بجائے دوسروں کی زندگی بچانا چاہتا ہے۔ ناول کی ابتدا ''تم'' اور ''میں'' سے ہوتی ہے۔''تم'' دروازہ اور ''میں'' دستک ہے اور آخر میں جب ''دروازہ کھلتا ہے'' تو یوں!

''دروازہ کھلتا ہے یہاں نہ تم ہو نہ میں ہوں۔صرف روشنی ہے جو ہر خیر کی ماں ہے۔ چاروں طرف اسی روشنی میں بندھے اس کی بندگی کے ذرے ہیں۔ کہکشاں در کہکشاں سربسجود۔ یہ مقام سجدہ ہے۔اللہ ہو

باجھ وصال اللہ دے باہو سب قصے کہانیاں ہو۔''(۲)

''ہو'' کی ''ابتداء'' کیہ جاناں میں کون اور ''انتہا'' سب کج توں پر ہے۔

کہانی کا آغاز اُس دھرتی سے ہوتا ہے۔ جہاں مسلمان، ہندو، سکھ، امن، دوستی اور محبت کے نہ ٹوٹنے والے رشتے میں بندھے ہیں۔ مذہبی تفریق کے باوجود ایک دوسرے کی خوشیوں، غموں، تہوار و تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔ اسی بستی کی صاحباں طوائف جو گاتی اور رقص کرتی تو پورا ماحول وجد میں آ جاتا۔ بابا سوڈی شاہ کی نظر کیا پڑی اپنی ''میں'' ہار گئی۔ سوڈی شاہ اپنے گرو بگو شاہ کا سراغ دے گیا یوں کہانی ایک اور سمت چل پڑی۔ کہانی در کہانی کی اس تکنیک میں انفرادیت یہ ہے کہ ایک کہانی سے دوسری کہانی کا جنم بیتے سمے سے ہوتا ہے۔ سمے کا یہ بندھن روح اور روحانیت کا بندھن ہے۔ ماؤ میووال میں خواجہ روشن ولی کی درگاہ ہندو، سکھ، مسلمان سب کے لیے گوشۂ عافیت اور منتیں مرادیں مانگنے کا مرکز ہے۔ یہاں ہماری ملاقات ابوالفضل سے ہوتی ہے اور پھر پورا ناول اور اُس کے تمام واقعات اور مہمات کسی نہ کسی حوالے اس کردار سے جڑ جاتے ہیں۔ ابوالفضل انگریز فوج کا وہ سپاہی ہے جس کا دشمن کی گولیاں کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ اس لیے کہ اُس کے گلے میں کالی ڈوری سے بندھی پیتل کی پتری پر ''اللہ'' اور محمد ﷺ کے نام نقش تھے۔ ابوالفضل مافوق الفطرت اور ماورائی طاقت حاصل کرنے کے لیے چلے کاٹتا ہے مگر خیراتی شاہ نے سب سے بڑا اسم درود شریف اور کلمہ شریف کا بتایا۔ درود شریف کی وضاحت انگریز افسر کے سامنے یوں بیان کی گئی:

> ''یہ ہمارے سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کی مدح سرائی ہے۔ ان لفظوں میں جو اللہ تعالیٰ نے خود بتائے ہیں۔ اللہ بھی یہی پڑھتا ہے۔ اللہ تو آنے والے وقت کا خالق ہے۔ ہر بھید سے واقف ہے۔ وہ اپنے محبوب ہمارے نبی پاک ﷺ کی مدح سن کے کتنا خوش ہوتا ہوگا۔'' (۳)

یہ اُس کی خوشی ہی تھی کہ ابوالفضل کی آل اولاد بھی دنیا میں سرخرو رہی۔ یوں

تاریخ، تہذیب، محبت، تصوف و روحانیت دائرہ در دائرہ سفر کرتے ہوئے من مسجد کا وہ دروازہ کھولتے ہیں۔ جہاں مادیت کی کثافت اور آلائش نہیں، روح ہی روح اور روشنی ہی روشنی ہے۔ ابوالفضل سے کہانی اُس کے بیٹے فضل دین کی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ یہ اُن دنوں کا قصہ ہے۔ جب انسان اللہ رام، واہگرو، قرآن، گیتا اور گرنتھ میں نہیں بٹے تھے۔ وہ سب ایک لڑی میں بندھے تھے اور وہ لڑی تھی محبت۔ ابوالفضل، لالہ اوم پرشاد اور گوبند سنگھ کی دوستی، نئی نسل کے لیے امن و رواداری کا وہ پیغام ہے۔ جس کے لیے انسان تخلیق کیا گیا اور یہ کائنات بسائی گئی۔ فضل دین کی محبت اور ساتھ ہی صحراؤں کے سفر کی کہانی ایک ساتھ چلتی ہیں۔ چولستان، قلعہ دراوڑ، بجنوٹ قلعہ کے اردگرد میلوں پھیلی ریت جہاں ہوائیں بھی ''پانی پانی'' کی سرگوشیاں کرتی ہیں۔ ابدال بیلا نے اس حقیقت کو روح کے کئی دریچوں سے وا گزار کر کے یہ نتیجہ پیش کیا ہے۔ کہ روح کا چولستان بھی محبت کے پانی سے سیراب ہوگا۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' کے وسیع کینوس کے باوجود ابدال بیلا کی کہانی اور پلاٹ پر گرفت بڑی مضبوط ہے ایک قصے کے بطن سے دوسرا قصہ جنم لیتا ہے اور کہیں بھی اصل مرکز سے رابطہ نہیں ٹوٹتا۔ ایسی ہی ایک کہانی اور متحرک اور جاندار کردار رانی چانن کور کا ہے۔ جو گیارہ سال بے اولادی کے دکھ میں جلتی رہی۔ اُس کا شوہر جاگیردار گوبند سنگھ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوا کہ اُس کی زندگی کا چراغ بجھا چاہتا ہے۔ ایسے میں چانن کور گاؤں کی دایہ سے مل کر حاملہ ہونے کا جھوٹا روپ بھرتی ہے۔ ایک چمارن کا تیرھواں بچہ اُس کا بچہ بنا۔ ابوالفضل کا بیٹا صدر دین جس کے بارے میں ایک براہمن کی پیش گوئی کہ یہ مہاراجہ بنے گا، مذاق میں اُڑا دی گئی۔ چمارن کے بیٹے کی موت پر رانی چانن کور نے چپکے سے صدر دین کو اُٹھوالیا۔ یوں وہ دیوندر سنگھ بن کر محلوں میں پرورش پانے لگا۔ سندر کور جو اس سازش میں ملوث تھی۔ بھاگو کی آہیں اُس کے بیٹوں پنا سنگھ، ہیرا سنگھ کو لے ڈوبیں تو اُس نے

راز اُگل دیا۔

اس طرح یہ پراسرار کہانی بھی ابوالفضل سے جا ملی۔ گویا ناول میں سانس لیتی پوری زندگی اپنی تمام تر رومانویت، حقیقت سحرانگیزی اور ماورائیت کے ساتھ ابوالفضل اور اُس کے خاندان سے جڑی ہے اور یہی ابدال بیلا کی کامیابی ہے کہ کہانی اُلجھے ریشمی گچھوں کے باوجود اپنے اصل سرے سے جا ملتی ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' بیتی رتوں، گزرے موسموں اور ماضی کے گم شدہ لمحوں کی کہانی ہے۔ ایک کہانی سے چون کہانیوں نے جنم لیا اور پھر اُسی ایک کہانی سے اُن کا ملاپ اور سنگم ہی دراصل ابدال بیلا کی انفرادیت ہے۔

''ہم'' اور ''تم'' کے ابواب میں ''میں'' کی بے خودی میں لتھڑے عرفان ووجدان کی کہانی ہے۔ جس میں محبت کے بھیدوں کی جلتی بجھتی روشنیاں بھی ہیں اور گیان اور دانش کے چراغ بھی۔ جو صرف اُسی کے گرد جلتے ہیں جو رنگ بھی ہے اور روشنی بھی، صبح بھی ہے اور شام بھی، برف بھی ہے اور آگ بھی۔ پھول بھی ہے اور کانٹا بھی۔ بہار بھی ہے اور خزاں بھی، تتلی بھی ہے اور جگنو بھی۔ جس کی محبت نے وہ دروازہ کھولا کہ ''ہو'' کی گھمسن گھیریوں میں صرف ''تو'' ہی ''تو'' یادرہا۔ یہ مجازی محبت سے حقیقی محبت کا وہ سفر ہے جو ''سانولی'' سے ''سانول'' تک لے جاتا ہے۔ یوں ناول نگار اجداد کے چہروں سے مٹی ہٹا کر دوسوسال پرانی تاریخ کی بازیافت میں کئی زمانے قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ لال خاں اور اُس کی بیٹی ارجمند، ہستی بستی اور پھر لٹتی اُجڑتی دلی کی کہانی سناتے ہیں۔ لال خاں جس کے دادا کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں قطب مینار پر پھانسی دی گئی۔ پس منظر میں پرتھوی راج، شہاب الدین غوری، قطب الدین التمش، علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق، امیر تیمور اور پھر بابر سے بہادر شاہ ظفر تک کی دِلی اپنے تمام تر بستے اور اُجڑتے لمحوں

کے ساتھ سامنے لائی گئی۔

یہ ناول نگار کے وسیع مطالعے اور تاریخ سے محبت ہے کہ تاریخ ہی قوموں کا ایمان ہے۔

فرنگی جو ایک تجارتی کمپنی کے روپ میں سرزمین ہندوستان میں وارد ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں اس پر قابض ہو گئے۔ لال قلعہ، جامع مسجد، چاندنی چوک، درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، پرائے ہو گئے۔ یہ تاریخی حقائق بھی ابوالفضل کے خاندان کے پس منظر میں بیان کیے گئے ہیں۔ یوں تاریخ اور تاریخی واقعات نے تہذیبی تضادات اور تنازعات کے باوجود ناول کی رومانویت اور جمالیات کو برقرار رکھا ہے۔

''شطرنج نصیب'' میں روہیلہ بازار، علی گڑھ اور لکھنؤ کے پس منظر میں لکھی گئی۔ وہ کہانیاں ہیں جب پہلی حویلیاں مسلم تہذیب وثقافت کا گہوارا تھیں۔ جب خوشحالی۔ خوش باشی مسلمانوں کا مقدر تھی۔ زمانہ شناس انگریز نے مغل شہزادوں کو شطرنج کے بے ترتیب مہروں کی طرح مات دی اور ''دِلی کی آخری کہانی'' اپنے ساتھ مسلمانوں کا عروج سمیٹ لے گئی۔ تاریخ نے پلٹا کھایا اور اب سازش اُن قوموں کو لڑوانے کی تیار ہوئی جو ہندو، مسلمان اور سکھ ہونے کے باوجود ایک تکون کی تین لکیروں کی طرح ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ گاؤ ماتا کا مرنا تھا کہ ہندو مسلمان عرصۂ دراز کی محبت اور یگانگت بھول کر ایک دوسرے کے خلاف صفت آرا ہو گئے۔ عید، شب برات، دسہرہ، دیوالی، محرم، چہلم جو سب کے تہوار تھے۔ اُن کے بیچ ایک لکیر کھنچ گئی۔ تفریق کی یہ لکیر آگے چل کر ہندوستان کی تقسیم کا سبب بنی۔ کہانی ایک بار پھر ابوالفضل کی طرف مڑتی ہے۔ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کا وہ دن جب ابوالفضل بڑے اطمینان اور وقار سے اس دنیا کا سفر مکمل کر کے اپنے دوست بگو شاہ سے وعدہ نبھاتے ہوئے اُس کے ذریعے سے اگلی دنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا لیکن اُس کی موت ایک نئی کہانی کو جنم دے گئی۔'' اس

لیے کہ بعض لوگوں کی کہانی اُن کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔'''' مائی سیراں''
تاریخ وتہذیب اور جسم وروح کی دنیا کا سب سے جاندار کردار ہے۔ جس کی محبت دل
کی دھرتی کی محبت ہے۔ اُس کے دل کے تار ابوالفضل کے دل سے بندھے ہیں۔
روح کی روانی میں بہتی ہوئی یہ محبت کوئی سمت کوئی کنارا نہیں رکھتی۔ وہ زمین و آسمان
کی وسعتوں میں نور بن کر پھیل جاتی ہے۔ آنکھیں اندھی بھی ہو جائیں مگر دل کی آنکھ
محبوب کی ایک ایک ادا کو دیکھ لیتی ہیں۔ کان سننا چھوڑ بھی دیں مگر اُس کی آواز سنائی
دیتی ہے۔ دل دھڑکنا بند بھی کر دے مگر اُس کی خواہشات محسوس ہوتی رہتی ہیں۔ روح
ہر اُس منظر کو سامنے لاتی ہے جو بظاہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگوں کے دل اللہ کے لڑ
سے بندھے ہوتے ہیں۔ مائی سیراں کی آنسو بہاتی آنکھیں ابوالفضل کو ریل کے
ڈبے میں لال کنی والا آسمانی رومال لپیٹے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کرتے دیکھتی ہیں۔ اُس
کی گھر تک آنے کی ایک ایک ادا اور حرکت اُسے نظر آتی ہے۔ سرسوں کا ساگ،
پودینے کی چٹنی، نمکین روٹی ابوالفضل کی پسند ہے مائی سیراں اُس کی پسند کا دستر خواں
سجا کر گھر سے چلی گئی۔ اُس سجے دستر خوان کو دیکھ کر ابوالفضل کا اپنی بیوی سے سوال کہ
''سیراں کدھر ہے؟'' یہ سوال اس کہانی کا نہیں پورے ناول کا کلائمکس ہے اور اس میں
وہی کیفیت چھپی ہے۔

کہ میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

کائنات کا یہ سلسلہ ''سیراں ثانی'' کی محبت سے ہی تو چل رہا ہے۔ یہ محبت
تخلیق کائنات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اُس کے ہاتھ میں وہ برکت ہے کہ جس
بند دروازے پر دستک دیتی ہے۔ وہ محبت کی الوہی خوشبو کے ساتھ کھلتا چلا جاتا ہے۔
انہی بند دروازوں میں سے ایک دروازہ ذات کے جولاہے ماسٹر کاظم حسین کی محبت کا
ہے جو اُسے شہنشاہ جہانگیر سے ہے۔ دیو آنند مغل شہنشاہ جہانگیر کی قبر کی بے حرمتی کرتا

ہے تو ایک پر اسرار خوفناک بیماری کے حصار میں گھر جاتا ہے۔ روحوں کے سنگم میں شہنشاہ ماسٹر کاظم حسین ہی کو علاج کے لیے طلب کرتا ہے۔ اس لیے تین سو دس سال گزرنے کے بعد بھی محبت کے ظاہری انداز تو بدلے مگر روح وہی رہی۔ یہاں ناول نگار نے ظہیر الدین بابر اور مغلیہ سلطنت کے عروج سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے زوال کی کہانی اتنے موثر مختصر اور افسانوی انداز میں پیش کی ہے کہ قاری اُس کی سحر سازی میں جکڑا، تاریخ کی اُنہی راہداریوں میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے۔ اس تاسف کے ساتھ کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ وہ دور ہندوستان کی تاریخ کا روشن دور تھا۔ جب محبتیں نسل، قوم اور مذہب کی محتاج نہ تھیں۔ جب بابا محکم دین کی دعا سے گوپال سنگھ جوشی صاحب اولاد ہوا۔ اُس کی لاڈو بیٹی کی خدمت اور محبت سے بابا محکم دین کے گائے کے بڈ کی لاٹھی سونا بن گئی۔ یہ وہ لمحہ ہے جب جسم مٹ جاتا ہے اور صرف روح رہ جاتی ہے۔ ''میں'' ختم ہو جاتی ہے۔ اور ''تو ہی تو'' کی صدا لفظوں کو اُن حقیقتوں میں بدل دیتی ہے جو عقل و فہم کی دنیا سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ سائیں لوگ دلوں کے رخ موڑنے والے ہیں کہ چندکور جس نے ''لا'' سے سبق کا آغاز کیا اُسی ''لا'' سے اُس کی روح بھیگتی چلی گئی اور پھر لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ تک دسترس ہو گئی۔ یہ وہ بھید ہیں۔ جو صرف سائیں لوگ ہی جانتے ہیں اور عظیم بھید یہی ہے کہ ''ماننے میں سکھ ہے اور نہ ماننے میں مغالطوں کا بھنور۔'' مان لینا دراصل ایمان کی وہ کیفیت ہے جو چوتھی سمت بھی روشنی ہی روشنی بکھیر دیتی ہے۔ اس بکھری روشنی اور حیرت کدے کی دنیا میں قاری ایک اور منظر دیکھتا ہے باغی بھگت سنگھ فضل دین انسپکٹر کا بچپن کا یار نکلا۔ دونوں کی محبت کے سنگ تاریخ نے پیچھے کی طرف سفر کیا تو راجوں، مہاراجوں کے محلوں اور حرم سراؤں میں عیاشیوں کے وہ منظر سامنے آئے جو ان کے زوال کا باعث بنے اور جن پر انسانی تاریخ آج بھی شرمندہ ہے۔ بھگت سنگھ کی کہانی

بورژوائی اور پرولتاری طبقے کی اُس کشمکش کو بھی سامنے لاتی ہے۔ جس کے تحت انسان، انسان کے ہاتھوں ظلم وستم کی چکی میں پستا ہے۔ جب ظلم نا قابل برداشت ہو جاتا ہے تو اندر کی بغاوت بھگت سنگھ جیسے کرداروں کو جنم دیتی ہے۔ لیکن دہشت کی علامت بننے والا یہی بھگت سنگھ ماں کی موت پر فیتی فیتی ہو گیا اور ماں سے محبت ہی اُسے اُس راہ پر بھی لے جاتی ہے۔ جو ستر ماؤں سے زیادہ کی محبت کا ایک ہی راستہ ہے۔ جو بھگت سنگھ کو بھگت کبیر بنا دیتا ہے۔ فضل دین ''چشم دید'' گواہ بنتا ہے تو بے زبان بندر شیرو کی زبان سمجھتے ہوئے اندر سنگھ کے قتل کا سراغ لگاتا ہے۔ وہ اُلجھی ڈور کے سرے ڈھونڈھتا ہے۔ تو وہ جعلی جوگی سامنے آتے ہیں۔ جن کی کرشمہ سازیاں جھوٹ کی سچ اور کھیوں کو ایک بنانے کا گر جانتی ہیں۔ لیکن پردے ڈالنے والا پردے اُٹھاتا بھی ہے تاکہ سچ وحق کی پہچان کرا سکے۔ اس چشم دید گواہی میں ہمیں وہ جوگی بھی ملتے ہیں جو چالیس دن مٹی میں دبے زندہ رہتے ہیں اور وہ جوگی بھی جو گرمیوں کی تپتی دھوپ میں اپنے چاروں طرف آگ کا آلاؤ دھکا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ انت اور نروان یونہی تو نہیں مل جایا کرتا۔ بھگوان اور خدا سچ ہونے کے باوجود کتنے مختلف ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں ذرا دیکھئے:

''کیوں اُن سے پوچھتے ہو جنہیں بولنا نہیں۔ کیوں اُنہیں کرتب کر کر دکھاتے ہو۔ جنہوں نے دیکھنا نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے پتھر کی بنائی مورتیوں کی آنکھیں بھی پتھریلی ہوتی ہیں۔ ان سے کیا وجدان مانگنا۔ کیا گیان کی باتیں دکھانی۔ مٹی پتھر لکڑ کی بنائی ان مورتیوں کے ہاتھوں سے کیا شکتی کی طلب رکھنی۔ کیوں ان کے جمے ہوئے مردہ پیروں میں پھول پتیوں کے ڈھیر لگا کے ان سے حاجتوں کے پورا ہونے کی دعائیں کرنی۔ تم لوگ زندگی

اور موت کے دنوں سروں کو چھو چھو کے دکھ اور سکھ کی نبضوں میں
سانس لیتے پھرتے ہو۔ تمہیں یہ ڈھونگ نہیں دِکھتا۔'' (۴)

آتما، یوگ، روح والہام اور خیر و شر کی کشمکش ''دروازہ کھلتا ہے'' کا وہ مرکزی نقطہ ہوتے ہوئے بھی پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ ابدال بیلا نے تاریخ و تہذیب کی منجمد حقیقتوں کو محبت کی پھوار سے حیاتِ نو عطا کی ہے۔ ''چکی کی گم ہوئی آواز'' میں گزرا ہوا زمانہ ہی نہیں گزری ہوئی جگہیں بھی دوسرا جنم لیتی ہیں۔ ''کوکو کو کی معصوم اور شفاف آواز ہردت سنگھ جیسے بدنام اور پھانسی کی سزا پانے والے مجرم کی روح کو چھوتی ہے۔ محبتوں کے کھیت کھلیان اُسے اپنی ماں اور اپنی رفیق بلونت کور کا روشن چہرہ یاد دلاتے ہیں۔ اُس کا بھانبڑ جسم نمی نمی مٹی میں بدلتا یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان فطری طور پر اُجلا، سچ اور نور ہے۔ اس لیے کہ وہ اُسی نور کا اِک ذرہ ہے۔ جو اُس کا خالق ہے۔ فضل دین کی محبت اُسے ایک معصوم بچہ بنا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مجرم بننے کی کہانی حرف حرف بیان کر دیتا ہے۔ یوں ابدال بیلا نے یہ پیغام دیا ہے کہ محبت وہ جال ہے جس میں پھنس کر بڑے سے بڑا ظلم اور بڑے سے بڑا جرم ہار مان لیتا ہے۔ یہ بابا لوگوں کا وتیرہ ہے جو پتھروں سے لہولہان ہو کر بھی سلامتی کی دعائیں دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں:

''ہر طاقت ور سے بڑھ کے کوئی ہے۔ ہر علم والے سے برتر کہیں
کوئی اور ہے۔ ایسا کوئی نہیں جس کے اوپر کوئی نہ ہو۔ سیر مانے
نہ مانے سوا سیر آ کے منوا لیتا ہے۔'' (۵)

بابا لوگ روح کی کھلی آنکھ سے ہر منظر دیکھ لیتے ہیں۔ ماضی، حال، مستقبل سب دریچے اُن کے سامنے وا ہیں۔ لیکن وہ خاموش رہتے ہیں۔ اُن کا سناٹا بولتا ہے۔ لیکن یہ بولی روح والوں کی ہی سمجھ میں آتی ہے۔ مادیت کی پرستش کرنے والوں کو اُن

کے اندر جلتے ہوئے خیر کے دیئے نظر نہیں آتے۔ اُن کی کہانی صرف دو ناموں پہ محیط ہے۔ اُن کا سبق یہی ہے کہ من کی میلی سلیٹ صاف کر کے صرف دو نام ''اللہ'' اور محمد ﷺ لکھ لو۔ پوری کائنات تسخیر ہو جائے گی۔ دنیا چلانے والا اُن کا گواہ بنتے ہوئے اُن کے حق میں فیصلہ لکھ دیتا ہے اور جواب میں اُن کے من سے صرف یہ آواز آتی ہے کہ بس اب صرف ''تو'' ہے۔

ابدال بیلا کا ایمان یہی ہے کہ یہ دنیا ''میں'' اور ''تو'' کی کہانی ہے۔

جو ''میں'' کے گورکھ دھندے میں پھنسا خالی ہاتھ رہا اور جس نے ''تو'' کو توجہ کا مرکز بنایا اُس کے خالی ہاتھوں میں ارض و سماسمٹ آئے۔ ''تو'' کا نظام بڑا انوکھا ہے۔ کبھی اُس کی عظیم ترین مخلوق گواہ نہیں بنتی اور کبھی بارش کے بنتے مٹتے بلبلے سب سے بڑی گواہی بن جاتے ہیں۔ لالہ دیورام جو بتیس برس پہلے ہر بچن سنگھ نمبر دار کے ہاتھوں برستی بارش میں قتل ہوا۔ بتیس سال بعد بارش میں بنتے بلبلوں نے ہی اُسے سچ بولنے پر مجبور کر دیا اور اپنی ہی بوڑھی بیوی کے بیان پر وہ پھانسی چڑھا دیا گیا حالانکہ گواہی دینے والے ناچیز بلبلے تھے اور بقول ابدال بیلا:

> ''گواہی بھی ایک طرح کا قرض ہوتا ہے جس پر جب واجب کر دو اُسے چکانا ہی پڑتا ہے۔ بس خالق کی بنائی ہوئی ساری مخلوق میں سے گواہی کے معاملے میں اِک انسان ہی بے اعتبارا ہے۔ کائنات بھر میں سب پہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنا گواہی کے معاملے میں سوائے آدمی کے۔''(۶)

ابدال بیلا اپنے اس انداز کی بنا پر کہیں طلسماتی اور چونکا دینے والی کہانیاں سنانے والا داستان گو نظر آتا ہے تو کہیں ''زاویہ'' کا بابا بن کر محبت اور تصوف کے ایسے در کھولتا ہے۔ کہ قطرے میں سمندر اور ذرے میں صحرا نظر آنے لگتا ہے۔ بات سے

بات نکلی تو اُس صداقت تک جا پہنچی جہاں لال اَنھیری کسی قتل کی شہادت دیتی تھی۔ اسی لال آندھی کے جھکڑوں میں خوب صورت ہربنس کور کا کردار اُبھرتا ہے۔ جس نے چھت پہ بیٹھے کبوتر کو کیا اُڑایا کہ کہانی کا رخ ہی بدل گیا۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک کبوتر اُڑانے پر مہر النسا، نور جہاں بن گئی۔ مسلمان اِس کہانی کے پس منظر میں بھی وہی ہے جو اس ناول کا محور و مرکز ہے:

> ''اندر کی ''میں'' نکالنے کی ہر ایک کی الگ کہانی ہے۔ گیس بھری سوڈے کی بوتل سے پوری گیس نکالنے کے لیے اسی طرح کرنا پڑتا ہے۔ خوب پکڑ پکڑ کر اسے ہلایا جاتا ہے۔ ساری گیس اُبل کے اُڑ جاتی ہے۔ ساری ''میں'' نکل جاتی ہے۔ اندر جو تھوڑا بہت سیال رہ جاتا ہے۔ اس میں ''میں'' کی شوں شاں نہیں ہوتی۔ ''تو ہی تو'' کی مٹھاس ہوتی ہے۔''(۷)

یہ مٹھاس ہی فضیلت اور عرفانِ حقیقت ہے جس نے ''میں'' اور ''تو'' کے فلسفے کو سمجھ لیا وہ سائیوں کے اُس قبیلے میں شامل ہو گیا جن کی آنکھ کا ایک اشارہ سورج کو سوا نیزے پر لے آتا ہے جن کے اُٹھتے قدم پر پوری کائنات وجد میں آ کر رقص کرنے لگتی ہے۔ زندگی مجاز سے حقیقت کا وہ سفر ہے جس میں جلی ہوئی روٹی ایک قوی دلیل بن کر وارث شاہ سے ہیر سیال لکھواتی ہے۔ بالکل ویسے ہی ''پراٹھوں'' نے صدر دین کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ بھابھی نے شوہر کے لیے پراٹھے اور اُس کے لیے سوکھی روٹی پکا کر رکھی تھی۔ یہ سوکھی روٹی اُسے دوسری عالمگیر جنگ کے محاذ پر لے جاتی ہے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر سولہ روپے ماہوار تنخواہ پہ گن مین کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ دوسرے ہزاروں لوگوں کی طرح اُسے بھی اپنے دشمنوں کا شعور نہ تھا۔ اُسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ دشمن سے آخر دشمنی کیا ہے۔ وہ تو حاکم قبیلے گوروں کا غلام تھا۔ جنگ سے

پہلے ہی ٹانگ کا فریکچر برٹش انڈین آرمی ہسپتال میں لیفٹیننٹ مریم سے ملاقات کا بہانہ بن گیا۔ صدر سب کچھ بھول کر دمکتے، خنداں، اُجلے چہرے، نیلی آنکھوں اور سنہری زلفوں کا اسیر ہوگیا۔ وہ مریم کی محبت میں موت کی دہلیز کو چھوآیا۔ یہ مشرق کی جذباتی محبت تھی۔ جہاں محبت ہی ایمان، دین، دھرم سب کچھ ہے اور وہ مغرب کی مشروط محبت:

"تم ایک سپاہی ہو، سولجر ہو ہماری رائل آرمی کے اور یہ ہماری جنگ ہے۔ تم وعدہ کرو تم ہمارے کراؤن کے لیے ہماری ملکہ کے لیے، ہمارے ملک کے لیے دِل و جان سے لڑو گے۔ اگر اس جنگ میں تم نے اپنی جان دی تو اگلی دنیا میں تمہیں ڈھونڈنے میں نکلوں گی اور تمہاری حور بن کے رہوں گی۔" (۸)

یہ وہ خواب ہیں جو غلام اور محکوم قوموں کو سپر پاورز شروع سے ہی دکھاتے آرہے ہیں۔ برما کے محاذ پر ہندوستان کے وفاداروں نے اپنے آقا کی خاطر اپنا خون بہایا۔ یہ عزتوں اور عصمتوں کے رکھوالے جن کے وقار واحترام کو سرِ عام پھانسیوں پر گاڑا گیا۔ مگر وہ پھر بھی اپنے اندر سے وفا، خلوص اور مروت کو نہ نکال سکے اس لیے کہ:

"ہم لوگ چاہے ہندو ہوں، مسلمان ہوں، تسلیم کر لیں کہ ہم بونے ہیں اور سات سمندر سے آیا ہوا انگریز عقل استعمال کر کے ہماری گردن کو دبوچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی کامیابی میں اس کی عقل اور ذہانت سے کہیں زیادہ ہماری حماقتیں ہیں۔" (۹)

ابدال بیلا کا یہ تجزیاتی انداز تاریخ کے ہر موڑ پر اُن حقائق کو سامنے لاتا ہے جس نے برسرِ اقتدار قوم کو اقتدار سے محروم کیا۔ تاجروں کے روپ میں آنے والے لٹیرے مقامی حکمرانوں کی حماقتوں اور سازشوں کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس زمین پر ایک

صدی تک قابض رہے۔ بنگال، بہار، اڑیسہ، کلکتہ اور دلی میں سیاسی انتشار زوال کا تجزیہ ابدال بیلا کو ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ستاون کے ہندسے نے جس طرح ہندوستان کے باسیوں کی تقدیر پر ناکامیوں اور کامیابیوں کی مہر ثبت کی اُس کا بیان یوں کیا گیا ہے کہ حیرت زدہ قاری اپنے آپ کو اُسی زمانے اور اُسی تاریخ میں محسوس کرتا ہے۔ ۱۷۵۷ء میں اڑسٹھ ہزار فوج کے باوجود نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی، جس کی ناکامی کا آغاز ۱۶۵۷ء میں اُس وقت ہو گیا تھا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے تینوں بھائیوں مراد، شجاع اور داراشکوہ کو قتل کروا کے اپنی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر لی تھیں۔ حالانکہ ۱۵۵۷ء میں پانی پت کی دوسری لڑائی میں نوعمر اکبر نے ہیمو بقال کو شکست فاش دی اور شمالی ہندوستان کا فاتح اعظم بنا۔ زمانہ شناس انگریز کی عیاری فاتحین کو مفتوح کر گئی۔ آباؤ اجداد کی عیاشیوں اور حماقتوں کا حساب کئی نسلوں کو دینا پڑا جن میں ریاضی کے بعض ہندسوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

ماضی سے کہانی حال کی طرف پلٹتی ہے وہ حال جو ماضی بن چکا ہے اور ہم اپنے آپ کو بنگال کی جادونگری میں پاتے ہیں۔ ابدال بیلا نے بنگال کی غربت و افلاس کی اذیت ناک تصویریں دکھانے کے ساتھ ساتھ جادو و سحر کی کرشمہ سازیوں کو بھی پیش کیا ہے۔ مرغی چور سپاہی کا گدھا بنایا جانا، اور صدر کو عورت کا روپ دے دینا انہی کرشمہ سازیوں کا حصہ تھا۔ یہ سحر اور جادو آج بھی بنگالی باباؤں کی شکل میں ہماری معاشرتی زندگی کا حصہ ہے۔

ابدال بیلا دوستی، محبت اور امن سے محبت کرنے والا فن کار ہے۔ وہ جنگ سے نفرت کرتا ہے۔ اس لیے کہ اُس نے جنگ کی ہولناکیوں کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ وہ اپنی پیاری محبوبہ جس کو یہ ساری کہانی سنا رہا ہے اور جو کہانی کے ہر منظر میں

موجود ہے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''میری جان جنگ میں تہہ و بالا ہونے والی پہلی چیز سرحد ہوتی ہے۔ ادھر جنگ شروع ہوئی اُدھر سرحدیں روندی جانے لگیں۔ جدھر سے جسے راہ مل گئی اُس نے راستہ بنالیا۔ وہاں نہ شہر بچتے ہیں نہ صحرا نہ میدان نہ پہاڑ اور نہ سمندر۔'' (۱۰)

اس پس منظر میں ناول نگار نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اسباب و توجیہات اور اُس تباہی و بربادی کا تذکرہ کیا ہے۔ جس نے زندگی سے روح، حسن اور خوشبو کو نچوڑ دیا تھا۔ پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والا ہٹلر اتحادیوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ بظاہر جنگ ختم ہوگئی مگر اُن مظلوم انسانوں کے مصائب کا آغاز تو اب ہوا جو اپنا انسان ہونا ہی بھول گئے اور جنگلوں میں ننگ دھڑنگ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ جنگ کے ہولناک مناظر نے اُن کے تمام رابطے دنیا سے کاٹ دیئے تھے۔ ان میں صدر دین بھی تھا اور معراج دین بھی۔ جمیل اور حنیف بھی تھے اور خوشونت سنگھ اور رام گوپال بھی، جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جنگ میں اُن کی حیثیت اور اُن کے کردار کیوں اور کس لیے ہے۔ اندھیری سرنگ، خوفناک شیرنی اور اژدھے کے کھلے منہ کی دِل دہلا دینے والی فضا میں بھی ناول نگار کو اپنی محبوبہ یاد آئی کہ محبت میں جدائی ہی سب سے بڑی قیامت ہے چنانچہ وہ اُس سے یوں مخاطب ہے:

''تمہیں نہ ایسی رات کا علم ہے نہ اس کے اندھیرے کا......
جدائی کے غار میں بے دردی سے پھینک کر اپنے قرب کی ساری بتیاں بجھا کے شیرنی کی طرح اُچھل اُچھل کے وار کرتی ہو۔ پھر کوئی خوش نصیب اس کالی غار بھری رات کے دوسرے دہانے

> تک پہنچ بھی جائے تو اندھی خواہشوں کے زہر والی تھیلی زبان
> کے نیچے رکھنے والے اژدھے کو راہ میں کھڑا کر دیتی ہو اور کہتی ہو
> ایک قدم بھی آگے بڑھے تو خیر نہیں۔" (۱۱)

جنگ میں دشمن کی قید جنگ سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ قدیم زمانے کی جیل ہو یا آج کی ابوغریب جیل۔ آزاد اور آزادی انسان کی فطرت ہے چنانچہ خطرات سے کھیلتے ہوئے صدر جیل سے فرار ہوا۔ جنگلوں میں وہ جانور نما انسان وقت اور تاریخ سے بے نیاز اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہوا، برمی لڑکی عائشہ کی محبت اور راہنمائی سے ہندوستان کی سرحد تک پہنچا۔ اُس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک شعلۂ جوالا بن چکی تھی۔ ہندوستان کی تینوں قومیں مسلم، ہندو، سکھ جو مروت، خلوص اور محبت کے اٹوٹ رشتوں میں بندھی تھیں جو قرآن، گیتا اور گرنتھ صاحب تینوں کی محافظ تھیں، تقسیم ہوگئیں۔ تقسیم دل کی ہو یا دھرتی کی، چہروں کو بدل دیتی ہے۔ ارجمند بانو کے گھر کا سودا دراصل اُس بٹوارے کی طرف ایک انجانا اشارہ تھا۔ جو آنے والے حالات کی پیش بندی کر رہا تھا۔ اس تقسیم کی ابتدا مہاراج کی لگائی پانی کی اُس سبیل سے بھی ہوئی جہاں مسلمانوں کے پانی پینے کے لیے کٹوروں کی بجائے بانس کی کٹی ہوئی نالیاں رکھی تھیں۔ اس بانس کی نالی کو دیکھ کر مسلمان سمجھ چکے تھے:

> "اس بانس نالی کو دیکھ لو، جیسے یہ بانس کو چیر کے کاٹ کے اس
> بنئے نے مسلمانوں کی تضحیک کے لیے بنائی ہے نا۔ اس طرح
> کٹے بانس کی وجہ سے اس کم عقل نے اس ملک کے دو ٹکڑے کرا
> دینے ہیں۔ سوہنا اُچا بانس جیسا ملک چیر دینا ہے...... یہ
> تمہارے اچھوت چھات کے غیر مہذب فلسفے نے ملک توڑ دینا
> ہے۔" (۱۲)

اسی غیر مہذب فلسفے کی وجہ سے روشنی اور محبت کا سانجھا میلا بکھر گیا۔ جیتے جاگتے ہندوستان کے جسم پر چھری چل گئی۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والوں کو یاد آیا کہ ہمارا مذہب، ہماری تاریخ سب الگ الگ ہے۔ انگریز نے اپنے اقتدار کے خاتمے اور آزادی کا انتقام یوں لیا کہ بٹوارے کی لکیر کو دونوں قوموں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی اور نفرت بنا دیا۔ مسلمان زمین اور زر دونوں اعتبار سے گھاٹے میں رہے۔ نہرو اور بیگم ماؤنٹ بیٹن کا عشق انہیں لے ڈوبا۔ فسادات کی کہانی آگ اور خون کے دریا کی کہانی ہے۔ جس کی موجوں پر ابلیس رقص کر رہا تھا اور انسان مر چکا تھا۔ ابدال بیلا نے بڑے توازن اور حقیقت پسندی کے ساتھ اُس زمین کو بھی دیکھا جو پاکستان تھی اور اذیت ناک منظر بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے رہے جو ہندوستان میں پیش آئے۔ سکھوں کی دلیل بھی بہت قوی تھی کہ اُن کے ننکانہ صاحب، شیخوپورہ میں، رنجیت سنگھ کا ڈیرہ گوجرانوالہ میں بھاری گوردوارہ ایمن آباد میں اور پنجہ صاحب حسن ابدال میں ہیں مگر اُدھر مسلمان کیا کچھ چھوڑ آئے:

> ''لال قلعہ ہے بادشاہی مسجد ہے۔ مقدس درگاہیں ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیا، قطب صاحب ہیں۔ امیر خسرو ہے۔ دلی تو سرتا پاؤں تک مسلمان شہر ہے۔ وہاں کی گلیاں کلمہ پڑھتی ہیں۔'' (۱۳)

مسلمان گورداسپور، جالندھر، لدھیانہ اور فیروز پور میں کیا کچھ چھوڑ آئے یہ اُن کا دل ہی جانتا ہے۔ منصفی پہ چھری چلانے والے اگر بٹوارے میں انصاف کرتے تو نہ اتنا خون خرابا ہوتا اور نہ انسان زخموں سے بلبلاتا۔ ابدال بیلا نے مسلمانوں کے اتھل پتھل دل کی کہانی ایک حساس فن کار کی طرح بھی بیان کی ہے اور ایک مورخ کا تجزیاتی رویہ بھی اپنایا ہے۔ جلتے گھروں، کٹتے انسانوں اور لٹتی عصمتوں کے پس منظر میں، ان

کی اذیت کو کم کرنے کے لیے وہ ایک رومانوی قصہ بیان کرتا ہے۔ فسادات کی آگ میں جلتے ہوئے شریف پورہ کے رشید احمد شیخ کی گملوں والی حویلی جس کی حفاظت کے لیے صدر دین اور اُس کا عملہ متعین ہے۔ اُس حویلی کی سائرہ صدر دین کی محبت میں ''سیراں'' بن جاتی ہے۔ فسادات کی آگ مزید بھڑکی تو مسلمانوں کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا۔ صدر ایک انسان کی محبت کو بھول کر تمام انسانوں کی محبت سے شرابور، جلتے مکانوں اور خون میں لت پت عورتوں، مردوں اور معصوم بچوں کی جان بچاتا ہے۔ وہ لیلتہ القدر کی ناقابل فراموش مقدس رات جب آزادی کا اعلان ہوا تو سجدے میں گرنے والے شکرانے کے آنسو بہانے والے سوچ رہے تھے:

''یہ ملک بھی اللہ کی نشانی بن کر اُبھرا ہے۔ ورنہ کبھی ایسے ملک بنا ہے۔ سوائے ایک مدینہ کے۔ جب ہمارے رسول اکرم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے اُدھر چھپتے چھپاتے گئے تھے اور اللہ نے انہیں آزاد دیس دیا تھا۔ جو اللہ کے نام پہ بنی پہلی ریاست تھی۔ یہ ہمارا پاکستان ان چودہ سو سال میں دوسری ویسی ریاست ہے جو صرف اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے۔'' (۱۴)

یہ ابدال بیلا کی وطن سے زیادہ اُس عظیم الشان ہستی سے محبت ہے جو وجہِ تخلیق کائنات ہیں اور جن کے نام پر اُس پر وجد اور وارفتگی کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ اُن کے نام پر حاصل ہونے والے خطے پر، ابو الفضل اور اُس کا پورا کنبہ جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ تو اُنہیں اپنا وہ بھائی یاد آ جاتا ہے جو بچپن میں چانن کور کی جاگیر کے لیے اغوا کرا لیا گیا تھا اور اب وہ مجسٹریٹ دیوندر کمار سنگھ تھا۔ رگوں میں مسلمان خون ہونے کی وجہ سے وہ ہر جگہ مظلوموں کا مددگار بن کے سامنے آیا ہے۔ ''ٹرین ٹو پاکستان'' چلی اور فسادیوں کے ہاتھوں ایک ایک انسان بے دردی سے ذبح ہو گیا۔ صدر دین اپنی محبت

سائرہ کو بچانے کے لیے لوٹا تو مسجد میں صفوں پہ بکھرا خون اور خون میں لتھڑے قرآن پاک کی شہادت نے اُس کے دل پر "مجھے قبول کر لے رد نہ کرنا" کی کیفیت طاری کر دی۔ حضوری کی کیفیت میں اُس نے اللہ اکبر، اللہ اکبر، کہتے اذان دینا شروع کی کہ شاید یہ اس مسجد کی آخری اذان ہو۔ اس جذباتی منظر میں تخلیق اور صرف تخلیق کار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں نہیں لگتیں بلکہ قاری کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ آگ لگی حویلی سے وہ حویلی کے مکینوں کو بچانے جاتا ہے لیکن مادیت اور روحانیت کی جنگ میں شیخ صاحب اپنا دھن دولت اُٹھانے دوبارہ حویلی کا رخ کرتے ہیں۔ تو سکھوں کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے مارے جاتے ہیں۔ پھر اُس زمین پر وہ دروازہ کھلتا ہے جس کے لیے نوے سال تک کئی نسلوں نے اَن گنت قربانیاں دیں۔ پر سکون فضا میں ناول نگار اپنی محبوب سے ہماری ملاقات کراتا ہے۔ وہ محبوبہ جس کو صدیوں پہ محیط یہ کہانی سنائی جا رہی تھی۔ بیتی ہوئی تمام کہانیاں ناول کی لڑی میں یوں گرتی ہیں جیسے تسبیح کے دانے۔ "اللہ، اللہ" کا ورد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گرائے جاتے ہیں اور دانے گرانے والا یہ بھی سوچتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے حالات نے کتنے ہی کبیر داسوں کو اُن کا داس بنا دیا جو کہیں میووال کے بگو شاہ ہیں تو کہیں دیواروں پر چونا کرنے والے بہاول پور کے فضل حسین شاہ جنھوں نے بقول ابدال بیلا:

> "مکانوں کی جگہ مکینوں کے دلوں میں چونا گری کا کام شروع کر دیا ہے۔ جہاں دو کوچیاں پھیر دیتے ہیں۔ چانن کر دیتے ہیں۔" (۱۵)

یہ اُسی قافلے کا چانن ہے جس نے آج کی اندھیر نگری میں بستیوں کو روشن کر رکھا ہے۔ چنانچہ جلالی چہرے والے سرخ فقیر نے شیر خان کے روپ میں چھپے صدر دین کو غوثِ اعظم کی عدالت کا حکم سنایا اور بند آنکھوں سے وہ جگہ دکھائی جہاں اُس

کے بھائی آباد تھے اور پھر وہ آخری دروازہ نکلتا ہے جہاں جسموں کی نہیں روحوں کی کہانیاں تحریر ہیں یہ کہانیاں کسی کردار، کسی عہد اور کسی تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ ہر کردار ہر دور اور ہر عہد کی کہانی ہے:

> ''یہ تو پرانی کہانی ہے۔ تیری اور میری۔ ہر دور نے کہی ہے۔ ہر دور نے لکھی ہے۔ یہ جسموں کی نہیں روحوں کی کہانی ہے۔ جن کو جسموں میں لپیٹ کے آسمان سے زمین پر اُتارا جاتا ہے۔ تم بھی اُتری میں بھی اُتر آیا۔ تیرے اور میرے جسموں میں اُس کی اُتاری ہوئی روحیں چلتی پھرتی ہیں۔ ہم سمجھتے رہے یہ ہم ہیں۔ ہیں نا کملے۔'' (۱۶)

یہاں ابدال بیلا اُس فلسفے کا بابا نظر آتا ہے جس کے تحت ہم جڑواں روحوں میں تخلیق کر کے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے۔ ہم ہجر و فراق کی کیفیت میں اُس الگ کیے گئے حصے کے متلاشی ہیں حالانکہ وہ تو ہمارے اندر ہے۔ اس لیے کہ ہم سب کی روحیں ایک روح سے جڑی ہیں۔ سچ کے آنسوؤں سے من کی کثافت اور میلا پن صاف ہو جائے تو وہ روح خود بخود دل میں اُتر آتی ہے۔ جسم تو خالی برتن ہے اس لیے زیادہ شور مچاتا ہے:

> ''جسم قربت میں ابلاغ کرتے ہیں۔ سامنے پڑے برتن کھڑکتے ہیں۔ خالی بھانڈے زیادہ شور کرتے ہیں۔ روحوں کی بات اور ہے۔ وہ دوری میں بات کرتی ہیں۔ ہجر کی بھٹی میں جل کے کھل اُٹھتی ہیں۔ آنسوؤں کی قطار میں اُترا اُترا کے مسکراتی ہیں۔ تم نے روحوں کی بدن بولی سیکھنی ہے تو اپنے جسم کی گٹھڑی سے بے نیاز ہونا سیکھو۔'' (۱۷)

یہ سبق حسن کا بھرم بھی ہے اور عشق کی انتہا بھی۔ ابدال بیلا مذہب قوم، تاریخ و تہذیب کی تفریق سے بے نیاز ہر انسان کو جسم کی کثافت سے نکال کر روح کی لطافت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ ''حق''،''ہو'' اور ''تو ہی تو'' کی کملی میں چھپا آنکھوں کی دہلیز پہ آنسوؤں سے دستک دیتا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ آنسوؤں سے بھیگی دستک کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ دروازہ جہاں نور ہی نور ہے۔ زمان و مکاں کے خدوخال بدل جاتے ہیں۔ اندر کے سارے بت روح کی ایک ہی ضرب سے پاش پاش ہو جاتے ہیں اور یہ وہ مقام ہے جہاں حالت استغراق ہے۔ انسان ذاتِ حق کی طرف اس انتہائی منزل پر ہوتا ہے جہاں اُسے نہ اپنے وجود کی خبر ہوتی ہے اور نہ اپنے مقام کی۔ نہ ڈوبنے کی خبر ہوتی ہے نہ تیرنے کی، نہ موت کا پتا ہوتا ہے اور نہ حیات کی خبر۔ یہ مقام سجدہ ہے جہاں

''باہجھ وصال اللہ دے باہو سب کہانیاں قصے ہو''

ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' ایک طلسم کدہ ہے۔

جس میں صدیوں کی گمنی تاریخ اور تہذیب، محبت و روح کی باہمی پرواز میں ''تو ہی تو'' کی صدا لگاتی ہمارے تن من کو جکڑ لیتی ہے۔ ناول میں کئی پر اسرار واقعات ہیں۔ لیکن ابدال بیلا ہمیں چوتھی سمت اور چوتھی کھونٹ کے جال میں نہیں پھنساتا بلکہ اللہ کے سائیں لوگ ہماری روح کی آنکھیں یوں کھول دیتے ہیں کہ ہمیں ''اُس'' کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ انسان صدیوں کا بیٹا ہے۔

ابدال بیلا نے صدیوں کے خاموش انسان کو قوتِ گویائی دی ہے۔

وہ تاریخ و تہذیبی تناظر میں ہجر و فراق اور کرب و آرزو کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے اور ملاپ و وصال کے وہ لمحے بھی سامنے لاتا ہے۔ جو دھمال میں ڈھلتے ہیں تو ہر گھنگرو ''تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا'' بول اُٹھتا ہے۔ کیفیت ہجر کی ہو یا وصال کی،

اُس مخفی محبوب کو پکارتی ہے جو مخفی ہونے کے باوجود ذرے ذرے سے عیاں ہے۔

''دروازہ کھلتا ہے'' کا کینوس انتہائی وسیع ہے۔ یہاں زندگی اور کائنات کے تمام ہلکے اور گوڑھے رنگ اپنے ہر شیڈ میں توازن اور تناسب کے ساتھ ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر کہانی ابوالفضل اور اُس کے خاندان کی ہے۔ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر پاکستان بننے تک کی تاریخ ہے۔ لیکن اس تاریخ میں کہیں ''تم'' اور ''میں'' گھمن گھیریاں کھاتے ہیں تو کہیں صاحباں جیسی سریلی گائیکہ اور رقاصہ سوڈی شاہ کی ایک نظر کی اسیر ہو کر صرف ''تو'' کے علاوہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔ کہیں رانی چانن کور کی گردباد جیسی سازشیں ہیں تو کہیں لال خاں اور ارجمند بانو۔ کہیں مائی سیراں کی محبت، سیراں ثانی کی روح میں اُتر آتی ہے تو کہیں سائیں بگوشاہ کی زینب پیار کے موتی جنتی نظر آتی ہے۔ کہیں بھگت سنگھ کی روح پر پڑی دستک اُسے کبیر داس کا روپ دیتی ہے۔ کہیں شانتی، ہربنس کور اور ہرنام کور دلوں کے سنجوگ اور دیس پردیس کی کہانیاں سناتی ہیں۔ بنوارا گملوں والی حویلی کے دکھ بیان کرتا ہے اور ٹرین ٹو پاکستان میں فسادات اور ہجرت کے رستے ہوئے زخم ہیں۔ جن سے اٹھنے والی درد کی لہریں یہ احساس دلاتی ہیں کہ دروازہ یونہی نہیں کھلتا؟ اسے کھولنے کے لیے صدیوں ننگے پاؤں تپتی دھوپ میں چلنا پڑتا ہے۔

ابدال بیلا کا کمال اور انفرادیت یہ ہے کہ اتنے وسیع کینوس اور کرداروں کے ہجوم میں نہ تو وہ خود گم ہوتا ہے اور نہ قاری کی اپنی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ایک کہانی سے دوسری سے تیسری کہانی کے تسلسل میں لحہ بہ لحہ قاری کی دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کہیں داستان کی ماورائیت ہے تو کہیں ناول کی حقیقت پسندی۔ کہیں افسانے کی رومانیت ہے تو کہیں ڈرامے کا کلائمکس۔ کہیں سوانح کی بھول بھلیاں کہیں سفرنامے کی پراسراریت ہے۔ تو کہیں آپ بیتی کی دستک جو جسم و جاں کے سارے

دروازے کھول دیتی ہے اور ہر دروازے کی اوٹ سے ابدال بیلا کا چہرہ جھانکتا ہے۔ اس سارے کھیل تماشے کے مرکز میں وہ روشن جھروکا ہے۔ جو محبت اور تصوف کی مختلف گزرگاہوں کے بعد وصال کامل کی نوید دیتا ہے۔ ابدال بیلا کا محبوب ہر لمحہ اُس کے ساتھ ہے، جس سے وہ ہر گام ہمکلام ہے۔ ہر سوُ اسے دیکھتا ہے۔ وہ اس دنیا کا کوئی مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ تو ابتدا بھی اور انتہا بھی۔ وہ بیلا کے صیغۂ تانیث میں ملتا ہے لیکن وہ ہے صرف تم:

> ''صبح ہوتی ہے تو تم مشرق سے اُجالے کی خوشبو میں سورج کے رتھ پر بیٹھ کے نکلتی ہو۔ کبھی تم دھوپ میں ہوتی ہو کبھی سایوں میں چلتی ہو۔ کبھی ہوا میں جھولتی ہو۔ کبھی خوشبوؤں میں سفر کرتی ہو۔ کبھی تمہارا چہرہ مجھے ہریالی کے اک اک پتے پہ کھلا دکھتا ہے۔ کبھی پھول کی پنکھڑی میں تم مسکراتی ہو۔ بادلوں میں تمہارا سفینہ چلتا ہے بارشوں کی بوند بوند میں تم اُترتی ہو۔ دریاؤں کی روانیاں تم سے کلام کرتی ہیں۔ چلتی ندی کے پانیوں میں تم سر گوشیاں کرتی ہو۔ آبشاریں تیری کہی باتیں کہتی ہیں۔ جھرنے تیرے مسکرانے کی بات کرتے ہیں۔ کوئل کی کوکو ہو یا پپیہے کی آواز، فاختہ کی باتیں ہوں یا چڑیوں کی چوں چوں سب تیری کہی باتیں کہتے ہیں۔ شام کا اندھیرا ہو یا روشنی بھرا دن تم ہر جگہ ہو۔'' (۱۸)

یہ عشق کی انتہا ہے جہاں تن و روح کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔ ''میں'' اور ''تو'' کی بحث میں صرف ''تو'' ہی ''تو'' رہ جاتا ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' برسوں کی معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور نفسیاتی مسافتوں کی کہانی ہے۔ جس کے کردار بڑی ہنر مندی سے تراشے گئے ہیں۔ اُن کی سوچ، اُن کی گفتگو، اُن کی حرکات و سکنات، یہاں تک کہ

لباس اور آرائش وزیبائش بھی اُسی منظر نامے کا حصہ ہے جس میں اُن کی تراش خراش کی گئی۔ ابدال بیلا نے کرداروں کو کٹھ پتلیاں نہیں بنایا بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین مطابق متحرک نظر آتے ہیں۔ کردار مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔ سچی محبتوں سے دلوں پر حکومت بھی کرتے ہیں اور نفرتوں سے انسان کی بجائے درندے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ بابا لوگوں کو چھوڑ کر تمام نسوانی کردار پورے ناول اور ناول کی ہر کہانی میں حاوی اور چھائے نظر آتے ہیں۔ لفظ و لہجے کی تازگی، جذبے کی حدت، گم شدہ محبت کی خانقاہیں، تاریخ و دیومالائی، روحوں کا سنجوگ اور ''تو'' کی پکار یہ وہ زاویے ہیں جو بیک وقت اُردو کے کسی اور ناول میں نہیں ملتے۔ ابدال بیلا نے انتہائی نفاست، نزاکت اور فن کارانہ ہنر مندی سے انہیں یوں سمیٹا ہے کہ ہر زاویہ روشن ہے۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' زندہ اُدب کا زندہ شاہکار ہے۔ ابدال بیلا نے آنے والوں کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ دیکھئے اس پر اگلی دستک کس کی ہوگی۔

حوالہ جات

(۱) The Novel and the People

(۲) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۴۶

(۳) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۸۶۴

(۴) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۸۶۴

(۵) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۹۰۷

(۶) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۹۹۴

(۷) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۰۴۷

(۸) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۰۴۷

(۹) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۲۷۹

(۱۰) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۳۲۹

(۱۱) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۳۷۲

(۱۲) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۵۴۳

(۱۳) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۵۸۴

(۱۴) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۶۵۶

(۱۵) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۷۷۴

(۱۶) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۷۸۹

(۱۷) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۷۹۴

(۱۸) ''دروازہ کھلتا ہے'' ص ۱۷۰۶

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

''دروازہ کھلتا ہے'' کا ہندی ترجمہ

ہر عظیم الشان ادبی شاہکار ناول کی اہمیت اس کے حلقہ اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ کہنے کو اس پرکھ کے ہزار زاویے اور رخ ہیں مگر جو ناول زمان و مکان کی ہر قید سے آزاد ہو کے ہر دور کے پڑھنے والوں کی دلچسپی کا اس شدت سے باعث ہو جائے کہ ان کی زندگی سے ہی وابستہ رہے، وہ امر ہو جاتا ہے۔ ناول کی ڈکشن، اس کے کردار، کرداروں کا علاقہ، وقت اور جگہ، ناول کی تفہیم، نظریہ، کرداروں کا تنوع، موضوعات کی رنگارنگی، واقعات، تجربات اور کہانی کے موڑ، یہ کسی طویل سفر پہ نکلے ہوئے دریا راستے پہ آئے ہوئے مشاہدات ہیں۔ آبشاریں، ندیوں کا ملاپ، اچھلتے چشمے، پہاڑی راستوں میں بہاؤ کی تیزی، میدان میں اس کا کھلا پاٹ اور پھر ہزاروں میل کی مسافت پہ اس دریا کا سمندر میں مل کے سمندر بن جانا۔ پھر سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سے قطرہ قطرہ ہو کے بادل بن کے پھر اسی پہاڑ کی چوٹی کی طرف بادل بن کے جانا، جہاں سے دریا نکلا تھا۔ دروازہ کھلتا ہے، ایسا ہی ایک ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی دریا سفر ہے جو دریا کی بہتی روانی سے چلتا ہے اور سمندر میں

مل کے پھر پلٹ کے اسی دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ سفر جہاں سے شروع ہوا تھا۔ عجیب مدبھری گھن گرج، ٹھنڈی ہوا اور مسکراتی بجلیوں سے، یہ کہتے ہوئے کہ دیکھو، یوں، دروازہ کھلتا ہے۔

میں خود ایک قلم کار ہوں، پچھتر سال کی زندگی میں آدھی صدی سے زیادہ میرا قلم اور کاغذ کا رشتہ ہے۔ اپنی زندگی کے بیتے سالوں کی گنتی سے زیادہ میری لکھی کتابوں کی تعداد ہے۔ چونکہ تخلیقی ادب کا رسیا ہوں، ہر لکھنے والے کی طرح میں نے بھی دنیا کا ادب پڑھا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے دنیا کا کوئی بھی ناول کبھی مجبور نہیں کر سکا کہ میں اس کا ترجمہ کروں۔ دنیا کے بڑے بڑے شاہکار کہے جانے والے ناول میں نے پڑھے۔ ہر ناول کے کردار، کرداروں کا علاقہ اور ان سے وابستہ تہذیبی اور تمدنی رویے اور ان ناولوں سے نکلے ہوئے تصورات مجھے ہمیشہ محدود لگے۔

میں نے روس کے شہرۂ آفاق ناول نگار پڑھے، لیو ٹالسٹائی، میکسم گورکی، چیخوف، دوستوویکی، نکولائی استرو، یورپی اور امریکی ناول نگاروں کے ناول بھی میری نظر سے گزرے۔ فرانس کا گستاف فلوبیر، سارتر، ائرلینڈ کا جیمس جوائس، برطانیہ کا ڈی ایچ لارنس بھی پڑھتا رہا۔ ٹی ایس ایلیٹ، آلڈس ہکسلے، ای ایم فوسٹر، گرام گرین کو بھی پڑھا۔ جدید دور کا گبریل گارشیا اور پھر اپنے برصغیر کا رابندرناتھ ٹیگور بھی۔ مجھے دنیا کے مانے ہوئے ان ناول نگاروں میں سے کسی کا ناول دنیا کے اتنے زیادہ لوگوں، اتنے زیادہ علاقوں اور اتنے طویل تاریخی عہد سے مناسبت رکھتا نظر نہیں آیا، جس میں کمال ادبی مہارت سے ایسی کہانی کہی گئی ہو کہ جو پڑھنے بیٹھے، اسے اپنی کہانی لگے۔ جس میں زندگی کے سارے رنگ، آسمان کی پوری قوس قزاح موجود ہو۔

پاکستان کے ممتاز ناول نگار ابدال بیلا کا لکھا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' پڑھنے بیٹھا تو میری ساری زندگی کی تلاش گویا مکمل ہوگئی۔ مجھے ایک ایسا ہی عالمی شاہکار مل گیا جو

صرف میرے لیے ہی نہیں، اس دنیا کی ایک تہائی آبادی سے زیادہ لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اٹھارہ سو صفحوں کا یہ ضخیم ناول جسے پہلی بار دیکھ کے پڑھنے والا سہم جاتا ہے کہ اسے کھول کے پڑھ بھی پائے گا یا نہیں۔ مگر اس ناول کو جس نے کھول لیا، وہ اسے پھر بند نہیں کر سکتا۔ یہ ناول کچھ ایسی دلچسپ زبان میں لکھا گیا ہے کہ اس ناول کی ہر کہی بات دل سے چپک جاتی ہے۔ کوئی ہاتھ میں رنگین ہائی لائٹر لے کر بیٹھا ہو تو اس ناول کی ہر چوتھی یا پانچویں سطر ایسی ہے جسے وہ انڈر لائن کرے۔ روانی تحریر کی ایک دریا جیسی ہے۔ یہ دریا کبھی تیز بہنے لگتا ہے، کہیں یہ چشمہ بن کے اندر ہی اندر نئے نئے معانی اچھالتا ہے، کبھی آبشار بن کے ناول میں لکھی باتیں روح کی گہرائی میں اترنے لگتی ہیں۔ پہاڑی راستوں کے دریا کی طرح کبھی یہ بلٹ ٹرین کی طرح بھاگتا ہے کبھی میدانوں کے پیٹ میں اس کا پھیلاؤ پھیل کے مسکراتا ہوا لگتا ہے۔ ناول کا یہ بہاؤ اپنے ساتھ اپنا پانی اور راستے کے کنکر اور پتھر ہی نہیں حیرت کدوں کے سفینے لے کے بہتا ہے۔

کسی ناول میں چند ایک کرداروں کی کہانی میں بنت کو بنتے سمے ناول نگار سے اکثر کہیں نہ کہیں ہاتھ کی ڈور ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ ابدال بیلا نے اس ناول میں کرداروں کی ایک کہکشاں پرو دی ہے۔ پورا آسمان زمین پر اتار لیا مگر کہیں ایک سطر ایک لفظ بھی اس ناول میں فالتو لکھا نظر نہیں آتا۔ کہیں قاری کی دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر نئے صفحے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

کہنے کو اس ایک ناول میں تین سو سے زیادہ کردار ہیں، جو بذات خود شاید ایک عالمی ریکارڈ ہوں۔ مگر مجال ہے کہ لکھا ہوا کوئی کردار چیخے کہ مجھ سے سوتیلا سلوک کیا ہے۔ ہر کردار، ہیرے کی کنی سے تراشا ہوا، چمکتا نگینہ۔ پھر یہی نہیں کرداروں کی جگہیں بے شمار ہیں۔ ان کرداروں کا علاقہ عمومی طور پہ پورا متحدہ ہندوستان ہے مگر یہ کردار متحدہ ہندوستان کی سرحدوں سے باہر نکل کے ایک طرف افغانستان اور ایران

جا نکلتے ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کے عین بیچ سے زندگی بیتتے بنگال سے ہو کر برما جا پہنچتے ہیں۔ سنگاپور، نیپال، سری لنکا تک کی خوشبو یہ کردار سونگھتے پھرتے ہیں۔ انہی کرداروں میں سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریز عہد کی میم صاحب مریم بھی ہے، ارجنٹائن کی ماریا بھی ہے دوسری عالمگیر جنگ سے وابستہ مشاہیر بھی ہیں۔ یوں صرف کرداروں کے علاقوں سے اس ناول میں آدھی سے زیادہ دنیا سمٹ آتی ہے۔ صرف متحدہ ہندوستان سے وابستہ ملکوں پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ ایران، افغانستان اور برما کی آبادی کو سامنے رکھا جائے تو اس ناول کی دلچسپی کا باعث چھ ارب کی ہماری پوری دنیا میں سے دو ارب سے زیادہ لوگوں کی یہ اپنی کہانی لگتی ہے۔ اس کہانی میں ممتاز مانے گئے ناولوں کی طرح صرف ایک کہانی نہیں، ہزار ہا کہانیوں کا طلسم ہوش ربا ہوش اڑا دیتا ہے۔ کہنے کو یہ کہانیاں الگ الگ ہوتے ہوئے بھی کمال مہارت سے ایک ڈور کے ساتھ مضبوطی سے بندھی ہوئی ہیں۔ یوں اس ناول کا پلاٹ حیرت انگیز حد تک چوکس اور تنا ہوا ہے۔ ایک اونچی آسمان کی رفعتوں میں اڑائی ہوئی ایسی پتنگ کی طرح جو کہنے کو چاند کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہو مگر اس کی ڈور کہیں سے بھی ڈھیلی نہیں ہوتی۔ ڈور بھی ایسی کہ اسکی کاٹ آنے والی صدیوں تک کو لہولہان اور معطر کرنے کی شکتی رکھتی ہے۔

یہ ناول عالمی ادبی تناظر میں ایسا منفرد شاہکار ہے جو آج تک کسی اور سے لکھا نہیں گیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس کا انتساب خدا کے نام ہے۔ لگتا ہے پر ماتما نے اس ناول نگار کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے اس ناول کو ہمیشہ جینے کی زندگی دے دی ہے۔ یہ ناول جہاں اتنے کرداروں کے ستاروں کا جھرمٹ ہے وہاں اس کے دو مرکزی کردار ہیں، ایک صیغہ متکلم میں لکھا ہوا ناول نگار "میں" اور دوسرا اس کی محبوبہ "تم"۔ یوں ایک لحاظ سے یہ اٹھارہ سو صفحوں کا ناول ایک "پریم پتر" ہے جو ناول نگار نے اپنے محبوبہ کے لیے لکھا ہے اور مزے کی بات ہے، آخری سطر تک بھی یہ خط

جاری ہے، لگتا ہے، ابھی بات باقی ہے۔

اس ناول کے علاقوں میں کرداروں کا زیادہ تر عرصہ مشرقی پنجاب کے شہر ''لدھیانہ'' اور اس کے مضاف میں گزرتا ہے۔ یوں آدھی دنیا پہ پرکار کی قلم رکھ کے اگر دائرہ بنایا جائے تو اس ناول کا مرکزی نقطہ لدھیانہ ہے۔ جو انڈین پنجاب اور خصوصاً لدھیانے کے لیے ایک انتہائی امتیازی شان رکھتا ہے، جو دنیا کے کسی اور شہر کو اب تک نصیب نہیں ہوا۔

لدھیانہ شہر اور اس کے مضاف کے گاؤں، برٹش انڈیا کا عہد جب متحدہ ہندوستان میں تمام مذاہب کے لوگ محبت امن اور سلامتی سے رہتے تھے۔ اس زمانے کے عام لوگوں کی یہ کہانی ہے جو انگریز کے عہد میں یورپ سے آئی ہوئی کئی نئی ایجادات کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ یہ اس زمانے کی باتیں جب متحدہ ہندوستان کے طول وعرض میں انگریز کی بچھائی ہوئی ٹرین کی پٹریاں بچھ رہی تھیں، سڑکوں پہ بیل گاڑیوں کی جگہ موٹریں چلنا شروع ہو گئیں تھیں۔ گاؤں میں کنوؤں کی بجائے لوہے کے پائپ زمین میں لگا کے ہینڈ پمپ سے پانی نکالا جانے لگا تھا۔ گھروں میں تیل کے جلتے چراغ بھی تھے اور شہروں میں بجلی کے قمقمے جلنے لگتے تھے۔

اس دور سے بھی پہلے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لگے لیمپ پوسٹ پہ ہر صبح ہر شام ایک بابا کندھے پہ کپڑا ڈالے، ہاتھ میں تیل کا پیپا پکڑے لیمپ پوسٹ سے بندھے مٹی کے تیل سے جلتے لیمپ کو رسی کی گرہ کھول کے ہولے ہولے اتارتا، لیمپ میں تیل بھرتا، اس کی چمنی کندھے کے کپڑے سے صاف کرتا، اس کی بتی جلاتا اور پھر کسی جھنڈے کو ایستادہ کرنے کی طرح اس رسی کو دھیرے دھیرے کھینچتا ہوا لیمپ پوسٹ کی سب سے اوپری نکر پہ لیجا کے بیچے رسی باندھ دیتا۔ اندھیری گلیوں میں روشنی کی پیوندکاری کرتا۔ بچے اس بابا کے ہاتھوں لیمپ کو اترتے، صاف ہوتے اور جلتے دیکھ کے اکٹھے ہو جاتے۔ ہر شام اس کا انتظار کرتے اور اس کو ''بابا جی'' کہتے کہتے اس

کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے۔ ہماری تہذیبی روایات کو ہمارے بنتے سنورتے تمدن کی ایک ایک انیٹ کو اس ناول میں محفوظ کیا گیا ہے۔

ستلج دریا سے جب ایشیاء کی سب سے بڑی نہر سرہند نہر نکلی تو اس ناول کا مرکزی کردار ''ابوالفضل'' وہاں موجود تھا۔ نہر بنانے والے مزدوروں میں ایک وہ بھی تھا۔ نہروں کی سیدھی سنوری پٹریوں پہ بیل گاڑی چلتی اور اس سے بندھی کشتی نہر کے اندر نہر افسروں کو لیے پھرتی۔ نہر بنگلے کی زندگی اس ناول میں پوری تفصیل سے بیان ہوئی کہ کچھ اس حسن اور چاشنی سے کہ وہ سارے کردار جیتے جاگتے آج بھی وہیں کھڑے نظر آتے ہیں۔

شہروں اور قصبوں میں میلے لگتے۔ سرکس آتی، ناچ گانا ہوتا، پنڈال سجتے، پہلے سٹیج ڈرامے ہوتے تھے۔ پھر خاموش فلم یورپ سے آ گئی۔ اسٹیج کے پاس سارنگی طبلے اور گانے والے لائیو میوزک دیتے۔ پھر انہی خاموش فلموں کو آواز مل گئی۔ پہلے فلم کا شہر کلکتہ بنا پھر فلم انڈسٹری بمبئی چلی گئی۔ اس ناول کا ایک کردار ان تمام ادوار سے گزر کے لدھیانہ سے بمبئی پہنچ کے فلم ایکٹر بن جاتا ہے۔ ہندوستان کی شہرۂ آفاق فلم انڈسٹری کا آغاز اس کا نقطہ انتہا اس ناول میں کرداروں کی بنت میں رکھا گیا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار ابوالفضل اور اس کے بیٹے جہاں اس ناول میں پورے ہندوستان میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، وہیں اس ناول کے مرکزی دھارے سے ملنے والا ایک دریا، دہلی، لکھنوآگرہ اور علی گڑھ سے ہوتا ان میں آن ملتا ہے۔ دہلی سات بار بنا، آٹھویں بار انگریز نے نئی دہلی بنائی۔ لال خان دہلی کا بیٹا تھا۔ جو اپنی بیٹی ارجمند بانو کو اکثر کہا کرتا تھا:

> ''میں جنم جنم پہ یقین تو نہیں رکھتا مگر مجھے لگتا ہے، پچھلے جنم میں میں لال قلعہ تھا۔ آباد لال قلعہ، طلس وکمخواب کی سرسراہٹوں میں گلاب وعنبر سے مہکتا ہوا لال قلعہ۔''

وہ اپنی بیٹی کو دہلی کی کہانی سنایا کرتا تھا،

''مہابھارت کے دور میں تین ہزار سال پہلے، پرانے قلعے کے پاس اندر پرست نام کا شہر تھا۔ وہ ہی دہلی تھی۔ اشوک کے پاتلی پتر سے بھی ایک ہزار سال پہلے کی بات کرتا ہوں، وہ کہتا ہے، بہتیرے راجے مہاراجے ادھر گزرے، پھر اننگ پال لوہے کی لاٹھ لے کر آیا۔ جوتشیوں نے جگہ کا یقین کیا۔ لاٹھ زمین میں گاڑھ دی گئی۔ اننگ پال کو شک ہوا۔ کہیں غلط نہ گاڑھ دی گئی ہو۔ جوتشیوں سے دریافت کیا، جگہ صحیح کہی یا غلط، وہ بولے صحیح ہے۔ نیچے زمین کے اندر عین اس جگہ پہ اس وقت سانپوں کا بادشاہ شیش ناگ کا سر ہے۔ جو اس سے لوہے کی لاٹھ سے کچلا گیا ہے۔ اننگ پال کو شک ہوا۔ کہیں مہنت کہانی نہ سنا رہے ہوں۔

حکم دیا لاٹھ باہر کھینچو۔ اس کا نچلا کونا دکھاؤ۔ لاٹھ باہر نکلی تو دیکھا، اس کے نچلے کونے پہ تازہ خون لگا ہوا تھا۔ خوش ہو کے بادشاہ نے لاٹھ دوبارہ لگوادی۔ شاید اس لیے ڈھیلی رہ گئی۔''

لال خان کا دادا غدر میں مارا گیا تھا۔

قطب مینار کے سامنے پھانسی پہ چڑھا تھا۔

قطب مینار، لال خان کی آنکھوں کا آخری منظر تھا۔''

ناول نگار نے قطب مینار کے سیڑھیاں تک گن کے تین سو اٹھتر لکھی ہیں۔ دہلی کی ساری تاریخ، اننگ پال سے پرتھوی، پھر غوری، پھر تغلق کا وہ زمانہ بھی جب اس نے دہلی اجاڑ کے دکن میں نئی راجدھانی بنائی اور پرجا کو حکم دیا، چلو چلو، دیوگری چلو، دہلی اجڑ گیا۔

ملتان میں پیدا ہوا فیروز شاہ تغلق بعد میں آیا۔ وہ اجلا اور پاکیزہ آدمی تھا۔ اس

کے عہد میں بلند بانگ مقبرے، باغ اور سرائے بنیں۔ فیروز آباد آیا ہوا۔ اشوک کے ستون اس نے ایسا تازہ کیے۔ پھر تیمور لنگ آفت بن کے دہلی پہ حملہ آور ہوا۔ تیمور کا وہ سارا احوال، جب ہیضہ کی وبا نے بچی کچھی دہلی تیمور سے بچالی۔ کیونکہ تیمور کو خود ہیضہ ہو گیا تھا، کھانے کے لیے ملائی منگوائی۔ ملائی لانے والے خادم کو بھی ہیضہ ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، پیالہ تیمور کو پکڑاتے ہوئے، تیمور کے پیالے میں اس نے قے کردی۔ وہ قہر تیموری جو بستیاں اجاڑ دیتا تھا کھوپڑیوں کے مینار بناتا تھا، اس کے ہاتھ میں پکڑے، اس کے پیالے میں خادم کی قے۔ پھر کیا ہوا؟

کیا کیا بتاؤں، یہ ناول متحدہ ہندوستان کا وہ عالیشان میوزیم ہے جہاں قدیم ہندوستان سے لیکر اس کی تقسیم تک کا سارا تہذیبی اور تمدنی احوال، بادشاہوں کی زبانی نہیں، عوام الناس کے توسط سے بیان کرتا ہے۔ وہ عام دیہاتی جسے کسی بادشاہ نے غور سے دیکھا بھی نہیں تھا، نہ اب تک دیکھا ہے، مگر وہ دکھی اور سادہ انسان زمانہ قدیم سے جدید تک ہر حکمران کے لیے ایک لنگوٹ پہن کر ننگے پاؤں خدمت میں جتا رہا۔ یہ خدمت گزاری اب تک جاری ہے۔ یہ انقلاب طلب پروگریسو کہانی انہی کرداروں کی کہانی ہے۔

''دہلی کی آخری کہانی'' میں لال خان اپنی بیٹی ارجمند بانو کو کہتا ہے:

''کہانی کیا کہنی ہے، بھائیوں کے ہاتھوں بھائی مرتے گئے، کوئی تلوار سے مرا، کوئی زہر سے مارا گیا۔ کسی کو دشمن بنا کے مارا۔ کسی کو دوستی میں ساتھ ملا کے گرایا۔ سارے بھائی مر گئے۔ ایک بچ گیا۔ اس نے باپ کو قید کر لیا، خود بادشاہ بن گیا۔ بس یہی ہماری دہلی آخری کہانی ہے کہ وہ ایسی کہانی کے بعد پھر کسی بڑی عالیشان کہانی کی گنجائش نہیں رہی۔''

لال خان کے ساتھ اس کا بھائی کالے خان کیا کرتا ہے؟ کالے خان کی بیوی کیسے برتاؤ کرتی ہے۔ یہ بادشاہوں کی نہیں ان لوگوں کو کہانی ہے جو غدر سے بچ گئے تھے، مگر غدر ان کے گھروں میں پہنچ گیا تھا۔ یہ اس وقت کا احوال ہے جب دہلی سبزی منڈی کے شمال سمت انڈیا گیٹ بن رہا تھا۔ پینتالیس گز اونچا جس کے چاروں طرف مچانیں لگیں تھیں اور مستری اوپر چڑھے لکھے ہوئے ہزاروں ناموں کی تختیاں اس پہ آویزاں کر رہے تھے۔ ارجمند بانو دہلی سے نکلتے سمے وہ دروازہ دیکھ کے اپنی ماں سے کہنے لگی۔

''ماں ذرا یکے والے سے کہوں، ادھر سے ہو لے

کیوں؟

ماں بولی

ماں ابا کہتے تھے، اس دروازے پہ انگریز سرکار ان پچاس ہزار سپاہیوں کے نام لکھوا رہی ہے جو افغان جنگ اور پہلی جنگ عظیم میں مرے تھے۔ شاید ان میں اپنے دلارے میاں کا نام ہو؟

نہیں بیٹی، رہنے دو۔ ایسی تختیوں میں زہر باد اور زہر سے مرنے والے شہیدوں کے نام نہیں ہوا کرتے۔ اب کہیں رک کے نہ دیکھنا۔

یہ طلسماتی شہر ہے۔ یہاں مڑ کے دیکھنے والوں کی روحیں لال قلعوں، میناروں اور حویلیوں میں ٹنگی رہ جاتی ہیں اور وہ خود بنا روح کے جسم کے لیے راستوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ چل بیٹی، سیدھا دیکھو۔ وقت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے، اور یاد رکھو وقت سے بڑا پہلوان کوئی نہیں ہے......

بس میری بیٹی جاگتی رہ جن حادثوں کو ہونا تھا، وہ ہو گئے۔''

دہلی لکھنؤ کی شاندار تہذیب کے پہناوے، لباس کی تراش خراش، کھانوں کی تفاصیل، کبوتروں کا شوق، شعروشاعری کی محفلیں، حکمت اور فراست کی کہانیاں، کس کس کا ذکر کروں، جو ناول نگار نے یہاں کیا ہے۔ مزے کی بات ہے دہلی، لکھنو، بریلی، رامپور اور علی گڑھ کا ذکر کرتے سمے ناول نگار اپنے ادھر کے کرداروں کے منہ میں اسی عہد، اسی زمانے کی زبان ڈالتا ہے۔

''ان کے دستر خوانوں پہ، آرائش گھر کی مہریاں، آبدار خانے ساتھ لیے ہوتیں، تنجن، موتی پلاؤ، ریشمی کباب، بریانی، گرکاریاں، شیرمال اور کئی اقسام کے میٹھے ہوتے۔''

''گھر گھر سہولت اور خوشحالی کے انبار لگے تھے۔ ہر کوئی مزے میں مست۔ زندگی ان دنوں ڈھول تاشوں، روشن چوکی، نوبت، بگل، اور ڈنکے پہ بجتی تھی۔ کنچیاں، چونے والیاں اور ترت رنگی وہیں منڈلیاں بنائے، ڈیرے اٹھائے، امیروں کے گھروں میں آتی جاتی تھیں۔ پہلی حویلی میں ہمارے داد کہتے ہیں......''

''پان منہ میں رکھے، چھت پہ چڑھ کے کنکوئے اڑاتے، اپنے ہاتھ سے بیٹھ کے تنکلوں کی کانپیں درست کرتے، تکل اڑتی تو ساتھ بیس بیس روپے کی جھل جھل اڑائی جاتی۔ جو پتنگ لوٹتا نہال ہو جاتا۔''

''مرزا نوشہ غالب تو لال خان کے دادا حضور کی پہلی حویلی کے نوشہ خانے میں کئی بار تشریف لائے، کئی بار ان کے روبرو اصیل مرغوں کو پال میں اتارا گیا۔ پانچ پانچ دن مرغ لڑا کرتے تھے۔ چاقو سے مرغ کی چونچیں تیز کی جاتی تھیں۔ جدھر چونچ پڑتی

بوٹی نکال لیتے۔ پانی کی پھواریں مار مار کے زخموں کو سہلایا جاتا
مرغ کے زخم تو منہ میں لے کے ایسے چوسے جاتے تھے کہ زخم
سنور جاتے تھے۔ مرغ پھر سے پاؤں پہ اکڑ جاتا۔ اصل مرغ تو
بھا بھی، مر جاتے لیکن پال سے نہیں نکلتے......''

پرانے وقتوں میں وقت کا حساب وہاں کیسے رکھا جاتا تھا ذرا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

''محلہ حضرت گنج میں اپنے نانا کا دولت کدہ اب تک یاد ہے۔
ان کے پڑوس میں ایک نواب کی حویلی تھی۔ جس پہ آٹھوں پہر
نوبت بجتی تھی۔ ہر پہر میں آٹھواں گھڑیال۔ بچپن میں کئی بار تو
ہم خود سہیلیوں کے ساتھ اِدھر گئیں۔ نوبت بجتی دیکھنے۔ کیا منظر
ہوتا تھا۔ پتیلے میں چھید ہوا پیتل کا کٹورا پڑا ہوتا۔ ایک گھڑی
میں بھر جاتا تو پہرے دار کٹورا اٹھا کے خالی کر کے رکھتا اور نوبت
بجا دیتا۔ ہائے کیا آواز ہوتی تھی اسکی۔ اب وہ زمانے کہاں
بھائی صاحب۔ وہ آواز تو گم ہو گئی............''

اٹھارہ سو صفحوں کے اس ناول میں پچپن باب ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ناول کا ہر باب بھی اپنی جگہ مکمل ایک وحدت اور کہانی رکھتا ہے۔ مگر سب باب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، ایک دھاگے میں پروئے ہوئے، جیسے کسی مہان کاریگر کا بنایا ہوا نولکھا ہار، اس ہار میں ہر دانہ ہیرا، یاقوت، پکھراج اور نیلم ہے تو ان موتیوں کو جوڑ کے رکھنے والا دھاگہ محبوبہ ''تم'' اور ہار کی کنی پہ اپنی ذات سے نکلا ہوا، اپنی ''میں'' کو تیاگ دینے والا امام ''میں'' مصنف کا صیغہ متکلم۔ میں اور تم کے حوالے سے عشق و محبت کا وہ فلسفہ بیان ہوا ہے کہ دنیا کی سب پریم کہانیاں اسے پڑھنے کے بعد ہیچ لگتی ہیں۔

اس ناول میں پنجاب دیس کا وہ عظیم الشان کلچر، تہذیب، تمدن روایات اور دو آبے کی خالص بولی کا بیان ہوا ہے جو پنجاب کی پہچان ہے۔ محبت، رواداری، بہادری، جی داری، مہمان نوازی، سادگی اور وسیع القلبی۔ ان میں اس زمانے کے جوگیوں مہنتوں، صوفیوں، سنتوں، درویشوں، ڈاکوؤں، لٹیروں، نقالوں، بھانڈوں، ہیجڑوں اور طوائفوں کے قصے ہیں۔ سائیں بگو شاہ اس ناول کا بہت مضبوط کردار ہے۔ جو اپنے گیان اور وجدان سے جیسے تیسری آنکھ رکھتا ہے۔ اس کا ڈیرہ ایک بن کے نیچے ہے۔ ہر دھرم، مذہبت اور فرقے کے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے برتن بن کے اور وہ ان میں روشنی کی پیوندکاری کر کے انہیں سکون قلب دیتا ہے۔ اس کے ڈیرے پہ اک دن چندکور آتی ہے، جسے ولایت سے اپنا سرون سنگھ بلوانا ہوتا ہے۔ ناول میں سوڈی شاہ بھی عجیب درویش ہے، جس کی نظر کرم سے لگی پھانسیاں اتر جاتی ہیں۔ اس کے ڈیرے پہ اک دن لدھیانے کی سب سے تیکھی طوائف صاحباں، اپنی بگھی روک کے پوچھ لیتی ہے، سائیں تیری دیگ میں کوئی ہمارا حصہ بھی ہے کہ نہیں؟

''صاحباں اپنے ضلع کی سب سے تیکھی طوائف تھی۔

جو اُسے دیکھتا، اسے سوئیاں چبھنے لگتیں۔

مرچوں کی کونڈی اس پہ موندی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نظر دیکھ کے اسے مہینوں سوں سوں کرتا رہتا۔ ایسا منہ زور حسن تھا اس کا کہ سر پہ چڑھ کے اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ یہ کماد سے اونچا قد، لمبی چکنی گردن، صندل ملی دودھیا رنگت، تیکھے کٹار جیسے نقش، کہانیاں کہتی بجھارتیں بجھاتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ ایسی روشن کہ انہیں آدھی رات کو دیکھ کے لگے کہ صبح ہونے لگی ہو۔ اوپر کمان سی بھویں جو سپولیوں کی طرح اس کے ماتھے پہ

سرسراتیں اور اس کی کہی ان کہی نگاہوں کے نئے نئے مفہوم
جگاتی۔ ایک نظر بھر کے وہ کسی کو دیکھ لیتی تو ہیر سیال سے لیکر مرزا
صاحباں تک کی ساری داستانیں کہہ ڈالتی۔
اسے دیکھتے ہوئے دیکھنا ہر کسی کے بس میں نہ تھا۔''

''دروازہ کھلتا ہے'' میں یوں تو ہر کردار ہی زندہ جاوید ہے، مگر ابدال بیلا نے اس ناول میں عورتوں کے کردار انوکھی مہارت سے لکھے ہیں۔ ان لازوال کرداروں میں کس کس کا ذکر کیا جائے، سڈول چھاتیوں والی بلو، کہیں اپنے چاہنے والوں کے سامنے اپنی قمیض کا پلو سرکا کے اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور گھروں میں کہرام مچادیتی ہے۔ کہیں رانی چانن کور کی راجیہ ہے جو اتنی اُجلی ہے کہ اس نے اپنے سراپا پہ اندھیرے کی ایک بوند بھی نہیں گرنے دی۔ چانن ہی چانن کرلیا۔ مگر خدا سے ملے اس گراں قدر حسن اور بارہ گاؤں کی جاگیر ہوتے ہوئے اولاد کی نعمت سے محروم رہی۔ وہ ضد کی پکی تھی۔ اسے ہر حال میں اپنی جاگیر کا وارث چاہیے تھا۔ عجیب کہانی در کہانی ہے۔ محلاتی سازشیں ہیں، کہیں محبت کے نغمے ہیں۔ انسانی نفسیات کی پوتھیاں ہیں، عشق اور فراق کا فلسفہ ہے۔ محبت کی معراج اس ناول میں ''سیراں'' ہے جو کائنات کی وسعتوں میں اپنے محبوب کا چلا ہوا ہر قدم اپنی روح کے چلن میں محسوس کرتی ہے اور اپنے محبوب کی موت کے مدتوں بعد بھی جب وہ آنکھوں کی بصیرت سے محروم ہو جاتی ہے تو اپنے محبوب کے بیٹے کی کلائی کی نبضیں سونگھ کے پہچان لیتی ہے کہ وہ اس کے ''صاب'' کا بیٹا ہے۔

لاڈو ایک درویش محکم دین کی لاڈلی ہے۔ ہے وہ گوپال سنگھ جوشی کی بیٹی جو اس بابا کی دعا سے پیدا ہوتی ہے، مگر بڑی ہو کے جب اس کے سسرال والے اس سے بدسلوکی کرتے ہیں تو وہ قبر میں لیٹے ہوئے بابا محکم دین کو آواز دیتی ہے۔

ناول میں محبت کرنے والی حسیناؤں کے کئی روپ، کئی نام اور کئی مقام ہیں۔ ہر ایک اپنی جگہ مکمل حیرت انگیز اور ہوش اڑانے والی۔ ہرنس کور کی آمد لال آندھی کی طرح ہے تو شانتی سکون اور ٹھہراؤ کا سمندر، ہرنام کور بھی ہے جو ماؤ میووال کی مورنی ہے۔ پھر ولایت سے آئی ہوئی میم صاب ہے، جو انگریزی فوج کے ہسپتال میں نرس ہے اور ناول کے ہیرو صدر سے آ ٹکراتی ہے۔

ناول کے تمام نسوانی کرداروں میں سب سے چنچل، انوکھی اور تیکھی کلکتہ کی ارمیلا ہے۔ صدر کے ساتھ اس کا ہیجان انگریز ٹرین کا سفر ہے۔ اس سفر میں جہاں مصنف نے جنسی نسوں میں خون دوڑایا ہے وہیں علم و حکمت کا انوکھا پرتو بھی دکھایا ہے۔ بگڑی قدروں کا ذکر کیا ہے۔ عورت اور مرد کا ایک ہی شے پہ الگ الگ موقف بیان کیا ہے۔ کیسے مرد خود کو معصوم اور عورت کو گناہ گار تصور کرتا ہے۔ یہی ارمیلا تاریخ کے اوراق پلٹ کے بگڑے ہوئے تصورات کو درست کرتی ہے اور حیران ہوتی ہے کہ تم لوگوں کو اتنا جھوٹ کس نے پڑھایا ہے۔

بنگال کی جادونگری کا حیران کن احوال ہے۔ جادو اور منتر کے عجیب احوال اس ناول میں بیان ہوئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کے پرانے زمانے کے جادوگروں کی قوت اور طاقت کا تجربہ ہوتا ہے۔

ناول کا ایک کردار سپاہی بن کے جنگ عظیم دوم میں کود پڑتا ہے، تو ناول نگار جنگ کے تمام تر اسباب، مضمرات جنگ کی اسٹریٹیجی اور وار فرنٹ کے ٹیکٹیکس انتہائی مہارت سے بیان کرتا ہے۔ بحری جہاز کا سفر ہے، جہاز ڈوب جاتا ہے۔ دوسرا بحری جہاز سنگاپور کی طرف روانہ ہے تو جہاز پر خبر آتی ہے انگریزوں کا پرنس آف ویلز ڈوب گیا ہے۔ انگریز افسروں کی آہ و بکا اور کھلے سمندر میں جہاز کا رخ موڑنا۔ اوپر جاپانی ہوائی جہازوں کی پرواز۔ پھر برما کے پہاڑی ساحلوں میں جنگ۔ جاپانیوں کی قید۔ اور ایک سپاہی کا فرار جس کے جسم پہ پہنی ہوئی ایک نیکر بھی نہیں رہتی۔ مہینوں تک

وہ ''نانگا'' برما کے جنگلوں میں دس لاکھ سال پہلے کے انسان کی زندگی جیتا ہے۔ جنگل کے جانور اس کے دوست اور ساتھی بن جاتے ہیں۔ وہ ایک پہاڑ کی کھوہ میں مٹی کے بستر میں رات کو سونے کے لیے گھس جاتا ہے اور ایک رات وہ غار بھی اس سے چھن جاتی ہے۔

برما کے جنگل میں ایک آدم خور اور اسی جنگل میں ایک بدھ بھکشو۔ جو اسے مہاتما بدھ کی تعلیمات سے آگاہی دیتا ہے۔ مہاتما بدھ کی ساری زندگی کی کتھا، اس کے دیے سبق اور عملی زندگی میں امن کا پیغام۔ پھر برما کی ایک دوشیزہ سے عشق، جس کے سانسوں میں ناریل کی مہک رچی بسی ہوتی ہے۔ جو ہندوستانی پردیسی کو کہتی ہے،

''تم کہیں نہ جاؤ، یہیں رہ جاؤ، جانا ہی ہے تو مجھے ساتھ لے جاؤ، میں لدھیانے کے مضاف میں تمہارے گاؤں کو ناریل کے پودوں سے بھر دوں گی۔''

یہ ناول ایک طلسم کدہ ہے۔

جسے قاری صرف پڑھنا شروع کر سکتا ہے، اسے پڑھتے ہوئے چھوڑ نہیں سکتا۔

ہندوستان کی سرزمین میں دمکتے ہوئے نگینوں، جیسے راجے مہاراجے، نظام، نواب اور راجکمار، رانیاں سب کا وہ احوال درج ہے، جو کسی نے کہیں نہ پڑھا ہوگا۔ یہی نہیں، یہ ناول دکھی، دکھیاری، ستائی قوم کے معصوم اور غریب لوگوں کو جگانے اور اپنا حق، ناحق طریقے سے غصب کرنے والوں سے واپس لینے کا جتن بھی کرتا ہے۔ یہ ناول ہر اداس اور ٹوٹے دل کے لیے مرہم ہے اور ہر اکڑی ہوئی تکبر سے تنی گردن کے لیے یہ ازلی پیغام کہ جھکنے میں عظمت ہے۔ یہ ہماری پرم پرا، ہماری کھوئی ہوئی قدروں کی بازیافت کی کہانی ہے۔ یہ انسان دوستی کا درس ہے۔ یہ انسان کی چالاکیوں اور مکاریوں کا سارا پول کھول دیتا ہے۔ مگر یہ بدلہ لینے کی بجائے معاف کرنے کو ترجیح دیتا

ہے۔ اس ناول میں امانت، دیانت اور غیر متعصب سچ اور انسان دوستی کی معراج کو تسلیم کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب لگتا ہے ہندوستان کے لیے ایک نیا شاستر ہے جو انسان دوستی کی شان میں لکھا گیا ہے۔

انگریزوں کی سال ہا سال کی لڑی جانے والی دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ساری دنیا میں جنگ کے شعلے سرد پڑ جاتے ہیں، تو انگریز ایک چال چلتا ہے۔ وہ جنگ جو ساری دنیا میں ختم ہوگئی ہوتی ہے، وہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں بھڑکا دیتا ہے۔ لوگ مذہب کے نام پہ بٹ جاتے ہیں۔ انگریز اس کی شروعات فوجی یونٹوں میں جنگ کے بعد کی جانی والی کھیلوں میں کھلاڑیوں کو مذہب کے نام پہ تقسیم کر کے، تقسیم کے جذبوں کو ہوا دیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہوا پورے متحدہ ہندوستان میں سرسرانے لگتی ہے۔ سارے ملک میں ''اتھل پتھل'' ہو جاتا ہے۔ پھر بٹوارا کے دن آتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بھی مصنف نے کمال مہارت اور غیر جانبداری سے رقم کی ہے۔ کہنے کو جب آگ اور خون کی آندھی چلی ہوتی ہے، ناول کا ہیرو ایک ''گملوں والی حویلی'' کی ساحرہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قدم قدم پہ یہ ناول کئی رنگ و روپ لے کر طلوع ہوتا ہے۔ آخر ''ٹرین ٹو پاکستان'' پہ چڑھ کے مصنف کے کردار اپنے نسل در نسل کے جنم استھان کو چھوڑ کر پاکستان چلے جاتے ہیں۔ مدتوں دروازہ بند رہتا ہے۔ مصنف اپنی محبوبہ سے کہتا ہے، اٹھو، دروازہ کھولو، میں مدت سے یونہی تو نہیں دستک دے رہا ہوں۔

سنو،

دروازہ کھولو۔

یہ ناول، حیران کن مشاہدات، تجربات اور احساسات سے بھرا ہوا، دنیا کا سب سے بڑا ادبی شاہکار ہے، جو دنیا کی ایک تہائی آبادی کی مشترکہ تہذیب، کلچر اور تمدن

کی انتہائی باریک بینی سے مکمل ادبی پیرائے میں کئی صدیوں کی سماجی تاریخ کو محفوظ کرتا ہے۔ اس ناول میں قدیم ہندوستان سے تقسیم ہندوستان تک کا ہر اہم پڑاؤ واقعہ ہمارے شہروں اور دیہات کے عام لوگوں کی رہن سہن سے بیان ہوا ہے، کہنے کو اس میں مہاتما بدھ، رامائن کے رام جی اور مہا بھارت کے شری کرشن جی کے احوال سے لے کر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے احوال اور ہندوستان سے وابستہ کوئی ڈیڑھ سو مشاہیر کا بھی تفصیلی پورٹریٹ ہے۔ مگر ہر واقعہ، ہر کردار، ہر جگہ، ناول کے پلاٹ میں پرویا ہوا۔

میں نے دنیا کے تمام کلاسیکل اور جدید ناولوں کے مطالعے کے بعد انتہائی ایمانداری سے محسوس کیا ہے کہ یہ وہ ناول ہے، جسے ہمارے ملک کی آنے والی نسلوں تک پہنچنا چاہیے، چونکہ صرف اس ناول میں ہمارا شاندار ماضی اس سے محفوظ کیا گیا ہے جو برصغیر کی کسی بھی زبان میں لکھی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ یہ ناول ہمارے صدیوں کے اتہاس کا انوکھا اور سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہی وہ اچھوتا ناول ہے، جو اپنی اشاعت کے اگلے دن سے سیدھا دنیا کے بہترین کلاسیکل ادب کا حصہ بن گیا ہے۔

''موضوعات کی رنگا رنگی، نہ بھولنے والے کردار، آرائش، تشبیہات، منظر کشی اور کمال جزیات نگاری۔ مہمات، معلومات، حسن، محبت، فلسفہ اور انسانی نفسیات، زندگی کا کونسا رنگ ہے جو ابدال بیلا نے نہ برتا ہو۔ انداز سیدھا دل میں اترنے والا، ترتیب انوکھی۔ ایک نہیں کئی زبانوں میں بات کی ہے۔ دنیائے ادب میں یہ ناول ایسے ہے جیسے تمام تر پرشکوہ عمارتوں کے بیچ دیکھنے کو تاج محل، محسوس کرنے کو محبوب کا گھر اور زیارت کے

لیے درگاہ اور مندر۔"

ایشیاء کے سب سے بڑے پبلشر افضال احمد، سنگ میل لاہور نے ناول کے اپنے پبلشر نوٹ میں یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس ناول کی اشاعت کے بعد اردو زبان نوبل پرائز سے اب مزید دور نہیں رہ سکتی، مگر اب تو ہندی بھاشا کے قالب میں ڈھل کے یہ ناول دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ لوگوں کی تہذیبی امن کہانی ہے۔ یہ اعجاز بذات خود دنیا کے کسی بھی بڑے انعام سے بڑا ہے۔ اس ناول کا ہندی زبان میں سنگ میل لاہور سے چھپنا بھی ایک نئے روشن کل کی خوشگوار شروعات ہے کیونکہ اس سے پہلے پاکستان سے کبھی ہندی زبان میں ایک صفحہ بھی نہ چھپا تھا اور اب ہندی زبان کا یہ ضخیم ترین ناول "دروازہ کھلتا ہے" دہلی، بمبئی سے نہیں بلکہ لاہور پاکستان سے چھپا ہے۔

متحدہ ہندوستان کی تہذیب سے پیار کرنے والوں نے اس پہ انگلینڈ میں ڈاکومینٹری بنانی بھی شروع کر دی ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب اس ناول پہ ایک نہیں کئی فلمیں اور قسط در قسط ٹیلی پلے بنیں گے۔ چونکہ لکھے ہوئے لفظوں میں یہی ناول وہ واحد دستاویز ہے، جو ہمیں ہمارے سماج کا گزرا ہوا کل اپنی پوری شان، شوکت سے دکھاتا ہے۔ اُردو اور ہندی پڑھنے اور سمجھنے والوں پہ لازم ہے کہ وہ اس کتاب کا ہر زبان میں ترجمہ کر کے اپنا سنہرا ماضی دنیا سے منوالیں، تاکہ پوری دنیا برصغیر پاک و ہند کے کھوئے ہوئے سحر کو پھر سے بازیاب کر سکے جو اس ناول کا نصب العین ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر

پیش لفظ

۲۰۱۴ء

یہ شخصیت نگاری کی کتاب ہے۔

انگریزی میں اسے سکیچ رائٹنگ کہتے ہیں۔

سکیچ لکھنے سے بہت پہلے میں پنسل سے کاغذ پہ سکیچ بنایا کرتا تھا۔

مجھے علم ہے کوئی چہرہ بناتے سے، کونسی لکیر مدھم رکھنی ہے، کون سی شوخ تا کہ جس کا سکیچ بنایا جا رہا ہے، دیکھنے والے کو اسی کا لگے۔ یہ فوٹو گرافی نہیں ہے کہ من و عن وہی رنگ و روپ اور وہی نین نقشہ بنایا جائے۔ کیمرے کی آنکھ سے بنائی تصویروں میں بھی رُخ کے بدلنے سے رُخِ زیبا بدل جاتا ہے۔ میں نے صرف سٹل سکیچ ہی نہیں لکھے، ان شخصیات کی چلتی پھرتی سانس لیتی کہتی سنتی تصویروں کو جوڑ کے لفظی ویڈیو بھی بنائی ہیں۔ کونسا منظر ریکارڈ کرتا تھا، کونسا نہیں، یہ فیصلہ کرنے پہ میرے قلم کو اختیار تھا، میں نے اپنے قلم کے کسی اختیار کو سلب نہیں کیا۔

میں دوسروں کے لیے وہی پسند کرتا ہوں، جو اپنے لیے مجھے پسند ہے۔

کسے پسند ہے کہ کوئی اس کے چہرے کے خدوخال کو کسی بگڑے ہوئے رُخ سے دیکھ کے دیکھائے۔ سو میں نے خدا کے بنائے ان شاہکار لوگوں کے صرف اُجلے پہلو دکھائے ہیں۔ میلا پن دکھانے کے لیے ابھی مجھ میں میری اپنی کثافت ہی بہت ہے۔

ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی دنیا میں رہتے ہوئے، کردار نگاری ساری شخصیت کی ہی لفظی تعمیر ہے۔ یہی معصوم چڑیوں کے گھونسلے، جھونپڑیاں، عمارتیں، قلعے اور تاج محل ہر کہانی کا جھومر ہوتے ہیں۔ افسانوں میں ان گھروں کے محلے ہیں تو ناول میں ان سے شہر کے شہر آباد کرنے پڑتے ہیں۔ ''دروازہ کھلتا ہے'' ناول میں تو کرداروں کی کہکشاں میں کوئی سوا تین سو تارے ٹانک چکا ہوں۔ بہت لوگوں نے مجھ پہ بھی خاکے لکھے، ان میں سے کچھ میں نے اس کتاب میں بھی شامل کر دیے۔

اس کتاب میں شامل شخصیات کی امتیازی وجہ میرا ان سے قلبی قریبی تعلق ہے۔ یہ فہرست طویل ہے۔ کچھ ابھی ''کبوتر با کبوتر'' میں ہیں، باقی ''باز با باز'' میں سہی۔ اگر مہلت رہی۔

ابدال بیلا

12-ڈاکٹرز ٹاؤن، پی ڈبلیو ڈی روڈ، او-9، اسلام آباد

E-mail: abdaalbela@yahoo.com

بہتا دریا...... بابا عرفان الحق

شہر کے ایک نفیس اُجلے علاقے میں بینک اسکوائر چوک میں بنے ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں روز شام کو دو چار علم دوست، دوستوں کی منڈلی لگا کے عرفان صاحب بیٹھ جاتے اور اپنے علمی ادبی گھرانے سے ملی میراث لوگوں میں بانٹتے رہتے۔ لوگ انہیں ایک مدبر، پڑھا لکھا، دانش ور بینک آفیسر سمجھتے تھے۔ اس وقت تک لوگوں کو علم نہیں تھا کہ بینک افسر کے لبادے میں ایک مہان درویش چھپا ہوا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی اندر کی کوئی کھڑکی کھولی نہ باہر سے کسی نے دستک دی۔ مگر اس روز انہونی ہونا تھی اور ایک ایسی آندھی کو آنا تھا کہ سب دیکھ لیتے کہ، دروازہ کھلتا ہے۔

ہوٹل کی کھڑکی سے باہر ان کے سڑک پار بینک کے نیلے شیشوں سے سجی عمارت نظر آیا کرتی۔ اسی بینک کے وہ مینیجر تھے۔ بینک بند ہوتا تو وہ اس ریسٹورنٹ میں علم و گیان کا اکاؤنٹ کھول کے بیٹھ جاتے۔ شہر میں جو بھی صاحب علم آتا، ادھر حاضری دیتا۔ ایک دن، ایک معروف پامسٹ سیف الدین حسام ادھر آ گیا۔ چائے کی پیالی

پکڑے، وہ اپنے علم کے نشے میں اپنے تجربے کی چسکیاں لینے لگا۔ کس کس کا ہاتھ دیکھا، کس کو کیا بتایا۔ جو بھی بتایا سچ نکلا۔ بولا بہت سے مشاہیر کے ہاتھ بھی دیکھے اور جو دیکھا وہ پھر زمانے بھر نے دیکھا۔ بہتیرے نام اس نے گنوا دیے۔ مولانا مودودی کا ہاتھ دیکھا، ذوالفقار علی بھٹو کی ہتھیلی دیکھی، امام خمینی کے ہاتھ کی سعادت بھی ملی۔ یہ دو دوست چائے کی بھاپ بھری پیالیوں اور سگریٹ دھوئیں کے مرغولے میں مگن دل جمعی سے باتوں میں لگے تھے۔ انہیں احساس نہ ہوا کہ ان کے برابر کی میز پہ بیٹھا کوئی شخص شدید تجسس سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر وہ اجنبی اضطراری کیفیت میں اپنی میز سے اٹھا اور ایک دم سے انکے میز کی کرسی کھینچ کے آ بیٹھا۔ بولا، سرکار میں نے ساری باتیں سن لیں۔ آپ اتنی شکتی والے بندے ہیں، جو ہونا ہوتا، ہاتھ دیکھ کے بتا دیتے ہیں۔ مجھے بھی ایک بات پوچھنی ہے۔ اس نے اپنی ہتھیلی قمیض سے رگڑ کے صاف کی اور ہاتھ کھول کے عرفان کے ساتھ بیٹھے پامسٹ سیف الدین حسام کے آگے کر دی۔

سیف الدین حسام ترنگ میں بیٹھا تھا، بولا، بول کیا پوچھنا ہے؟

اجنبی بولا، میرا ایک کزن مجھے بہت پیارا تھا۔ اکیس سال سے وہ لاپتہ ہے۔

خدا جانے زندہ ہے، مردہ ہے، کہاں ہے؟

اس کا پوچھنا ہے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کے حسام کے سامنے رکھ دیے۔

حسام نے اس کی بات سن کے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ بولا، اللہ کے بندے میں ہاتھ دیکھنے والے کا مستقبل بتاتا ہوں، تیرا ہاتھ دیکھ کے تیرے اکیس سال پہلے گم ہوئے کزن کا کیسے بولوں، تمہاری عقل کدھر ہے۔

ہے کوئی دنیا میں ایسا تیس مار خان جو تجھے دیکھ کے تیرے رشتے داروں کا برسوں پرانا بھید بتائے؟

بول؟

میرا چیلنج ہے۔

اجنبی نے جھینپ کے اپنی کھلی ہتھلیاں بددلی سے ہولے ہولے بند کرنا شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پہ امید کی ایک کرن جو چند لمحے پہلے چمکی تھی اس کی بتی بجھ گئی۔ وہ شرمندگی اور بے بسی سے ادھر اُدھر گردن گھماتے ہوئے، عرفان الحق سے آنکھ ملا بیٹھا۔

یہاں کہیں عرفان صاحب کی آنکھ میں جہاں بھر کو اپنی آنکھ سے دیکھنے والی ہستی نے اس کی بے بسی دیکھی اور مسکرا دیا۔

شاید پامسٹ کے چیلنج کے جواب کا وقت آ گیا یا اس سادہ دل سوالی کے سوال پہ خدا کو ترس۔

سوالی بدحواسی میں زیرلبی بڑبڑایا، تو، تو کوئی بھی ایسا نہیں جو یہ بتا سکے؟

عرفان صاحب کے ظہور عرفان کا منتظر لمحہ اُتر آیا۔

زندگی بھر جنہوں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا، کوئی پیشین گوئی نہ کی تھی۔ پتہ نہیں، بیٹھے بیٹھائے ان کے اندر کیا بھونچال آیا، ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی میز پہ رکھی اور اجنبی سوالی کو مخاطب کر کے بولے،

تیرے سوال کا جواب میں دیتا ہوں۔

سوالی کے چہرے پہ حیرت کی روشنی کا ہیولہ ابھرا۔

ساتھ بیٹھا پامسٹ بھی تعجب سے انکی طرف مڑا۔

عرفان صاحب نے اجنبی سوالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات شروع کی۔ بولے، پہلی بات یہ کہ تیرا کزن زندہ ہے۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ اپنی مرضی سے وہ گیا تھا۔ اس وقت وہ فلاں شہر کی فلاں تحصیل کے فلاں گاؤں کی بڑی گلی

کی نکر پہ بنی کریانے کی دکان چلاتا ہے۔ اُسی گاؤں میں اس کی بیوی اور بچے ہیں۔ جا جا کے مل آ۔

سوالی کے ساتھ حسام بھی کرسی سے دو انچ اوپر اٹھ گیا۔

اتنا مفصل جواب، اس قدر باریک بینی سے

اکیس سال سے گم ہوئے بندے کا سارا احوال

دونوں کی آنکھوں کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں، ہونٹ گنگ ہو گئے۔ اجنبی سوالی کے چہرے پہ اطمینان کا ایک ریلا آیا، پھر شک کی دراڑیں پڑ گئیں۔ وسوسوں نے سر اٹھایا اور وہ ہولے سے بولا،

اگر یہ سچ نہ ہوا تو؟

عرفان صاحب کے چہرے پہ کسی اور کا چہرہ تھا۔

تیقن اور جلال سے بھرا

انہوں نے ہوٹل کی کھڑکی کا پردہ ہاتھ سے سرکایا، بولے وہ سامنے نیلے شیشوں والا بینک دیکھتے ہو۔

سوالی نے گردن لمبی کر کے وہ بجی بلڈنگ دیکھی اور بولا، جی۔

میں اس بینک کا منیجر ہوں۔ اگر میری بات غلط ہوئی تو آ کے اس بینک کے سارے شیشے توڑ دینا۔ وہ جرم تیرا نہیں میرا ہوگا

عرفان صاحب نے اپنی نوکری اور اپنا بینک داؤ پہ لگا دیا۔

یہ حسام گواہ ہے۔

وہ بندہ عجیب تذبذب میں یقین اور بے یقینی آنکھوں میں لیے کچھ دیر تک عرفان صاحب کو خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر ایک دم سلام کر کے چلا گیا۔ حسام سر پکڑ کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کتنے ہزار کا نقصان ہوگا اگر اس بندے نے سارے شیشے توڑ

دیے۔ حسام جو چند لمحے پہلے، پامسٹری کے اپنے علم سے عرفان صاحب کو مرعوب کرنے کے لیے ڈینگیں مار رہا تھا، عرفان صاحب کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی اجنبی بیٹھا ہوا۔ جو کسی اور سیارے سے ابھی اترا ہو۔ انسان نہ ہو، کوئی غیر انسانی مخلوق ہو۔ اس کی عقل یہی سمجھی بیٹھی تھی کہ چند دن بعد وہ اجنبی ہاتھ میں پتھر اور لاٹھی لے کے آئے گا اور ان کے بینک کے سارے شیشے توڑ کے پورا بینک ننگا کردے گا۔ عرفان صاحب کے اپنے بینک کے ذاتی اکاؤنٹ میں تو مہینے کی تنخواہ کے علاوہ پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی، ٹوٹے شیشوں کا سارا بل اسکے کھاتے پڑ جائے گا، گواہ جو ٹھہرا۔

ہوا الٹ، پانچویں دن وہ آدمی چار لوگوں کے سروں پہ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لے کر بینک کی چوکھٹ پہ ایسے کھڑا تھا جیسے وہ دہلیز بینک کی نہ ہو کسی درگاہ کی ہو۔ اندر آ کے عرفان صاحب کے پیروں کو چھو کے بولا،

سرکار، آپ عرفان الحق نہیں، عین الحق ہیں، جو کہا وہی جا دیکھا

شہر میں چے مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

یہ بینک منیجر، گولڈ لیف کے کش لگانے والا، ایک پروفیشنل بینک آفیسر کون سے الوہی سٹیٹ بینک کا ایجنٹ ہے جو اکیس سال پہلے گم ہوئے بندے کے رشتے دار کا چہرہ دیکھ کے گمشدہ بندے کا پورا اتا پتا بتا دیتا ہے۔

لوگوں کے ذہنوں میں فیوز اڑ گئے۔

ان کی عقل کی انڈیکیٹر بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔

ان کی منڈلی بڑھ گئی۔

سوالی بھی بڑے بڑے سوال لے کے آنے لگے۔

ایک دن کسی کروڑ پتی نے کروڑوں کے کسی متوقع نفع کو سوچ کے کوئی سوال کر دیا۔ پھر ایک شام جیب میں ایک لاکھ روپے ڈال کے ان کی محفل میں آ بیٹھا۔

بولا، سرکار مجھے تو امید نہ تھی آپ کی دعا کام کر گئی۔ یہ میری طرف سے حقیر ہدیہ ہے۔
اس نے دونوں ہاتھوں کو کھول کے اندر رکھی نوٹوں کی گڈی عرفان صاحب کی طرف
بڑھا دی۔ عرفان صاحب تو تھے ہی نوٹوں میں کھیلنے والے بینکر، پیسے لے کر پیسے والوں
کے ہی اکاؤنٹ میں رکھتے تھے۔ ایک دم پیچھے ہٹ گئے اور سٹ پٹا کے بولے، آپ
کے پیسوں سے میرا کیا تعلق؟

وہ بندہ عقیدت میں گڑ گڑاتا گیا۔ یہ ٹس سے مس نہ ہوں۔ اس نے پاس بیٹھے
عرفان صاحب کے دوستوں سے کھسر پھسر شروع کر دی۔ ان میں سے ایک نے اسے
کہا، آپ میرے ساتھ آئیں۔ اس بندے کو لے کے اپنے گھر گیا، اندر سے اس نے
بھی ایک لاکھ روپیہ نکالا اور اس کے روپوں کی گڈی کے ساتھ لفافے میں ڈالا، اور
بولا، آؤ، ایک اور جگہ چلیں۔ دونوں عرفان صاحب کے ایک تیسرے عقیدت مند کے
پاس جا پہنچے۔ تیسرا عقیدت مند راجہ افضال تھا۔ جہلم شہر کے مضاف میں ڈگری کالج
کے برابر اس کی وسیع اراضی تھی۔ کھیت تھے، کھلیان تھے۔ ساری بات سن کے وہ بولا،
میرے پاس نقد تو کچھ نہیں زمین کافی ہے۔ ایسا کرتے ہیں اس زمین پہ سڑک
کنارے دو تین کنال جگہ پہ ایک ڈیرہ بناتے ہیں۔ بابا عرفان سے شام سے ہوٹل میں
آ کے سوالی جمگھٹا لگاتے ہیں۔ انہیں ہم ادھر بٹھا کے لوگوں کے لیے آسانی کریں
گے۔ انہوں نے آپس میں ساز باز کر لی۔ سستا زمانہ تھا، ڈیرہ بنانے کا سارا معاملہ
طے ہو گیا۔ پھر عرفان الحق سے اجازت مانگنے پہنچے۔ عرفان صاحب بولے، تم لوگوں
کی جگہ، تم لوگوں کے پیسے، جو مرضی آئے کرو، مگر یاد رکھو، میرا اس جگہ یا ڈیرے سے
کوئی تعلق ہے، نہ ہوگا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے بولے، سرکار آپ شام کو جتنی دیر ہوٹل میں
بیٹھ کے لوگوں کے سوال سنتے ہیں، اتنی دیر ادھر آ جایا کیجئے گا۔ عرفان صاحب نے کہا،
ٹھیک ہے لیکن ایک مہمان، ایک مسافر اور ایک دوست کی طرح صرف۔ یاد رکھنا،

ڈیرے کی ایک انچ جگہ اور ایک اینٹ روڑے پہ بھی میرا کوئی حق نہیں ہوگا۔

ڈیرہ بن گیا۔

یہ ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔

شہر کے ڈگری کالج کے برابر سڑک پہ ان دنوں کوئی آبادی نہ تھی۔ لوگ آنے لگے۔ ڈیرے سے کوئی ڈیڑھ کلومیٹر دور عرفان صاحب کا اپنا گھر ہے، پانچ مرلے کا۔ جتنا اس زمانے میں تھا اتنا ہی اب ہے۔ بینک سے ریٹائر ہوئے تو بلا معاوضہ اس ڈیرے کی نوکری پہ آ بیٹھے۔ جمعہ اور منگل کے علاوہ ہر روز شام تین بجے سے رات نو بجے تک کی نوکری۔ لوگ بڑھتے گئے۔ ڈیرے میں بھی وسعت آتی گئی۔

سوال یہ ہے، لوگ کیا سوال لے کے آتے ہیں؟

کیا جواب ملتا ہے!

مجھے بڑا تجسس تھا۔

ایک دن خود ہی بولے، میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔

میں بیٹھنا شروع ہو گیا۔

سوالی مجھے دیکھ کے ہچکچانے لگتا، تو کہتے اپنا ہی بندہ ہے، آپ بے دھڑک بولیں۔

وہ بولنے لگے۔

کسی کی شادی نہیں ہو رہی، کسی کی ہوئی ہے مگر جان پہ آ گئی ہے۔ کوئی ساس سے تنگ، کسی نے ساس کو پریشان کیا ہوا ہے۔ کوئی دوبئی جانے کے لیے بے تاب، کسی کو کویت سے ادھر بلوانے کی عرضی۔ کوئی جگر کی بیماری میں مبتلا پیلی آنکھوں والا، کسی کی لال آنکھوں میں خون کا ابلتا فشار۔ کوئی جوڑوں کے درد سے ٹیڑھا ہوا، کسی کی گردن میں پڑا سریا اسے جھکنے نہیں دیتا۔ غصے پہ کسی کو قابو نہیں، کوئی سارا کاروبار، یاری دوستی میں اڑا گیا، نوکری کے لیے کوئی مارا مارا آتا، کسی کو ساتویں کارخانے کی

بنیادیں رکھنے کی جلدی، کوئی کروڑوں کا مالک مگر نیند کا محتاج۔ کسی کی بڑے بڑے صدموں سے آنکھیں پلٹی ہوئی، کوئی مدہوش آنکھیں لیے خوشیوں کا متلاشی۔

عرفان صاحب کے ساتھ بیٹھ کے مجھے دنیا کے دکھوں کی سمجھ آنے لگی۔ وہ جو ظاہری شان وشوکت اور کھڑکتی ٹین بھرے چہرے سجائے دنیا بھر میں اکڑتے پھرتے، ان کے سامنے آ کے پھٹی بوری کی طرح ڈھیر ہو جاتے، ریزہ ریزہ ہو جاتے، کسی کو اولاد کے نہ ہونے کا غم اور کوئی اولاد کی گستاخیوں سے دکھی۔ کاروبار میں نقصان کا کوئی واویلا کرتا، کوئی سونا چاندی پہن کے بلبلاتا کہ جسم میں کینسر پل رہا ہے۔

اب ان سب سوالوں کے جواب میں عرفان صاحب کیا کرتے۔

کسی نے کہا، بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، بولے، تین اخروٹ روزانہ اور ساتھ یہ ورد۔

ایک بولا، کینسر ہے۔ بولے، مہندی کا پاؤڈر ایک چمچہ صبح ایک شام، ساتھ یہ قرانی آیت۔

پیٹ پکڑ کے کوئی آتا، کہتے، پودینے کی چٹنی، مرچ کے بغیر اور ساتھ یہ پڑھنا۔

ذہنی اور نفسیاتی مسائل پہ بھی اسی طرح کے سیدھے سادھے ٹوٹکے۔

لوگ آ آ کے کہتے، سرکار آپ کی دعا سے اب بیٹا نافرمانی نہیں کرتا۔ کوئی آ کے ہاتھ چومنے کو بڑھتا، یہ ہاتھ کھینچ لیتے، وہ کہتا جناب نوکری مل گئی۔ کوئی ساس کہتی، بابا جی، بہواب بدتمیزی نہیں کرتی۔ کوئی بہو آ کے مسکرانے لگتی، بابا جی، آپ کی دعا سے ساس تو ماں بن گئی۔

میرا اُن کے ساتھ بیٹھنے کا تجربہ حیران کن تھا۔

ان کا کہا علاج بھی سنتا۔

علاج کے بعد لوگوں سے فیڈ بیک بھی۔

میرے اندر ہل چل مچ گئی۔

میں جدید علوم کا پڑھا لکھا، ایم بی بی ایس ڈاکٹر، تیس کتابوں کا مصنف، دنیا کا اکثر علم پڑھا، پوری دنیا گھومی۔ میرا سر چکرا گیا۔ یہ بابا کیا جادوگر ہے۔ کون اسے پڑھاتا ہے۔

کون اسے بتاتا ہے، لوگ کیا سارے پاگل ہیں۔ صبح دس بجے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تین بجے قطار ہلتی ہے۔ عقل کیسے مانے۔ وہ بھی ایک ایسے بندے کی جسے اپنی عقل پہ ناز ہو۔

میں نے سوچ لیا، بابا کے بھید کھولوں گا۔

جب یہ کرسی پہ بیٹھتے، سائلوں کی باتیں سنتے، تو بات چیت کی گنجائش نہ رہتی۔ اکیلے ہوتے تو میں جان نہ چھوڑتا۔ سوال پہ سوال۔

ایک دن پوچھ لیا، سرکار یہ جو آپ پھل پھول سبزیوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج تجویز کرتے ہیں، کیا حکمت پڑھی ہے؟

بولے، توبہ کر، میری سات پشتوں میں کوئی حکیم نہیں ہوا۔

پھر آپ کیسے فرفر بول دیتے ہیں، یہ کھاؤ یہ نہ کھاؤ۔

کہتے، جو لکھا نظر آتا، وہ بول دیتا۔

آپ کو لکھا لکھایا نظر آتا ہے؟

کبھی آتا ہے، کبھی اس کا خیال دل میں

آپ مریض دیکھ کے مرض کی تشخیص بھی کرتے ہیں، کبھی ڈاکٹری پڑھی؟

بولے، ڈاکٹر تو تم ہو، کوئی غلط تشخیص دیکھی تو کہو۔

یہی تو حیرانی ہے، تشخیص بھی سولہ آنے صحیح، یہ بتاتا کون ہے؟

بولے،

وہی، کبھی لکھا نظر آیا، کبھی دل میں اترا۔

میں سوچنے لگا

یہ تو انٹرنیٹ پہ بیٹھے ہیں

جیسے گوگل کھول کے کوئی سوال لکھے، نیچے جواب آتا ہے۔ یہ تو ہم کمزور انسانوں کے بنائے عجوبے ہیں۔ بابا عرفان، خدا جانے کونسی ویب سائٹ کھول کے بیٹھے ہوتے ہیں۔

پوچھا، کیا کوئی اسم اعظم ہے، آپ کے پاس؟

بولے، تمہیں پوچھ کے کیا لینا؟

تجسس ہے۔

بولے، اسم اعظم، ہر ایک کے لیے الگ۔

آپ کے لیے؟

شاید ہو۔

کیا؟

پرانی بات ہے، بچپن میں کوٹ مومن کے مروڑ والا کے رہنے والے صوفی ابراہیم نے ایک ورد بتایا تھا۔

کیا تھا؟

اَللّٰہُ الصَّمَد

پوری کہانی کہیں، سرکار۔

میں چھوڑنے والا تھوڑی ہوں۔

بولے، دیکھ، میں نے ساری عمر بینک کی نوکری کی ہے، تیرہ بینک برانچوں کا منیجر رہا۔ بینک کی دنیا میں کامیاب منیجر سمجھا گیا۔ سب کامن سنس کے اصول اپنائے۔ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے دفتر جانا۔ ذاتی کام، اخبار پڑھنا سب بینک کے اوقات

سے پہلے یا بعد۔ روز کا کام روز۔ اگلے دن پہ کبھی نہ ٹالا۔ جو خط آیا، ساتھ ہی جواب لکھ دیا۔ بینک کے جتنے کلائنٹ ہوتے ان کی فہرست میز پہ۔ روز ان میں سے دس بارہ کو فون کر کے حال احوال معلوم کرتا۔ ان کی خوشی غمی میں شامل ہوتا۔ کوئی دعوت نامہ آیا، گیا تو ٹھیک نہ گیا تو شکریہ کا خط۔

سرکار، بات کا رخ نہ موڑیں

کیوں؟

یہ تو سب وہ چیزیں ہیں جن کے دم سے آج مغرب مشرق سے کئی صدیاں آگے ہے۔

ہے نا؟

ہے۔

مگر سرکار، میں وہ سوال پوچھ رہا ہوں جن کی وجہ سے آپ جیسے مشرقی بابوں نے مغرب کو کئی صدیاں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

کیا مطلب؟

یہ جو آپ بیماروں، بے چاروں، دکھیوں کے دکھ سن کے بغیر مہنگی انوسٹی گیشن کی ٹکنگی پہ باندھے سیدھے سادھے اور سستے طریقے سے شفا دیتے ہیں، انہیں ان کے دکھوں سے نکال لاتے ہیں، یہ کیسے؟

بولے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں، یہ اس کا کام ہے۔

کیسے؟ سوالی تو آپ کے پاس آتا ہے۔

بولے، جسے اللہ نے شفا کے لیے چن لیا ہو انہیں شاید میری طرف بھیج دیتا ہے۔ میرا کوئی چمتکار نہیں۔ وہ سارے رستے خود دکھاتا ہے۔ بیماری اور الجھن ختم ہو گئی پھر بھی اس کے اندر اس کا ذکر نہیں مرتا۔ ملا رخ نہیں ٹلتا۔ یہ تو اس کا کھیل ہے۔ جسے وہ

اپنانا چاہتا ہے، اسے کسی مٹے فنا ہوئے مجھ سے فقیر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اور اپنا لیتا ہے۔ یہ سب اس کا کرتب ہے۔ میں تو ڈھکوسلا ہوں۔

مگر سرکار، یہ ڈھکوسلا ملا کیسے؟

بولے، تم جان نہیں چھوڑو گے۔

نہ جی۔

تو سنو

گھر میں ہم سات بہن بھائی تھے۔ چار بھائی، تین بہنیں۔ میں سب سے بڑا۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۶ء کو نجیب آباد، بجنور، یو۔ پی میں پیدا ہوا۔ دادا تمہاری طرح ادیب آدمی تھے۔ دو ناول بھی انہوں نے لکھے۔ خان بہادر کا خطاب ملا۔ حویلی انہوں نے بنائی۔ گھر میں کتابیں رکھیں۔ انوارالحق نام تھا ان کا۔ پاکستان بنا، سارا کنبہ ادھر رہا، جدھر حویلی تھی، مگر میرے ابا احسان الحق حویلی چھوڑ کے ہمیں ادھر لے آئے۔ ادھر جہلم میں ٹھہر گئے۔ فوج کے ٹھیکہ دار تھے۔ علم و گیان سے دلچسپی تھی۔ شام کو گھر میں علم کے متلاشی بوند بوند علم لینے پہنچ جاتے۔ مگر ابا کو اللہ نے عمر زیادہ نہ دی۔ میں اٹھارہ سال کا ہوا تو وہ فوت ہو گئے۔ گھر میں سات بہن بھائیوں کا میں اکیلا کفیل رہ گیا۔ تعلیم بھی ادھوری تھی۔ کام شروع کیا۔ جو کماتا، لا کے ماں کو دیتا۔ ماں محبت میں میری پیالی میں گھی زیادہ ڈالنے کی کوشش کرتی۔ میں یوں کرتا جب تک سب بہن بھائی کھانا نہ لیتے لقمہ نہ توڑتا۔ بس اس احساس ذمہ داری نے مجھے وقت سے پہلے وقت کی عقل دے دی۔ میں سامنے پڑے پھل، ہانڈی میں پڑی بوٹیاں اور دستر خوان پہ پڑی چیزیں گن کے طے کر لیتا کہ میرا کھانے کے لیے نمبر آخری ہے۔ میں نے پہلا سبق یہ سیکھا کہ اپنے حق سے کم لینا ہے۔ پھر ماں تو ہر وقت خدمت میں لگی رہتی تھی مگر مجھے اس وقت تک ماں کی خدمت کرنا نہ آئی تھی۔ ایک رات بھائی نے مجھے جھنجوڑ کے جگایا کہ ماں

ساتھ لیٹی درد سے کراہ رہی ہے، تم سو رہے ہو۔ میں اٹھا، ماں کے لیے دوا دارو کیا۔ ماں تو اللہ نے ٹھیک کر دی، لیکن باقی کی ساری عمر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ ماں نے چھینک ماری ہو اور میں پاس نہ کھڑا ہوں۔ شاید ماں کی کوئی دعا کام دے گئی۔

اور؟

اور کیا ہونا تھا، والد کی وفات کے بعد رشتے دار انڈیا سے کیسے ادھر پرسا دینے آتے۔ ماں اور بہن بھائی غم سانجھا کرنے کے لیے انڈیا چلے گئے۔ میں پیچھے گھر میں اکیلا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر۔ سردیوں کے دن، یتیم اور بے آسرا۔ لحاف میں لیٹا روتا رہتا۔ مجھے عبادت کرنا نہ آتی تھی۔ رونا آتا تھا۔ دن کو باپ کی قبر پہ جا کے روتا، رات کو لحاف میں منہ دے کے روتا۔ بس جو بات لبوں سے نہ ہو سکی شاید آنسوؤں نے کر دی۔ ایک رات کیا ہوا، جاگ رہا تھا، کمرے میں اچانک تیز روشنی ہو گئی۔ جیسے کوئی بڑا سا جلتا ہنڈا اٹھا کے آ گیا اور بولا، سیدھے ہو کے بیٹھ جاؤ، سرکار تشریف لاتے ہیں۔

میں اٹھ کے بیٹھ گیا، بیٹھا کھڑا ہو گیا۔

کن کی آمد تھی؟

حضرت غوث پاکؒ تشریف لائے تھے۔

کچھ کہا سرکار نے؟

باتیں تو کئی کیں، مگر ایک خوش خبری عجیب تھی۔

کیا؟

سرکار غوث پاکؒ نے فرمایا، ایک وقت آئے گا، جب ایک زمانہ تم سے سیراب ہو گا۔

تو وہ آپ کو دریا بنا گئے۔

یار، میں کچھ نہیں بنا، مجھے نہ بناؤ، بگاڑ دو۔

پوچھا، سرکار یہ مریضوں کے علاج کا علم بھی انہیں سے عطا ہوا۔

بولے، یہ سرکار بابا فریدؒ کی عطا ہے۔
سوال کیا، آپ جو اکثر کھڑی شریف جایا کرتے تھے، ادھر سے کیا لائے؟
بولے، کبھی کسی سوال کے جواب میں تاخیر ہو جاتی تو ادھر حاضری دیتا۔ سوال کا جواب آناً فاناً آتا۔
صابر پیاؒ سے کیا لائے؟
صبر۔
اور جلال بھی؟
بولے، جلال میرے آقا غوث پاکؒ نے جمال کر دیا۔ جلال اور جمال دونوں کا فہم دے دیا۔
اور کدھر کدھر جاتے رہے؟
ہر جگہ گیا۔
علی ہجویریؒ سے علم لیا، اقبالؒ کی پراندی بیٹھا۔ میاں میرؒ سے خصوصی تعلق رہا۔ دہلی کے قطب صاحبؒ اور نظام الدین اولیاءؒ کے ہاں بھی حاضر ہوتا رہا۔ سب دیالو بابے ہیں، خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔
ادھر محفل میں ایک عقلی آدمی بیٹھا تھا۔
عقلی آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کو ملکہ برطانیہ سمجھتا ہے۔
وہ ملکہ جو کبھی پوری دنیا پہ راج کیا کرتی تھی۔ وہ کیسے گیان وجدان اور عرفان کی ریاستوں کو توجہ دے۔ وہ سمجھتا ہے اس کی جیب میں کھرے ملکہ کی تصویر والے عقلی پاؤنڈ ہیں۔ امریکی کھڑکتے ڈالر ہیں۔ خالص مہکتے سعودی ریال ہیں۔ وہ دل اور احترام کی باتوں کو ریزگاری سمجھ کے ہاتھ نہیں لگاتا۔ تھوڑی دیر تک وہ عقلی آدمی عرفان صاحب کو تشکیک سے تکتا رہا پھر بولا،

عرفان صاحب، جو بزرگ پردہ فرما گئے، دنیا سے چلے گئے، چلے گئے۔ اُن کا تصرف ادھر کدھر باقی؟

عرفان صاحب کے چہرے پہ صابر پیاؒ کا چہرہ آ گیا۔

بولے،

ایک واقعہ سن لو۔ پہلے جا کے تصدیق کرنا، پھر آ کے بات۔ اسی شہر کا فلاں بندہ ہے، فلاں محلہ ہے، اس کا بیٹا ادھر جہلم میں ڈوب گیا۔ وہ مارا مارا پھرے۔ کہے بیٹا تو ڈوب گیا، اس کی لاش ہی مل جائے۔ میرے پاس آیا۔ میں نے کاغذ پہ کچھ لکھ کے اسے دیا کہ دریا میں ڈال دو۔

وہ کاغذ دریا میں ڈال آیا۔

بچہ پھر بھی نہ ملا۔

آپ نے کاغذ پہ لکھا کیا تھا؟

وہ میری طرف دیکھ کے کچھ ہچکچائے پھر بولے، ایک فقرہ لکھا تھا۔

''جہلم دریا اس بندے کا بیٹا واپس کر دو''۔

دریا نے پھر بات مانی؟

نہیں، مگر مجھے بچہ دکھا دیا۔ دیکھا کہ بچہ دریا کی تہہ میں اُگی جھاڑیوں میں الجھا ہوا ہے اور اس کے گلے میں پہنی مالا کا کنٹھا ایک ٹہنی میں پھنسا ہے۔ اس وقت ایک اشارہ بھی مل گیا کہ فلاں بزرگ کے مزار پہ جاؤ۔ گیا۔ کہا حضور، اس بچے کی لاش دریا سے لینی ہے۔ اس کے گلے کا ہار جھاڑیوں سے نکال دیں۔

اگلے دن لاش دریا کی سطح پہ تھی۔

بولے، دیکھ، تصرف اور طاقت پہ صرف خدا کی بادشاہی ہے۔ جسے چاہے جتنا مرضی حصہ دے دے۔

اس کے سامنے ہم جیسے زندہ ویسے مرے۔

ادھر دونوں حیثیتوں میں موجود۔

ہماری روحیں، زندہ ہوں یا مرے ہوں، دست بستہ اس کے ہر حکم کی پابند۔

یہ تو ہم لوگوں نے اپنے جسموں میں مغالطے پالے ہوئے ہیں۔

موج کریں، مانیں نہ مانیں۔

میرا مقصد کسی کو منوانا نہیں۔ میں تو اس تھوڑی سی خدمت کے لیے ہوں، جس کی اجازت ملی ہوئی ہے۔

عرفان صاحب کے ساتھ برسوں کی دوستی ہے، پہلی ملاقات پہ بھی انہوں نے کسی خاتون سے کہہ کے مجھے بلوایا تھا۔ رفتہ رفتہ محبت بڑھتی گئی۔ اب کچھ دن ان سے ملاقات نہ ہو تو ایک نشئی کی طرح جسم میں نشہ ٹوٹنے کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ کئی دکھ اور وسوسے تو انہیں دیکھ کے دور ہو جاتے ہیں۔ درمیانہ قد، قدرے بھاری جسم، چہرے پہ سفید گھنی داڑھی میں کچھ کالے سیاہ بال، آنکھوں میں بچوں جیسی معصوم چمک اور ٹھہر ٹھہر کے دھیمی آواز میں بولنے کا انداز۔

اشفاق احمد صاحب اپنی زندگی کے آخری دنوں میں لاہور سے جہلم خاص طور پہ بابا عرفان الحق سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وہ اشفاق احمد جن سے بہتر علمی اور دانش بھری گفتگو کرنے والا آدمی پچھلے سو سال میں پیدا نہیں ہوا وہ چپ چاپ ٹکٹکی لگا کے گھنٹوں عرفان صاحب کو دیکھتے اور سنتے رہتے۔

ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے بعد میری زندگی میں انسانی معراج کا بہترین مشاہدہ عرفان الحق ہیں۔ کسی کو مجھ سے لاکھ اختلاف ہو، مگر وہ یہ کبھی نہ کہہ سکے گا کہ میں نے کبھی کسی کے لیے ناجائز قصیدہ لکھا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ ان سے کسی بھی موضوع پہ کوئی سوال، کوئی بھی نکتہ پوچھ لیں، عین دو لفظی کھرا وہ جواب آئے گا جو قرآن، حدیث

،سیرت پاک، کامن سنس اور تمام تر انسانی علوم کی ہر پرکھ سے پرکھا جا سکے۔ بلکہ اکثر وہ جوابات بھی ہوتے ہیں، جہاں انسانی پرکھ کو پہنچنے میں ابھی شاید کچھ صدیاں اور لگیں۔

ان کی گفتگو جو چھوٹی سی دوستوں کی منڈلی میں شروع ہوئی تھی اب ایک ملک گیر بلکہ عالمی پنڈال میں بدل گئی ہے۔ شروع میں جنہیں فرد فرد بندے کی انگلی پکڑنے کی ذمہ داری ملی تھی، لگتا ہے اُن کے ہاتھ میں ہجوم کا ہاتھ دے دیا گیا ہے کہ وہ انہیں لوہے سے مقناطیس بنائیں، بے ترتیبوں کو کوئی ترتیب دیں۔ سماجی، معاشی، معاشرتی، ملکی، عالمی اور مذہبی تمام تر باتوں پہ مرتب ہونے والی اُن کی کتابوں کی تعداد اب درجنوں میں ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اُن کے تراجم چھپے ہیں۔ مگر عرفان صاحب کی ذات میں تکبر نہیں۔ انہوں نے عہد حاضر کے دوسرے مذہبی رسہ گیروں کی طرح اپنے سننے اور ملنے والوں میں طبقاتی درجہ بندی روا نہیں رکھی۔ اشرافیہ الگ نہیں بیٹھتے نہ بڑی کار پہ آنے والے کا نمبر پہلے۔ نہ اونچے رینک نہ اہم پوزیشن کے بندے کے لیے کوئی خصوصی نشست یا برتاؤ۔ ڈیرے پہ ایک سفید بورڈ لگا ہے۔ جو بندہ آتا ہے وہ اپنے ہاتھ سے نمبر شمار کے ساتھ اپنا نام لکھ کے انتظار گاہ میں بیٹھ جاتا ہے اور ملاقات کے بعد اپنا نام خود کاٹ دیتا ہے۔ اُن کے سامنے نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا۔ نہ انہوں نے پلازے بنائے نہ پورا محلہ خریدا۔ نہ پٹرول پمپ چلائے۔ نہ جرنیلوں اور سیاستدانوں سے یاریاں گانٹھیں۔ نہ کہیں بکے، نہ کسی کو خریدا۔ جو سچ دل میں آیا وہ ڈنکے کی چوٹ پہ منہ پہ کہا۔

عرفان صاحب کسی مسلک کسی فرقے کی بات نہیں کرتے اُن کا اللہ تمام انسانوں کا خدا ہے۔ وہ آفاقی سچائیوں کا وہ حسن کمال ہیں جنہیں ہر مذہب ہر دور میں پذیرائی دے گا۔ وہ اس عہد میں انسانیت کی گند ہوئی قدروں کے ایسے ترجمان ہیں جن کی نظیر شاید اس عہد میں کوئی اور نہ ہو۔ کوئی بھی کسوٹی لے کے کوئی پرکھ لے، وہ عین چوبیس قیراط کا سونا ہے جس میں ذرہ بھر ذات کے منافع کی کھوٹ نہیں۔ پوری دنیا میں

اُن کے نام پہ حق ملکیت کی کوئی چیز نہیں۔ نہ اپنا پانچ مرلے کا گھر، نہ کوئی پلاٹ نہ کہیں زمین۔ کہنے کو لاکھوں لوگ اُن کے عقیدت مند ہیں۔ ایک دفعہ میں محبت سے اُن کے لیے کچھ خربوزے لے گیا۔ اُن کے چہرے پہ اس قدر تکلیف کی لکیریں ملیں کہ میں ڈر گیا، لفافے میں پڑے خربوزے تک خوف سے چیخ گئے۔ اُن کی مصروفیات بہت ہیں۔ گھر میں اپنے غسل خانوں کی صفائی، گھر والوں کے جاگنے سے پہلے یہ اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ان ہاتھوں سے جنہیں شام کو لوگ چومنے کو ترستے ہیں۔ گھر کا سودا سلف خود لاتے ہیں۔ اپنی زندگی کا ایک وقت انہوں نے اپنی فیملی کے لئے رکھا ہے۔ قائدؒ کے تینوں اصول، ایمان، اتحاد، تنظیم اُن کی زندگی کا نصب العین ہیں۔ اقبال اُن کی سوچوں کا رُخ متعین کرتا ہے اور پاکستان کی محبت اُن کے لہو کا چلن ہے۔ اُن کی زندگی کا سارا فلسفہ بہت سیدھا سادا مفاد عامہ پہ مبنی اور عین عملی ہے۔

دوستوں سے اکثر کہا کرتے ہیں کہ بلاوجہ نہ محبت کے دکھاوے دکھائیں۔ کم آئیں، بلاضرورت نہ بیٹھیں۔ کم سوئیں، کم کھائیں اور زیادہ خدمت۔ سلطان باہوؒ کا ایک مصرعہ اُن کے اندر کا چلن ہے۔

''جودم غافل سودم کافر''

مجھے یاد ہے، صوفی برکت علی لدھیانویؒ نے ایک بار قسم کھا کے کہا تھا کہ خدا کی قسم، میرے پاس خدا کے سوا کچھ نہیں۔ میں بھی یہ تصدیق کرتا ہوں کہ بابا عرفان الحق کے پاس خدا کی قسم، خدا کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ہیں وہ اتنے دیالو کہ جو سائل آئے وہ اسے اپنا واحد اثاثہ، اپنا رب بھی سونپ دیتے ہیں۔

O

مہا پرش......ڈاکٹر کیول دھیر

کہتے ہیں، وہ سقراط کی کہانی ہے، جس کا باپ سنگ تراش تھا۔ وہ پتھر کی چٹان میں اپنے من میں چھائی تصویر کے تصور کو ایسی شدت سے سوچتا کہ وہ تصویر اسے پتھر کی سل کے اندر سانس لیتی نظر آتی، زندہ پتھر میں مقید، قیدی کی طرح۔ جب وہ یہ دیکھ لیتا تو پھر ہاتھ میں تیشہ لے کر اپنی من موہنی مورت کو پتھر سے چھڑانے میں جت جاتا۔ اُسے نکال لیتا۔ یہی سبق اس نے نوعمر سقراط کو دیا تھا، کہ بیٹا، ہاتھ میں تیشہ لینے سے پہلے، تیشے سے زیادہ اپنی سوچ کی دھار کو تیز کرنا، اتنا تیز کہ تیرے تیشے سے پتھر سل سے ہر وہ کنکر کٹ کے اتر جائے، جو تیرے من میں چھائی تصویر کے جسم کو باندھے ہوئے پتھر کی چٹان میں موجود ہو۔ سب فالتو پتھر ہٹا دینا۔ اپنی چاہت کی تصویر کا پورا بدن پتھر سے آزاد کروالینا۔ پھر تکنا۔ وہ مجسمہ شاہکار ہوگا، وہی ہوگا جو تم نے سوچا ہوگا۔

سقراط نے باپ کی بات نہیں ٹالی۔

ہاتھ میں تیشے کی جگہ قلم لے لیا، وجدان لے لیا، لفظوں کی حرمت کے چلن کی

راہ بنائی اور علم و دانش کو ایسا اوڑھا کہ آنے والے وقتوں میں وہ اس کی سب سے بڑی پہچان بن گیا۔ فہم و دانش کا دوسرا نام سقراط ہو گیا۔

میں کہتا ہوں، یہ خدا کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے بھی جو سوچا ہوتا ہے، جیسا سوچا ہوتا ہے، وہ وہی صورت وہی مورت بنا لیتا ہے، سجا دیتا ہے۔ چاہے وہ زمین و آسمان کے بیچ کہیں بھی ہو۔ کہنے کو وہ صورت ہزار پردوں میں چھپی ہو، پہاڑوں کی اوٹ میں ہو یا میدانوں کی رزم گاہوں میں، صحرا کے بیچ وہ کوئی آدھی صدی کے بعد نکلا ہوا انمول پھول ہو یا سمندر کی تہہ سے جڑی پلتی ہوئی کوئی خوش نما سیپی یا اس سیپی کے اندر چھپا ہوا کوئی گراں قدر گوہر۔ وہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے، جہاں چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ کہنے کو صدیوں سے وہ پرش بناتا آیا ہے، مگر جب اُسے کبھی پرشوں کی اس پرجا میں کسی کو مہا پرش کا درجہ دینے کا خیال آتا ہے تو وہ خود وہی کرتا ہے جو اس نے سقراط کے باپ کو سکھایا تھا۔ وہ وقت اور جگہ کی آنکھ پہ اپنی مقدس آنکھ ایسی محبت سے رکھتا ہے کہ جسے اس نے جیسا سوچا ہو وہ عین وہی ہو جاتا ہے، زمانے بھر سے پھر وہ اُسے منوا لیتا ہے۔

اب آپ خود کہیں گے کہ یہ تو کیول دھیر کی کہانی ہے جو میں سنانے چلا ہوں۔ جی انہی کی کہانی ہے، ایک پرش سے مہا پرش بننے کی۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی زندگی میں عجیب موڑ آئے۔ وقت اور جگہ کی صلیبوں پہ یہ کئی بار چڑھے۔ ہر بار سرخرو ہو کے اترے۔ اترے بھی ایسے کہ اپنے ساتھ اپنی صلیبوں کو بھی امر کرتے گئے۔ جس سمے پہ ہاتھ رکھا، وہ ٹھہر گیا، جس جگہ کو چھو لیا وہی شان والی ہو گئی۔

کوئی پچھتر سال پہلے، قدیمی ملتان دہلی روڈ پہ واقع ایک چھوٹے سے قصبے گگو میں یہ پیدا ہوئے۔ یہ پانچ اکتوبر ۱۹۳۸ کی بات ہے۔ کون جانتا تھا کہ ایک قصباتی ہسپتال کے ڈاکٹر ہنس راج دھیر اور شریمتی پدماوتی کے گھر پیدا ہونے والا یہ معصوم بچہ

اس برصغیر کا ایک نامور ادیب ہوگا جس کے قلم میں محبت، امن اور بھائی چارے کی خوشبو روشنائی بن کے روشنی دے گی۔ جگمگ کردے گی۔ دلوں میں پیار کی جوت جگائے گی۔ جس کہانی کو کہے گی اسے وقت کے کلیجے پہ ہمیشہ کے لیے ثبت کردے گی۔

وہ قصبہ، گگو آج بھی موجود ہے۔ ملتان سے کوئی سو کلومیٹر لاہور کی طرف یہ قصبہ کہنے کو اس وقت ضلع منٹگمری میں تھا۔ اب یہ وہاڑی ضلع کی تحصیل بورے والا کا حصہ ہے۔ جس وقت ڈاکٹر کیول دھیر وہاں پیدا ہوئے وہ ڈھائی تین سو گھروں کا ایک بڑا سا گاؤں گا۔ اب وہ جوان ہو کے ایک بھرپور قصبہ بن گیا ہے۔ پتہ نہیں کہ ڈاکٹر کیول دھیر کی جنم بھومی کی وجہ سے ہوا یا انکے مرحوم ڈاکٹر والد کے باعث، کہ آج وہ قصبہ اپنے علاقے کا ایک معروف میڈیکل ٹاؤن بن چکا ہے۔ جدھر کئی ہسپتال ہیں۔ دکھی جسموں کا وہاں علاج ہوتا ہے۔

دکھی روح کی سمجھ پا لینے کے بعد، دکھی جسم کے علاج کا نسخہ تجویز ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے دنوں میں ڈاکٹر کیول دھیر نو برس کے تھے۔ تقسیم کے دنوں میں آگ اور خون کا تماشا انہوں نے بیتا ہے۔ کہتے ہیں انکے والد کے سرکاری ہسپتال سے ملحقہ انکے گھر پہ بلوائیوں نے حملہ کردیا تھا۔ ان بلوائیوں میں اکثر وہ صحت مند لوگ تھے جنہیں طاقت کی دوائیاں کھلا کھلا کے اسی ہسپتال کے مہربان ڈاکٹر نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

مگر وہ پاگل پنے کے دن تھے۔

لوگوں سے اپنے محسن اور محبی کی پہچان نکلی ہوئی تھی۔

انہوں نے محاصرہ کرلیا۔

مگر کچھ نیک لوگ ہر دور میں ہوتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر کا ایک ڈسپنسر دل و جان سے ان سے محبت کرنے والا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پریوار کو اپنے

گھر لے گیا۔ بلوائیوں کو خبر ہو گئی۔ وہ ادھر جا حملہ آور ہوئے۔ ڈسپنسر بلوائیوں کے ہی دھرم کا تھا، مسلمان تھا۔ اس نے بتھیرے ہاتھ جوڑے، سمجھایا، منع کیا۔ وہ نہ مانے تو ڈسپنسر بولا مجھے ماردو،

میرے ڈاکٹر ہنس راج دھیر کو نہ مارو۔

ان ظالموں نے اُسے ماردیا۔

اس کی بیوی روتی پیٹتی آگے بڑھی، وہ بھی ماری گئی۔ دروازے پہ دو لاشیں گر گئیں۔ گلی خون سے بھر گئی۔ اس خون نے حملہ آوروں کے قدم روک دیے۔ ڈسپنسر اور اس کی بیوی نے تو اپنی جانیں قربان کر دیں۔ انکے بچے بھی انہی کی طرح قول نبھانے والے نکلے۔ جسے پناہ دی تھی اس کی سلامتی کے ضامن بنے رہے۔ وہ اپنے والدین کی خون میں لت پت لاشیں اٹھانے نہیں آئے، گھر کی پچھلی کھڑکی کھول کے ڈاکٹر کیول دھیر کے پورے گھرانے کو محفوظ نکال کے دُور ایک چری کے کھیت میں جا چھپا آئے۔ انہیں خبر بھی نہ دی کہ انہیں بچاتے بچاتے انکے ماں اور باپ دونوں مارے گئے۔ انکے سر سے آسمان اٹھ گیا۔ انکے قدموں سے ان کی زمین نکل گئی۔ یہ تو ایک دو دن بعد جب کھیتوں میں چھپے گھرانے کے لیے وہ چھپ چھپا کے روٹی پانی لے کر آتے رہے تو ان یتیم بچوں کے اجڑے چہرے اور لٹی روحیں دیکھ کے ڈاکٹر کیول دھیر کے والد صاحب کو علم ہوا کہ ان پہ اور ان کے گھرانے پہ ایک مسلمان ڈسپنسر اور اس کی بیوی اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے ڈاکٹر کیول دھیر کے والد صاحب، ان کی ماتا جی اور انکے بہن بھائیوں کے لیے یہ خبر کیسی ہو گی؟ ڈاکٹر کیول دھیر اس سمے نو سال کے تھے، ساری سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ان پہ اس واقعے کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ اتنی چھوٹی عمر میں انہیں دھرم کی بنا پہ دھرتی پہ کھنچی لکیر کی سمجھ تو شاید نہ آئی ہو گی مگر وہ اتنا سمجھ گئے تھے کہ انکے گھرانے کو بچانے کی تگ و دو میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے

والے محسن ترین لوگ انکے اپنے دھرم کے لوگ نہیں تھے، مسلمان تھے۔

شاید وقت اور جگہ کی چٹانوں سے پرشوں کے خدوخال بنانے اور ان کی پرورش کرنے والے خدا نے ایک پرش کو مہا پرش بنائے جانے والی اپنی سونی مورتی کے لیے یہ پہلا سبق رکھا تھا کہ انسان سے محبت اور اسکا پالن، جگہ وقت اور دھرم تینوں سے اونچے درجوں پہ گنا جائے۔ کون جانتا تھا کہ یہی سبق ڈاکٹر کیول دھیر کے لیے ان کی ساری زندگی کا چلن بن جائے گا۔ کہنے کو عام انسانوں کی طرح ساری زندگی وہ جہد مسلسل سے گزاریں گے مگر انکے اندر ہی اندر ایک پیپل یا بوہڑ کا بوٹا تناور ہوتے ہوتے اتنا پھیل جائے گا کہ اسکا سایہ انکے اپنے دیس سے نکل کے چہار سو پورے جنوبی ایشیا میں پھیل جائے گا۔ یہ محبت کی چھتری کھولے خود بیٹھے بٹھائے بندے سے بدھا اور پرش سے مہا پرش ہو جائیں گے۔

ایسا ہی ہوا

کہنے کو ڈاکٹر کیول دھیر کا گھرانہ پاکستان سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی قصبے پھگواڑہ میں لدھیانے کے مضاف میں جا بیٹھا۔ وقت کی بے رحم سختیوں اور زمانے کی دھول نے ڈاکٹر کیول دھیر کو بچپن میں بھی بچپنا نہ دیا۔ لڑکپن میں بھی لڑکھڑانے کی مہلت نہ دی۔ جوانی آئی بھی تو جاڑوں کی منجمد چاندنی کی طرح۔ انکے حساس دل سے گھرانے کی ذمہ داریوں کا بوجھ اوجھل نہ ہوا۔ ڈاکٹر دھیر کم عمری میں ہی ایک بوٹے سے پورا شجر ہو گئے۔ شجر بھی وہ جو سایہ دار بھی تھا، پھل دار بھی۔ مگر انہوں نے اپنے پھل خود نہ کھائے، اپنے سائے تک میں خود نہ بیٹھے، دوسروں کو بٹھایا۔ انکے ذہن میں بچپن میں دیکھی انوکھی وفا کے پالن کا جو سبق انہیں دکھایا گیا تھا وہ انہیں یاد رہا، جب انکے والد کا مسلمان ڈپنسر اور اس کی بیوی اپنے بچوں کو یتیم چھوڑ کے انکے گھرانے کی سلامتی کے لیے قربان ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کا

شعار ایثار اور قربانی بنالیا۔ صوبہ بہار کے علاقے میں یہ ڈاکٹری پڑھنے گئے مگر اپنا قلم بھی ساتھ لے گئے۔ وہ قلم صرف بیمار جسموں کے لیے نسخے لکھنا نہ سیکھتا تھا، بلکہ بیمار روحوں میں تازگی اور امن کی پیوند کاری بھی کرتا تھا۔ انہی مقدس جذبوں نے انہیں قلم کار بنادیا۔ کہانیاں تو انہوں نے خود بھی بہت بیتی تھیں مگر اپنے قلم کو انمول کہانی کہنے والا بنادیا۔ سروس تو انہوں نے کئی جگہ کی۔ آخری ان کی پوسٹنگ نے انکے مستقل قیام کی نشان دہی کردی۔ یہ ہمیشہ کے لیے میری ماں اور میرے باپ کے شہر لدھیانہ میں جا بسے۔

لدھیانہ سے اجڑ کے میرے والدین پہلے سیالکوٹ اور پھر لاہور آئے تھے۔

لدھیانہ اور اسکے مضاف ماڈ میووال میں وہ اپنے اجداد خواجہ روشن ولی، سائیں بگو شاہ اور میرے دادا ایلا خان کی قبریں بھی چھوڑ آئے۔ نانا بھی اپنے اجداد کی چوڑے بازار لدھیانہ میں حویلیاں چھوڑ آئے تھے۔ لاہور میں میرے والدین اپنی بقیہ زندگی جی کے جب جانے لگے تو میرے کان میں کہہ گئے کہ ان کے جسموں کو اٹھا کے ملتان دہلی روڈ پہ گگو سے چند میل پرے بورے والا کے مضاف میں ایک قدیمی قبرستان دیوان صاحب میں دفنانا۔ ادھر میرے ابا جی کی لدھیانہ سے ہی آئیں میری دادی کی قبر تھی۔ ابا جی نے ہمیشہ لیٹنے کے لیے اپنی ماں کے قدموں کا سرہانہ سوچا تھا۔ ابا جی کو ہم لاہور سے لے کے گئے۔ امی جی راولپنڈی میں میرے پاس تھیں جب ان کا بلاوا آیا۔ انہوں نے بھی یہ کہا جدھر تیرے ابا ہیں وہیں مجھے لے جانا۔ کہنے کو وہ علاقہ ہم بہن بھائیوں کے لاہور کے گھروں سے دور تھا لیکن والدین کے حکم کا پالن ہم پہ لازم تھا۔ اُدھر ہی لے گئے۔ اُدھر ہی انکا مزار ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ جدھر والدین نے اپنا مستقل ٹھکانہ بنایا ہے وہیں پہ لدھیانہ کے ڈاکٹر کیول دھیر کا جنم استھان ہے۔ قدرت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ ادھر کی دھرتی سے ادھر جا پیڑ لگاتی

ہے، کبھی اُدھر سے آئے بوٹوں کو ادھر شجر بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے بارے میں سنی سنائی بات میں نہیں کرتا۔

میں نے انہیں بیتا ہے۔ ان کے ساتھ لمبے لمبے سفر کیے ہیں۔ چودہ چودہ گھنٹے، بیس بیس گھنٹے لمبے سفر اور بہت کیے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے شہروں بیچ ہم اسی سلامتی محبت اور امن سے گھومے پھرے ہیں جیسے کبھی ہمارے اجداد ان راستوں پہ چلا کرتے تھے۔ لاہور میں انکے ساتھ رہا، اسلام آباد میں یہ میرے پاس رہے، لدھیانہ میں، میں انکے پاس ٹھہرا، دہلی میں ہم اکٹھے پھرے، آگرہ کا تاج محل ہماری محبتوں کا گواہ ہے۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات ہمارے راز دار ہیں، بدھا کے اسٹوپا زنے ہمیں پاس بٹھایا۔ لال قلعہ کے جھروکے ہماری باتیں جانتے ہیں، قطب مینار ہماری دوستی کا چشم دید ہے۔ اجمیر شریف کے خواجہ جی ہماری محبتوں کے امین ہیں، جہاں سلام کرتے سمے میں ان سے دو قدم ادب سے پیچھے چل کے گیا تھا۔ پانی پت کے بوعلی قلندر کے آستانے پہ ہم ساتھ ساتھ بیٹھے اور تبرکات وصول کئے۔ نظام الدین اولیاء اور قطب صاحب کی درگاہوں پہ ہم نے اکٹھے دیے جلائے۔ فتح پور سیکری کے کھنڈرات سے بھی ہم محبت کی خوشبو بکھیرتے گزرے۔ دہلی لدھیانہ کی جامعات میں ہم اکٹھے مہمان اعزاز بن کے گئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اور دیگر نجی چینلز کے علاوہ راجیہ سبھا ٹی وی دہلی میں ہمارے اکٹھے انٹرویوز ہوئے۔ اسلام آباد، لاہور، دہلی، آگرہ اور لدھیانہ میں ہم نے دو بھائیوں کی طرح باری باری ایوارڈز وصول کیے۔ ان تمام شہروں کی فٹ پاتھ پہ ہم چلے، باغوں میں گھومے، دفتروں میں بیٹھے، ہوٹلوں میں ٹھہرے اور ایک دوسرے کے گھر قیام کیا۔ کہنے کو میں اسلام آباد میں رہتا ہوں یہ میرے والدین کے شہر لدھیانہ میں، مگر ہماری روز ہی بات ہوتی ہے۔ کبھی فون پہ کبھی ایس ایم ایس، کبھی فیس بک۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ ہم کہیں بھی ہوں ہم پاس پاس ہی بیٹھے ہیں۔

اتنے قریبی تعلق اور محبت کے اٹوٹ رشتے کی بنا پہ میں انہیں بڑا بھائی مان کے ''بھاہ جی'' کہتا ہوں۔ دل و جان سے انہیں یہ مانتا ہوں۔ اس لیے ان کے بارے میں یا ان کی تحریروں کے ضمن میں کوئی رائے دینا اقربا پروری کے زمرے میں آئے گا۔ اتنا میں ضرور کہوں گا کہ ایسی محبت بھری ایک بھی شخصیت کا پیار پوری زندگی بھر کے لیے کافی ہے۔ میں جنم جنم پہ یقین تو نہیں رکھتا مگر اگر ایسے ہی ہے تو مجھے لگتا ہے ہم حقیقت میں کسی جنم میں حقیقی بھائی رہے ہوں گے۔ یا آئندہ کبھی ہوں گے۔ بہر حال اس جنم میں تو ہے ہی۔

ڈاکٹر کیول دھیر کی لکھی کہانیاں اجلے دل کی سلجھی ہوئی پریم پتریاں ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کا سارا پیار اپنے کرداروں میں رکھ کے انہیں ایسے پالا ہے جیسے ایک محبتی مالی اپنے باغیچے میں پھول اور پھلوں کے بوٹے پالتا ہے۔ انکے پتے پتے کا منہ دھلاتا ہے۔ ان کی جڑوں کو پانی دیتا ہے۔ انہیں سجاتا ہے، سنوارتا ہے۔ وہ مسکراتے ہیں تو خود مسکراتا ہے۔

ان کی کہانیوں کے ہیروز یادہ تر ان کی طرح اور میرے طرح میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور اپنے پروفیشن سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اپنے مریضوں کی فلاح کے لیے خود کو وقف کیے رکھتے ہیں۔ ہندوستانی فلمیں دیکھ دیکھ کے ہم ادھر کے ناموں سے اب بخوبی واقف ہیں، مگر کسی نے اگر وہ فلمیں نہ بھی دیکھی ہوں تو ان کی کہانیوں کے سارے کردار اسے آس پاس دکھنے لگتے ہیں۔ راج 'راجن' کیلاش 'وکاس' سدھیر' نریش، اویناش، ششیکھر، ویشال، دیپک، بھیم سنگھ، آکاش، روی، ستیش، منوج اور احمد جہاں مردوں میں انکے پسندیدہ نام ہیں تو ریتا، اندو، سمن، کلپنا، انجلی، سپنا، نشی، ساجدہ، گیتا، نیلم، مدھو، کلا، نیلو، شامنی، شوبھنا، پونم، وینو، سنگیتا، رجنی، مالتی، شالنی، پریتی، لتا، گنگا، سریتا، رما اور وانتی ان کی ہیروئینز کے نام ہیں۔

ان کی کہانیاں انسانیات کی اعلیٰ قدروں کی قدردانی پہ محیط ہیں۔ قدرت کی عظمت اور قدرتی مناظر سے انکا والہانہ پن ان کی کہانیوں میں مہکتا ہے۔ پہاڑوں کا حسن اونچے دیودار درختوں سے گزرتی خوشگوار مہکتی ہوا، ڈھلوانوں پہ بنے اچھوتے سندر گھر، پہاڑوں کی چوٹیوں پہ چمکتی برف، بہتی ندیاں، گنگناتے چشمے، مسکراتے جھرنے اور اچھلتی چھینٹے اڑاتی آبشاریں ان کی کہانیوں میں خوش نما بیل بوٹوں کا کام کرتی ہیں۔ دارجلنگ، مسوری، نینی تال اور ڈھیرہ دھون کے خوش نما پریم اسٹیشن ان کی کہانیوں میں جھلملاتے ہیں، پریمیوں کو بلاتے ہیں۔ ان کی ہر کہانی انسانیت کی کسی اعلیٰ قدر کی ترجمان ہے۔ ایثار و قربانی ان کی سب کہانیوں کی ایک مشترک قدر ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کا سبق انہوں نے نو سال کی عمر میں گگو سے آتے ہوئے سیکھا تھا۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت کا سارا حسن، پرتو، اجلاپن، چاہت، خلوص اور انسان دوستی ان کی کہانیوں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی اجلا قلم میلی بات لکھے۔

یہ سب چمتکار ان کے اندر ٹھہرے ہوئے نکھرے حسین موسم کا ہے۔ اسی کی بدولت یہ وہ سایہ دار شخصیت بنے جن پہ میٹھے انگور کی بیل چڑھی ہوئی ہے۔ اسی سے ان کی لکھی کہانیوں کا سارا رنگ رس ہے۔ یہی وہ امتیازی وصف ہے جو انہیں اپنے عہد کے سارے ادیبوں اور تمام پرشوں سے بلند کر کے مہاپرش کی گدی پہ بٹھاتا ہے، جوان کا دائمی استھان ہے۔

اپنی تحریروں کے طرح ان کی شخصیت کا سراپا بھی بڑا دلکش ہے۔ پیار کے جذبوں سے لدا ان کا گول مسکراتا چہرہ، بکھرے بکھرے پورے بال، محبت کے شہد سے چپ چپ کرتی، ان کی باندھ کے رکھ لینے والی بڑی بڑی آنکھیں جسے پیار سے دیکھ لیں کوئی گہرا رشتہ بنا لیتی ہیں۔ پتلون کے اوپر دو کھلے بٹنوں والی چیک دار گہرے رنگ

کی شرٹ ان کا پسندیدہ پہناوا ہے۔ان کی آواز بڑی متانت بھری اور کانوں کو بھلی لگنے والی ہے۔شاید مدتوں ریڈیو براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی ویژن کے میزبان کے طور پہ انہیں اپنی بات کہنے کا ایک منفرد اور سحر انگیز طریقہ آ گیا ہے۔

ساحر لدھیانوی سے کیول دھیر کو عشق ہے۔ان کا یہ عشق محض رانجھا بن کے چوری کھانے والا نہیں، فرہاد بن کے دودھ کی نہر نکالنے والا ہے۔پچھلے پینتالیس سال سے یہ لدھیانہ میں ساحر لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی چلا رہے ہیں۔اس اکیڈمی کے بانی چیئر مین ہیں۔ پینتالیس سال ہو گئے، ہر سال مارچ کے پہلے ہفتے یہ لدھیانہ میں جشنِ ساحر کا اہتمام کرتے ہیں۔ پندرہ سولوگوں سے بھرا پنڈال ہر سال پنڈت نہرو کینڈر لدھیانہ میں یہ سجاتے ہیں۔ ہر سال ادھر پاکستان کے نامور شعراء کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض سے آئے شاعروں کی ضیافت کرتے ہیں۔ایک آل پاک و ہند مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں۔یہی نہیں، ہر سال پاکستان اور ہندوستان کے چنے ہوئے ممتاز ترین ادیبوں اور شاعروں کو ساحر ایوارڈ اور ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازتے ہیں۔لدھیانہ ایک صنعتی شہر ہے۔ وہاں کے صنعت کار اور بزنس ٹائکون ان کی وجہ سے اپنے شہر کی سوہنی پہچان ساحر لدھیانوی کی محبت میں ساحر کے سحر کو مانتے ہیں۔ جدھر ڈاکٹر کیول دھیر انہیں کھڑا کرتے ہیں، ادھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جشنِ ساحر کے دنوں میں لدھیانہ شہر شادی والے گھر کی طرح جگ مگ لاٹیں مارتا ہے۔ پینتالیس سال سے اس شہر کی اس سالانہ عروسی سہرابندی میں دولہا ڈاکٹر کیول دھیر ہوتا ہے۔منٹو سے بھی ڈاکٹر کیول دھیر کو عشق ہے۔کئی کتابیں منٹو پہ مرتب کر چکے ہیں۔منٹو کی زندگی میں ہی ان کی معروف کتاب ''منٹو میرا دوست'' آئی تھی۔منٹو کی تحریر کے علاوہ اس کا ڈومی سائل بھی ان کے زیرِ نظر ہے، کیونکہ منٹو بھی لدھیانہ میں پیدا ہوا تھا۔منٹو کے لیے برصغیر پاک و ہند میں سب سے یادگار ادبی جلسے انہوں نے

لدھیانہ میں سجائے۔

ابن انشاء بھی لدھیانہ کا سپوت تھا، حمید اختر کی جائے پیدائش بھی لدھیانہ تھی، اُن کی یادگاریں انہوں نے سنبھالی ہوئی ہیں۔ میری پیدائش تو پاکستان بننے کے نو سال بعد سیالکوٹ میں ہوئی تھی۔ مگر میرے والدین اور اُن کے نسل در نسل سے لدھیانہ کے تعلق سے یہ مجھے بھی فرزند لدھیانہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ لدھیانہ کے ادبی، سماجی اور یونیورسٹی اجتماعات میں میری گفتگو سے پہلے یہ میرا تعارف بھی لدھیانہ کا بیٹا کے طور پہ کراتے ہیں۔ پاکستان میں جہاں میں ان کا چھوٹا بھائی اور بشریٰ رحمان چھوٹی بہن ہیں تو یہیں فخر زمان، عطاء الحق قاسمی، عقیل روبی، رشید امجد، سحر انصاری اور افضال احمد اُن کے پکے دوست ہیں۔ جس طرح لدھیانہ میں انہوں نے عظیم شاعر ساحر لدھیانوی کی عظمت کو سلام کرنے کے حوالے سے ساحر اکیڈمی بنائی ہوئی ہے ایسے ہی اُن کی اپنی جنم بھومی گگو بورے والا میں ان سے پیار کرنے والوں نے ڈاکٹر کیول دھیر اکیڈمی بنا دی ہے جو اس علاقے کی ادبی اور ثقافتی پہچان ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر کیول دھیر پاکستان اور ہندوستان کی عظیم ترین ادبی اور ثقافتی ہستیوں پہ ڈاکومینٹریز بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ ذمہ داری انہی کے اشارے پہ ہندوستان کے سرکاری ٹیلی ویژن، راجیہ سبھا ٹیلی ویژن دہلی کے مینجنگ ڈائریکٹر راجیش بادل نے اُٹھائی ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ڈاکٹر کیول دھیر اس تاریخ ساز منصوبے کے مدیر اور کوآرڈی نیٹر ہیں۔ پاکستان سے یہی ذمہ داری میرے کندھوں پہ رکھی گئی ہے۔ ہماری طرف سے اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، بلھے شاہؒ، ملکہ ترنم نور جہاں، مہندی حسن، رستم زماں گاما پہلوان، ریشماں، شہر لاہور اور ٹیکسلا کو ڈاکومینٹریز کے لیے چنا گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے غالب، ڈپٹی نذیر احمد، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، امرتا پریتم، دلیپ کمار اور اندر کمار گجرال کے نام ہیں۔ اندر کمار گجرال سے

کیول دھیر کی گہری دوستی تھی۔ چند سال پہلے جب میں دہلی گیا تو کیول دھیر مجھے آئی۔ کے گجرال سے ملانے ان کے گھر لے گئے۔ اس وقت گجرال صاحب اکانوے سال کے تھے، کڈنی کے مرض میں مبتلا تھے۔ ہفتے میں دو بار ان کا ڈایالیسس ہوتا تھا، مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ مجھے لے کر اپنی سٹڈی میں بیٹھے رہے، اپنے شہر گجرات اور ایف سی کالج لاہور کی باتیں کرتے رہے، سنتے رہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر گجرال صاحب کے علاوہ بھی ہندوستان کے اکثر مہامنتریوں سے دوستانہ تعلق رہے۔ جہاں جہاں ان کا بس چلا انہوں نے خطے میں امن کے لیے جان ماری۔

ڈاکٹر کیول دھیر دنیا کے اس خطے، جنوبی ایشیا میں وہ مضبوط ترین پل ہیں جو خطے کے ملکوں کو محبت کے ایک مضبوط، انمول ریشمی دھاگے میں پرو کے آنے والے وقتوں کے نصیب میں امن اور پیار کے سُچے موتے پرونے کی ذمہ داری نبھائے جا رہے ہیں۔ تاریخ جانتی ہے کہ ہر بڑے انسان نے محبت کی ایسی ہی مالائیں پروئی ہیں تب وہ کبھی صوفی اور کبھی مہاپرش کہا گیا ہے۔ ایسے ہی مہاپرش کی دستک میں مدت سے بند "دروازہ کھلتا ہے" کھلتا آیا ہے، کھلتا رہے گا۔

یہی نام ہے اس ناول کا جو اردو کا ضخیم ترین ناول ہے۔

اب جب انہوں نے اس کا ہندی میں ترجمہ کر دیا ہے تو وہ ہندی کا بھی سب سے بڑا ناول بن چکا ہے۔ یہ بات بھی طلسماتی ہے اور ان کی شخصیت کا سحر ہے کہ یہ ناول اور انکے ترجمہ کیے ہوئے دوسرے چھ ناول ہندی زبان میں پاکستان کے سب سے بڑے پبلشر افضال احمد نے اپنے ادارے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے چھاپے ہیں۔

ہندی زبان میں پاکستان سے شائع ہوئے ان ناولوں سے پہلے، پاکستان سے کبھی ایک صفحہ بھی ہندی زبان میں نہ چھپا تھا۔ اب ہندی کے سب سے بڑے ناول کی اشاعت کا شہر نہ دہلی ہے، نہ ممبئی ہے، نہ کلکتہ ہے نہ چنائی ہے بلکہ کتابوں اور

علم دوستی کا قدیمی شہر لاہور ہے۔ڈاکٹر کیول دھیر نے اگرچہ پچاسی کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کی ہیں مگر ان کا اردو پاکستانی ناولوں کا ہندی زبان میں ترجمہ اور ان کی پاکستان سے اشاعت ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔اردو زبان اور پاکستانی ادب پہ جہاں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولنے والا ہے، میرے لیے خصوصا یہ ایک بہت ذاتی انہونی خوشی کا باعث ہے، اس لیے کہ ۱۸۰۰ صفحوں کے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اور دیگر چھ ناولوں کا مصنف میں ہوں۔ یہ سارے وہ ناول ہیں جن میں تقسیم سے قبل کے ہندوستان کا سارا سماج، اس کے سماجی رویے، تہذیب، تمدن اور تاریخ، عام کرداروں کے حوالوں سے پوری داستان بیان کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''دروازہ کھلتا ہے'' ادب کا وہ شاہکار ہے جو اشاعت کے پہلے دن سے سیدھا کلاسیکل ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ لوگ اسے جام جہاں نما کہتے ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی، نہ بھولنے والے ساڑھے تین سو کے لگ بھگ کردار، آرائش، تشبیہات، منظر کشی اور کمال جزیات نگاری، مہمات، معلومات، حسن ومحبت، فلسفہ، تصوف اور انسانی نفسیات کی گتھیاں لوگوں نے اس میں ڈھونڈی ہیں۔ کہتے ہیں اس کا انداز سیدھا دل میں اترنے والا ہے۔ترکیب انوکھی کہ ایک نہیں کئی زمانوں میں بات کی ہے۔ ایک طرف برٹش انڈیا اور قبل کی طلسماتی فضا ہے وہیں فن ناول نگاری کے اب تک کے سارے نقوش۔ داستانوی، تاریخی، سوانحی، ڈرامائی، عشقیہ اور صوفیانہ بھی ذائقے۔ دنیا ادب میں یہ ناول دیکھنے میں تاج محل، محسوس کرنے کے لیے محبوب کا گھر اور زیارت کے لیے درگاہ کہا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ دنیا کا سب سے طویل پریم پتر ہے جو میں اور تم کے دھاگے میں پرو کے صدیوں پرانے ہندوستان کی تقسیم ہند تک کی طلسماتی کہانی بیان کرتا ہے۔ کیول دھیر کہتے ہیں کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کی کسی بھی کتاب میں قدیم ہندوستان اور برٹش انڈیا کا سحر انگیز کلچر اس ناول کے علاوہ کہیں محفوظ نہیں ہوا۔ ان کا

کہنا ہے کہ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے انہوں نے اس ناول کو ہندی زبان کا قالب دیا تا کہ ہندوستان کے سوا سو کروڑ لوگ اور ان کی آنے والی نسلیں اس اثاثے سے بہرہ مند ہو سکیں۔ ان کا یہی جذبہ انہیں اس ناول کے انتخاب پہ لایا اور بعد میں اس ناول کے مصنف سے انہیں پیار ہوا۔

بات کہنے کی تو نہیں، نہ میں سقراط کے باپ کی طرح کوئی ماہر سنگ تراش ہوں، مگر میں نے یہ ناول لکھتے سے اور ڈاکٹر کیول دھیر نے اس کا ترجمہ کرتے وقت قلم کو تیشے کی طرح پکڑنے سے پہلے عین ہوش کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھ لیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب تمام دیواروں کی توقیر اور احترام کے ساتھ ساتھ، ان دیواروں بیچ امن اور شانتی والا ''دروازہ کھلتا ہے''۔

o

ہنس راج......فخر زمان

سیانے کہتے ہیں، ہر شخص کا ایک حیوانی ہیولہ ہوتا ہے، جس میں زمین کی کثافت زیادہ ہو گی اُس کے اس ہیولے میں اتنے زیادہ پیر ہوں گے، جس اندر روح میں لطافت ہوگی، اُس کے پیروں میں بھی پیر نہ ہوں گے، پر ہوں گے۔ اس کے پاس وجدان اور عرفان کی اُڑان ہوگی۔ وہ زمین سے میلا نہ ہوگا، آسمان کی رفعتوں میں اڑے گا۔ سردیوں میں دھوپ اور گرمیوں میں چاندنی جیسا ہوگا۔ وہ زمانے کا فخر ہوگا، فخر زمان جیسا ہوگا۔

سیانے ٹھیک کہتے ہیں، ہر انسانی شخصیت میں خیر اور شر گتھم گتھا ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی میں خیر ہی خیر، کوئی شر سے شرابور۔ کچھ میں دونوں صلاحیتیں بین بین۔ انہی سیانوں کی صحبت سے یہ راز کھلا ہے کہ "شر" سے بھری بوریوں میں ملبوس انسان نما مخلوق کو آنکھ میچ کے تیسری وجدانی آنکھ سے دیکھو تو وہ اپنے زہریلے زہر کی کپی اپنی چرب زبان کے نیچے دبائے نوکیلے موریوں والے دانتوں سے منہ بھر کے ہر فساد گاہ کی

طرف پیٹ کے بل رینگتے نظر آتے ہیں۔ ان رینگنے والے ریپٹائلز میں بچھو بھی ہیں سانپ بھی۔ اشفاق احمد کہا کرتے تھے کہ سانپ نما بندوں سے بچنا۔ ان سے نیکی بھی کرو گے تو وہ پھر بھی کاٹیں گے۔ اس لیے کہ ان کے شکریہ ادا کرنے کا طریقہ بھی ڈنگ مارنا ہے۔ تھوڑی سے خیر کے ساتھ جن میں شر کا حصہ بہرحال زیادہ ہوتا ہے وہ وجدانی آنکھ کے عرفان میں چوپاؤں کے خدوخال میں نظر آتے ہیں۔ جو ذرا مسکین نما بے ضرر سے ہوں ان کا ہیولہ بکری، گائے اور بھینس جیسا ہوتا ہے۔ جو نیکی اور بدی سے ماورا صرف پیٹ کے لیے جیتے ہیں وہ اپنے اندر موجود شر کے تناسب سے بیل، خچر اور گینڈے کی قسم کے دکھائی دیتے ہیں۔ جو عناد، بغض، حسد سے ناک تک بھرے ہوں ان کے ہیولے بڑے ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ ان کی شکل صاحب نظر لوگوں کو ریچھ، بندر اور لگڑ بگڑ کی نظر آتی ہے۔ سفارشی اور مکار لوگ سیانوں کو لومڑی اور بھیڑیے کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک مجذوب لاہور کے چیئرنگ کراس پہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔ چوک کے پاس جو کوئی لمبی لشکتی گاڑی آتی وہ ہاتھ میں پتھر لے کر اسے مارنے کے لیے دوڑتا۔ لگتا یوں کہ ابھی پتھر مار دے گا، سر پھوڑ دے گا، پر وہ پھینکتا نہ بس ڈراوا دیتا۔ گاڑی میں سوار آدمی ایکا ایکی میں یوں ایک پاگل نما شخص کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر کچھوے کی طرح سر اپنے خول میں کر لیتا۔ ایک سیانا ادھر کچھ دیر کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا مجذوب کے پاس آیا اور بولا، سرکار کیوں اللہ کے بندوں کو خوف زدہ کرتے ہیں۔ مجذوب کے ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ سیانے کی یہ بات سن کے مجذوب کی آنکھیں لال ہو گئیں اور اس نے جلال میں آ کے چوک میں ٹریفک کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہا۔ دیکھو یہ بندے ہیں......؟

دیکھنے والا وہ ایک لمحے کا منظر دیکھ کے فنا ہو گیا۔

جس لمحے مجذوب نے چوک کی طرف اشارہ کیا، عین اس لمحے چوک میں لال بتی کے انتظار میں کھڑی ہر گاڑی کے سٹیرنگ پہ کوئی نہ کوئی چوپایہ بیٹھا تھا۔ کوئی بندر کی شکل میں، کوئی نوکیلے پنجوں والا ریچھ، کوئی مکار آنکھوں والا لومڑ کوئی مرے ہوئے کو مارنے والا لگر بگڑ، انہی کئی گاڑیوں کے بند شیشوں کے اندر سیٹوں پہ بیٹھے ہوئے اس لمحے پھنیئر سانپ یا سالم شکار کو کھا جانے والے اژدھے بھی نظر آئے۔ بس یہ سارا تماشا ایک لمحے کا تھا۔ یہ تماشہ دکھا کے مجذوب نے پتھر چوک کے کنارے پھینکا اور بڑبڑاتا ہوا ہجوم میں غائب ہو گیا۔

مجھے ایسے ایک دو مجذوبوں سے ملنے کا اتفاق ہے۔

انہوں نے انسان کے اندرونی پہلوؤں کو دیکھنے کے لیے جو شرائط رکھی ہیں وہ مجھ سے میلے خواہشوں بھرے آدمی سے پوری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ایک سیانے نے ایک بار بڑے رسان اور لطافت بھرے لمحے میں مجھے سرگوشی کے انداز میں بتایا تھا جو خوش بخت ''خیر'' کی نعمت سے نوازا گیا ہوا سے ''پر'' مل جاتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اڑان ساری پروں سے ہوتی ہے اور ''پر'' خیر سے ملتے ہیں۔ ایسے ہیولے جن خوش وضع لوگوں کے ہوتے ہیں وہ نہ پیٹ کے مارے پیٹ کے بل رینگتے ہیں نہ چار پیروں پر جھک کے چلتے ہوئے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

''خیر'' ان کے نصیب میں پرواز کے ''پر'' لے کر آتا ہے۔

پیر ان کے انسانوں کی طرح دو ہی ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان ودیعت ہوئے پیروں سے بھی زیادہ نہیں چلتے۔ وہ چل پھر بھی رہے ہوں تو ان کے ذہن محوِ پرواز رہتے ہیں۔ ایسے لوگ تخلیق کار ہوتے ہیں لکھاری، مصور، راگی، مجسمہ تراش، ہنر مند، سائنس دان وہ کھڑے ادھر ہیں تو ان کی سوچ سات سمندر پار کہیں دور کسی دکھیارے گھر کی کنڈی ہلا رہی ہوتی ہے۔ کب کنڈی کھلے اور وہ اپنی چونچ میں لایا ہوا کوئی پاکیزہ دانہ اس گھر

کی دہلیز کے اندر دو انگلی گہری زمین میں جما دیں تاکہ آنے والے وقتوں میں اس گھر سے سکھ کا کوئی پیڑ اُگ آئے۔ ایسے ''پر'' والے پنچھی لوگوں کی دنیا بڑی وسیع ہوتی ہے۔ بڑی قد آور، اونچی، ہواؤں، بادلوں اور سمندروں کے آر پار، کہنے کو تو وہ کسی نہ کسی زمین پہ گھونسلا بنا کے رہتے ہیں مگر وہ اپنے گھونسلے سے باہر کی دنیا کو نہیں بھرتے۔ باہر کی دنیا کو اپنے ''پر'' اپنی پرواز اور اپنے جیسے پیروکار دے کے جاتے ہیں۔ ایسے پرندے حسب خیر اونچائیوں یا نیلے پانیوں کے ساحلوں پہ اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ ان کی ساری حیاتی کا مقصد چھینتا نہیں ہوتا، پالنا ہوتا ہے اور ان کے پاس صرف ایک ہتھیار ہوتا ہے پر وہ ساری عمر ایسا کوئی ایک لقمہ بھی اپنے پیٹ میں نہیں ڈالتے جس سے ان کی پرواز میں کوتاہی ہو۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد اس قبیل کے پرندے تھے۔

کبھی ''پر'' رکھنے والے بھی ایک سے نہیں ہوتے جو ایک بر کی روٹی کی تاڑ میں گھنٹوں کسی اجنبی منڈیر پر بیٹھے کائیں کائیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی مہمان کے بلاوے کا سندیس دینا نہیں ہوتا۔ اپنے بھوکے پن کا اعلان کرنا ہوتا ہے۔ ان کی کالی زبان کی کائیں کائیں سے ان کا پورا وجود اندر اور باہر ہر طرف سے کالا سیاہ ہو جاتا ہے۔ ایسے بہت سے تخلیق کار ہیں جو اپنے پیٹ کی خاطر کائیں کائیں کر کے منہ سر کالا کر لیتے ہیں۔ پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ ''کوے'' پرندوں کو خبریں سناتے ہیں۔ کسی گھگی پہ کوئی بندوق تانے تو خوامخواہ ان کے دل میں مروڑ اٹھتا ہے وہ شور مچا دیتے ہیں۔ آج کل کی زبان میں آپ انہیں صحافی کہہ لیں۔ لیکن سبھی صحافی کالے من کے نہیں ہوتے۔

کچھ پکھیرو چھیچھڑے اور ہڈیاں بھنبھوڑ بھنبھوڑ کے خوب پھیل جاتے ہیں۔ ایک آدھ چھیچھڑے کی خاطر یہ گھنٹوں بسی ہوئی بستی کے اوپر منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ چیلیں

ہیں جو صرف پرواز میں کوتاہی کی وجہ سے ''باز'' بنتے بنتے رہ گئی ہیں۔ انہی سے ملتے جلتے کچھ کالے کالے بدہیئت لمبی ادھڑی سی گردنوں والے گدھ بھی ہوتے ہیں۔ جو ہنستی کھیلتی ہر بستی سے دور ویرانوں میں بیٹھ کے بستی کے اجڑنے کی بددعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی بددعائیں پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ بستی کے ویران ہوتے ہی یہ کاہل سے بدشکل گدھ ویرانے سے اڑ کے لٹی ہوئی سسکتی بستی پہ آ وارد ہوتے ہیں۔ ماڈرن پولیٹیکل سائنس کے طالب علم ان کو ڈکٹیٹر کا نام دیتے ہیں جو دکھی موسم میں مکھیوں سے بھنبھناتے پھولے ہوئے بدبودار بکھرے جسموں سے اپنا پیٹ پال کے نام گنواتے ہیں۔

کچھ پرندے شوبوائے ہوتے ہیں۔

سبز پیرہن پہ سرخ رومال گردن میں لپیٹے وہ امرود اور ناشپاتی کے درختوں میں گھسے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں۔ کہنے کو تو پنکھ پکھیرو دنیا میں ہزار ہا اقسام کے پنچھی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا مسکن ہے ہر ایک کی اپنی دنیا۔ کچھ کی دنیا درختوں کی چوٹیوں پہ ہے۔ کچھ کی پیڑوں کے پیٹ میں اور کچھ زمین کے ساتھ ساتھ مرغیاں بنے سوچتے رہتے ہیں کہ کبھی ہم بھی پرندے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں کن عالموں کی بات کر رہا ہوں۔

بے ضرر معصوم چڑیاؤں کی سینکڑوں قسمیں ہیں۔ سریلے گلے والی بلبل اور مینا بھی اسی دنیا کی ہے۔ ان ''پر'' والی مخلوق میں کبوتر وہ بابرکت پنچھی ہے جسے دیکھ کے آنکھیں سکھی ہو جاتی ہیں۔ جن کی گٹڑگوں گٹڑگوں سن کے شانتی بچھونے بچھا دیتی ہے۔ کبوتر کا گھونسلا کہیں بھی ہو، یہ دانہ دنکا چننے کے لیے کبھی میلی جگہ نہیں اترتا۔ مقدس آستانے، آباد مہکتی مسجدیں، قابل احترام درگاہیں، مزار، مندر، گرجے اور گردوارے اس کی کھیتیاں ہوتی ہیں۔ جہاں یہ دانہ چگتا ہے اور محبت، شانتی اور امن کی بیج کاری

کرتا ہے۔

کبوتر ہی کی رنگت کا ایک بڑا پرندہ اور ہے۔

وہ چال ڈھال میں بانکا ہے۔ پانی پہ چلتے چلتے آسمان کی طرف اڈاری مارے تو ایسے پر پھیلا کے پاؤں پیٹ میں دبا کے اڑتا ہے کہ دیکھنے والا رج جاتا ہے۔ آسمان سے اتر کے پانی میں اترتے سے اس کی دلکشی ایسی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی ہوائی کمپنیاں اس کی نقل میں اپنے ہوائی جہازوں کے اشتہار بناتی ہیں۔ اسے گروہ میں دیکھو تو سوہنا۔ اکیلے دیکھو تو باوقار، ڈگنیٹی سے بھرا ہوا۔ اسے دیکھتے جاؤ تو دل نہیں بھرتا۔ لگتا ہے ''خیر'' والے پرندوں کا یہ سرپنچ ہے۔ یہ ہنس راج ہے۔ کھلے سمندر میں مستون اٹھائے دودھیا کشتی کی طرح چلتا ہے۔ ساحلوں کے پار شہروں اور بستیوں کے اوپر سے گزرنا ہو تو پرواز اونچی رکھتا ہے، پر اکیلا کبھی نہیں اڑتا۔ پرندوں کی دنیا میں یہ جمعیت اور نظم وضبط کی علامت ہے۔ ہنس راج کی منڈلی آسمان پر اڑ رہی ہو تو ہر دیکھنے والی آنکھ میں خوشیوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔ جدھر جدھر ہنس راج کی منڈلی اڑتی جاتی ہے گردنیں ادھر مڑتی جاتی ہیں۔ جس آسمان پہ ہنس راج کا تخت اڑ رہا ہو وہ آسمان سج جاتا ہے۔ یہ زمین کے کلیجے سے ایک دانہ نہیں اٹھاتا۔ زمین سے تین گنا پھیلے سمندروں اور زمین پہ لہو کی شریانوں کی طرح بہتے شفاف میٹھے پانیوں سے بھرے دریاؤں سے مچھلیاں پکڑتا ہے۔ مچھلیاں بھی وہ جو سارے جل کو گندا کرنے والی ہوں۔ جس پانی پر اتر آئے اس پانی کے اندر کی ساری حیاتیات کی قسمت چمک جاتی ہے۔ یہ بات مجھے اس وقت سمجھ آئی جب میرے ایک جاننے والے کو اپنے فش فارم پہ عجیب حادثہ ہوا۔

ہوا یوں کہ اس کے فش فارم کی مچھلیاں جوان ہوئیں تو آسماں سے پرندے اتر اتر کے مچھلیاں پکڑنے لگے۔ فش فارم والا تھوڑ دِلا تھا۔ گھر سے بندوق اٹھا لایا اور کئی

پرندے گرا دیے۔ کئی دن تک ٹھاہ ٹھاہ کرتا رہا۔ پرندے آنا بند ہوئے۔ وہ دل میں خوش ہوا کہ مچھلیوں سے خوب منافع ہوگا۔ ہوا اُلٹ۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے فش فارم کی مچھلیاں دھڑا دھڑ مر مر کے سطح آب پر آ آ کر الٹی ہونے لگیں۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ویٹری ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ادھر مرغابیاں ہنس راج مچھلی پکڑنے نہیں آتے۔ وہ بولا جی آتے تھے۔ میں نے کئی مارے۔ بھگا دیے۔ ڈاکٹر بولا۔ ظالم تو نے بُرا کیا۔ یہ خوش بخت پرندے تو پانی سے صرف بیمار مچھلی پکڑتے ہیں ایسی بیمار جو اپنی بیماری سے باقیوں کو بھی بیمار کر دے۔ تو نے "خیر" والے ہنس راجوں کو بھگا دیا۔ اب تیرے پانی میں صرف مری ہوئی مچھلیاں ہیں۔ پرندوں کی دنیا بڑی مقدس دنیا ہے۔ ہر ایک کو ان کی سمجھ نہیں۔ پرندوں کی دنیا میں مجھے دو پرندے بہت پیارے لگتے ہیں۔ کبوتر اور ہنس راج۔

حیرت ہے، میں جب فخر زمان کو دیکھتا ہوں تو کبھی یہ مجھے کبوتر نظر آتا ہے اور کبھی ہنس راج۔ اجلا سفید، بانکا، چوھیلا، طرحدار، چھبیلا اور رسیلا۔ اسے دیکھ کے دل میں سکون کی بوندا باندی سی ہونے لگتی ہے۔ اسے بٹر بٹر دیکھتے جاؤ، ٹپ ٹپ آپ کی روح پہ رسیلی برکھا برستی جائے گی۔ اس کی آنکھیں عین کبوتر جیسی ہیں۔ معصوم شفاف اور بچوں کی آنکھوں کی طرح حیرت اور محبت سے بھری ہوئی۔ اسے چلتے پھرتے اور دوستوں کی منڈلی میں دوستی برتتے دیکھو تو یہ ہنس راج۔ نظم وضبط کا پیکر۔ اپنی پرواز پہ نظر رکھنے والا۔ دور دور اڈاریاں مارنے والا، ہر سمندر کے پار ساحل پہ اس کے ساتھی سنگی ہیں۔

فخر زمان کی شخصیت کے ایک پہلو سے میں اس وقت متعارف ہوا جب یہ میرے گرو ممتاز مفتی سے ملنے ان کے گھر آئے۔ مفتی جی کے سامنے ادب سے دوزانو ہو کے بیٹھ گئے۔ مفتی جی کا وہ کمرہ عکسی مفتی نے دیس بدیس سے آرکائیو جمع کر کے سجایا

ہوا تھا۔ عین فخر زمان کے پہلو میں گوتم بدھا جی کی ایک سونی موورتی رکھی ہوئی تھی۔ میں مفتی جی کے ساتھ فخر زمان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مفتی جی فخر زمان سے پیار میں باتیں کرر ہے تھے اور میں گوتم بدھا اور فخر زمان کے چہروں کی حیرت انگیز مماثلت پہ غور کر رہا تھا۔ بدھا کا وہ مجسمہ گندھارا آرٹ کے دنوں کا تھا اس لیے گوتم کے خدوخال انہوں نے یونانی سے بنائے ہوئے تھے۔ گوتم بدھا اور فخر زمان، دونوں کے چہروں پہ ملتا جلتا سکون تھا، جیسے دونوں نروان حاصل کر چکے ہیں۔ گوتم تو ایک راجیہ کا شہزادہ تھا۔ کپل وستو کی اپنی ساری ریاست اس نے انسانی دکھ، درد، بیماری اور موت کے بھیانک رنج کو دیکھ کے تیاگ دی تھی۔ سالہا سال تک وہ جنگلوں، بیابانوں، صحراؤں اور پہاڑوں پر رہا۔ پھر کہیں ایک برگد کے نیچے بیٹھے بیٹھے اس پر روشنی کی برکھا برسی اور وہ نروان ہو گیا۔ فخر زمان کو نروان کیسے ملا؟ میری سمجھ میں بات نہ آئی۔ فخر زمان اٹھ کے چلا گیا تو میں نے مفتی جی سے یہ بات پوچھی۔ بولے تو کملا ہے۔

گجرات کی گدی بھی کپل وستو سے کم نہیں۔

اس نے ادھر سینگ نہیں اڑائے، دکھ درد بیماری کالا پانی اس نے بہت کچھ دیکھا ہے، اندر اس کے بھی بہت آرے چلے ہیں، مگر اسے رخ مل گیا، اسے استحصال، جبر اور ظلم کے خلاف کہنے کا ہنر آ گیا ہے، اندر کا سارا زہر اس نے اپنے قلم کے ذریعے نکال دیا ہے، پھر باقی اندر کیا رہنا تھا۔ "سکھ ہی سکھ، نروان ہی نروان"۔ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولے "دیکھ دکھ درد تکلیف اور غم ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ ہر کوئی یہ سب سہہ کے جی بھی نہیں سکتا۔ مگر جو "خیر" کی چھتری لگا کے ان بھاری پانیوں سے گزر گیا اور گزرتے گزرتے ان سب کی جڑ نچوڑ کے ان کا تریاق حاصل کر گیا۔ جو جبر اور استحصال کے خلاف بے خطر لکھ گیا، وہ بچ گیا، وہ نروان حاصل کر گیا۔

فخر زمان گجرات کے ایک معتبر گھرانے کا فرزند ہے۔ اس کے والد محترم فوج

میں میجر تھے۔ چار بہنوں کا یہ اکلوتا بھائی ہے۔ پرائمری تک گجرات کے مشن سکول میں پڑھا۔ شاید دنیا کے ہر ''مشن'' کی حقیقت اسی وقت اس پر وا ہو گئی ہو۔ زمیندار کالج گجرات پہنچا تو سونڈی کے پر نکل آئے۔ چناب کنارے سوہنی کے دبے گھڑے کے نیچے ایک سرخاب بچہ ''پر'' پھڑ پھڑا کے نکل آیا۔ محبت، عقیدت اور احترام کی گٹھڑیاں بچپن سے اس نے سر پہ اٹھائی ہوئی ہیں۔ بڑا ہوتے ہوتے اسے زمانے کو الٹ پلٹ کے دیکھنے سے اصل اور نقل کی پہچان ہو گئی۔ اوپر سے جناب شریف کنجاہی جیسے بڑے برگد کا سایہ میسر آ گیا۔ اس کی سوچوں کو ''پر'' لگ گئے۔

خیال یہی ہے کہ پہلے یہ کبوتر بنا پھر ہنس راج۔

ہنس راج یہ اس وقت بن گیا جب اپنے کالج سے ایک نہیں تین سرخاب کے پر اس کی ٹوپی پر لگے۔ ایک طرف پڑھائی میں ایسا تیز کہ پورے صوبہ میں اول پوزیشن لے لی۔ رول آف آنرز کا حق دار ہوا۔ دوسری طرف کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان، ہاکی ٹیم کا نائب کپتان اور تیسری جہت سب سے نرالی تھی اور مشکل بھی۔ کالج یونین کا الیکشن ہوا اور یہ کالج کی تاریخ کا ایسا صدر منتخب ہوا جس سے زیادہ کالج میں کبھی کسی نے ووٹ نہ لیے ہوں۔ لگتا ہے اس کی ''ہنس راج'' شخصیت کے سحر میں قید ہو کر اس کے مخالفوں نے بھی اسے ہی ووٹ دے دیے۔ اس نے سارے کالج کو مسمرائز کر کے رکھ دیا۔

ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھ گجراتی کی طرح فخر زمان کی اگلی منزل لاہور تھی۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اس نے ایم اے سوشل ورکس کیا۔ ورنہ پڑھنے کو یہ وہاں ایم اے معاشیات اور ایم اے انگریزی میں بھی وقت ضائع کرتا رہا۔ ہنس راج کو اب اپنی شخصیت کی رنگا رنگ راجیہ کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس سوشل ورک میں آسانی اور مہارت کے لیے قانون پڑھنا بھی واجب تھا۔ ایل ایل بی پاس کر لی۔

انٹرنیشنل افیئرز میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ بھی حاصل کرلیا۔ اب قائداعظم اور علامہ اقبال کی طرح اسے بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جانے کا جنون ہوا۔

ان دونوں شخصیتوں سے اس کا پیار انوکھا تھا۔ یہ لندن اس لیے پڑھنے نہیں گیا کہ وہاں جا کے پڑھنے کا سارا حق تو قائد نے ادا کر دیا تھا اور جرمنی میں اب ایسا کوئی اعزاز نہیں بچا تھا جو اقبال نہ اٹھا لائے ہوں۔ اس نے لندن اور میونخ کے بیچ ہالینڈ کو چنا۔ ہالینڈ کے شہر دی ہیگ سے، جو عالمی عدالت انصاف کا شہر ہے، اس نے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا سرٹیفکیٹ لیا اور سوشل ویلفیئر اور انٹرنیشنل افیئرز میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا۔ ہالینڈ کی اشرافیہ اور اہل قلم سے انہی دنوں سے اس کے تا عمر قائم رہنے والے تعلقات قائم ہو گئے۔

فخر زمان چونکہ ذات کا کبوتر ہے اور شکل کا ہنس راج، اس سے نچلا نہ بیٹھا گیا۔

پھر ان دنوں ملک میں نئی آوازوں اور نئے خیالات نے شور مچا رکھا تھا۔ ایوب خان کی دس سالہ حکومت کا وہ دسواں سال تھا۔ پورے ملک میں ہنگامے تھے، ہڑتالیں تھیں، آنسو گیس کے بادل تھے اور ہر سوچنے والے بندے کے پیچھے نہ سوچنے والے اندھے پڑے تھے۔ فخر زمان نے اپنے اندر کے کبوتر اور ہنس راج کو تھوڑے دنوں کے لیے پنجرے میں ڈالا اور اپنی چونچ ٹیڑھی کر کے، آنکھیں لال بھبھوکا بنا کے، پر پھیلا کے عقاب جیسا حلیہ بنا لیا۔

اب اس پہ لازم ہو گیا تھا "پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کے پلٹنا"

فخر زمان تھا تو طالب علم مگر مقام دیکھو۔ جنرل ایوب خان کو للکار بیٹھا۔ ایک میگزین نکال لیا۔ باہر سے لاکھ کبوتر یا ہنس راج سہی۔ اندر سے باغی ہے۔ باغی بھی وہ جو کسی ڈر سے نہیں ڈرتا۔ اس نے دھڑا دھڑ ایوب خان کے خلاف مضامین شائع کرنے شروع کر دیے۔ باغیانہ نظمیں لکھیں اور چھاپیں۔ لوگ اس کا رسالہ سہم سہم

کے چھپ چھپ کے پڑھتے۔ یہ سینہ چورا کر کے اپنا رسالہ ہر صاحب دانش تک جا پہنچاتا۔ پتہ نہیں اس کے باغیانہ مضامین کی بھنک ایوب خان تک پہنچی یا نہ پہنچی۔ بہر حال ذوالفقار علی بھٹو جوان دنوں عوام کے دلوں کی تاروں کو مضراب کی طرح چھیڑ رے بیٹھے تھے ان تک بات پہنچ گئی۔ بھٹو صاحب نے فخر زمان کو طلب کر لیا۔ فخر زمان سے اپنی پارٹی کو فعال بنانے کے لیے مشورے مانگے۔ فخر زمان کے ذہن میں تو نئے نئے آئیڈیاز شہد کے چھتے کی طرح ٹپک رہے تھے۔ اس نے ایک لمبی رپورٹ لکھ دی کہ کیسے نئی نویلی پاکستان پیپلز پارٹی کو فکری بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ بھٹو صاحب نے اس کو ساتھ والی کرسی پہ بٹھا لیا۔ ان دنوں بیگم بھٹو پارٹی کی چیف آرگنائزر تھیں۔ بھٹو صاحب نے پارٹی کو آرگنائز کرنے کے لیے فخر زمان کو بیگم بھٹو کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔

بھٹو صاحب کا دور گزر گیا۔

جبر اور ظلم کا دور آ گیا۔

کبوتر نے پھر پر جھاڑے۔ ہنس راج نے اڑاری ماری، پیچھے پھر عقاب رہ گیا۔ عقاب زیر عتاب آ گیا۔ انہی دنوں فخر زمان نے جبر کے خلاف لکھے ہوئے لفظوں کو بندوق کی میگزین میں ڈال کے انہیں تھری ناٹ تھری کی گولی کی جگہ استعمال کیا۔ نہتے کمزور بے بس لوگوں کو ان کے اندر چھپی قوت کے خزانوں سے آگاہی دی۔ سیاست، بیوروکریسی اور مُلا ازم کے بارے میں جبر کرتے بگولوں سے آ ٹکر لی۔ دنیا کے اس خطے میں وہ مزاحمتی ادب جو کبھی صرف جنوبی امریکہ کی کتابوں تک محدود تھا اسے یہاں متعارف کرا دیا۔ ادب کی وہ گراں قدر قوت جو کبھی ہمارے صوفی شعراء کی علامتی احتجاجی نظموں اور کہانیوں میں تھی اسے پھر سے جگا دیا۔ فخر نے ان سے بات کہنے کا سلیقہ تو سیکھ لیا مگر ان کی طرح اپنی بات کو عشقیہ پیرائے میں کہنے کی زحمت نہ کی۔ سیدھی ننگی بات ایسے کی جیسے گولی ماری ہو۔

دوسری طرف بندوقوں والے تھے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔

اس نے مقدمے لڑے، قید ہوا۔ ملک بدر ہوا۔ مگر زبان بند نہ کی۔ لکھنے کے لیے اس نے پنجابی زبان کا سہارا لیا۔ اس کا ایک فائدہ اسے یہ ہوا کہ پنجابی زبان پنجابی اشرافیہ کو بھی پڑھنی نہیں آتی۔ اس لیے بچ گیا۔

پھر بھی شاید کچھ بدقماشوں نے فخر کی کچھ کتابیں ارباب اختیار کو پڑھ کے سنا دیں اور ایک دن یک جنبش قلم فخر زمان کے چار پنجابی ناول ''ست گواچے لوگ''، ''اک مرے بندے دی کہانی''، 'بندی وان'، بے وطنا چاروں پہ پابندی کا حکم آ گیا۔ ادبی علمی حلقوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حکومت کے حاشیہ برادر بغلیں بجانے لگے۔ عقل فہم اور مٹی سے پیار والے لوگ پریشان ہو گئے۔ فخر زمان پھر بھی نہ گھبرایا۔ یہ اور یجنل مٹی سے پیار والا درویش صفت آدمی ہے۔ جیسا سوچتا ہے ویسے ہی نوکیلے قلم سے لکھ دیتا ہے۔ پھر لکھتا بھی اسی زبان میں ہے جس میں تیکھی سوچیں اس کے من میں آتی ہیں۔ یوں اس کی تحریر میں عقل کی معیاری یا حالاتِ حاضرہ کی سمجھ داری زیادہ دخل نہیں دیتی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پنجابی زبان میں لکھنے کا ان دنوں کوئی فیشن نہیں تھا۔ آؤٹ آف فیشن کپڑے ہوں یا تحریریں وہ جب تک جان دار نہ ہوں کوئی انہیں توجہ نہیں دیتا۔

مگر فخر کو توجہ ملی۔

ملکی سطح پہ بھی اور عالمی سطح پر بھی۔ فخر زمان کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ پنجابی کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھیں۔ مگر اس کی پہچان پنجابی ناول، کہانیاں، نظمیں اور ڈرامے ہیں۔ فخر زمان کے ناولوں کے کردار دیکھنے میں اپنی گلی محلے کے لگتے ہیں مگر بولتے وہ مشین گن کی طرح ہیں۔ تڑ تڑ ان کے کہے لفظ اپنے اپنے حدف پہ عین صحیح جگہ مار کرتے ہیں۔ تھوڑی بات میں بڑی بات کہنا فخر زمان کا خاص ہنر

ہے۔اس کے ناولوں کے موضوع عموماً رزمیہ ہوتے ہیں۔اسلوب بیانیہ اور ڈرامائی ہوتا ہے۔یہ بات گھما پھرا کے لچھے دار جلیبی کی طرح نہیں کرتا۔سیدھا گھونسا بنا کے منہ پہ مارتا ہے۔اس کے ناولوں اور کہانیوں میں صوفی شعراء کی کافیاں اور اس کے اپنے اشعار بھی بُنت میں پھول پتیوں کا کام دیتے ہیں۔

فخر زمان نے ناول تو بہت لکھے مگر کوئی ضخیم ناول نہیں لکھا۔مختصر ناولوں میں اس نے بڑے پیچ دار پلاٹ بنا کے تیکھے کردار اکٹھے کیے اور ان کے منہ میں ایسی کھری زبان رکھی کہ ناول کے چند صفحوں میں ہی معاشرے کے سرپنچ بنے منافق، عیار، بدکردار کرتے دھرتوں کے سارے پول کھول دیے۔شاید اسی لیے اس کے ناول ہمارے کسی حکمران کو پسند نہیں آئے۔

اس نے جاگیرداروں کے خلاف لکھا۔جاگیردار اسے گھورنے لگے۔

اس نے اوچھے صنعت کاروں کے پول کھولے۔صنعت کار وزیر مشیر اس سے کنی کترانے لگے۔اس نے سفارشی منافق پیٹو مُلاؤں کے راز فاش کیے۔انہوں نے اس کے خلاف فتوے دے دیے۔فوجی حکمرانوں کی بے ضابطگیوں کو اس نے سب سے زیادہ رگیدا۔جواباً انہوں نے بھی اسے سب سے زیادہ ستایا۔

چونکہ آج کل یہ تینوں چاروں طبقے بڑی دیانت داری سے اکٹھے مل کے لوگوں کو بھنبھوڑ رہے ہیں اور بڑی جلدی میں ہیں۔اس لیے گمان یہی ہے کہ ان کے پاس فخر زمان کی کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ویسے بھی ہمارے ہر حکمران طبقے کے لیے پنجابی پڑھنا، سنسکرت پڑھنے سے بھی مشکل ہے۔اس لیے امید ہے آئندہ کے لیے فخر زمان کا مستقبل محفوظ ہے۔

بہر حال فخر زمان پہ مقدمے بنے۔اس کی چاروں کتابوں کا ایک ساتھ بین ہو جانا بڑا غیر معمولی واقعہ تھا۔فخر زمان کی خوش نصیبی ہے کہ ہر دور میں اچھے اور اجلے لوگ

اس کے دوست رہے ہیں۔۔ جن دنوں فخر زمان کی چار کتابوں پہ مقدمہ بنا، انہی دنوں بیرسٹر اعتزاز احسن، فخر زمان کا مقدمہ لڑنے گھر سے نکل آیا۔ وہ خود صاحب قلم ہے، مصنف ہے، شاعر ہے، دانشور ہے اور مہا ماہر قانون۔ اس نے فخر زمان کے حق میں ایسے زوردار دلائل دیے کہ انتہائی جبر کے موسم میں بھی عدالتوں میں انصاف کی رم جھم ہوگئی۔ جس طرح یک جنبش قلم فخر زمان کی چار کتابیں کالعدم ہوئیں تھیں اسی طرح ایک ہی فیصلے سے چاروں ناول بحال ہو گئے۔ الٹا حکومت کو ایک ہزار روپے جرمانہ بھی ہوا۔ پتہ نہیں وہ ایک ہزار بیرسٹر اعتزاز احسن کی جیب میں گیا یا فخر زمان کے حصے آیا۔

فخر زمان کا دل تو بڑا ہے۔ جیب زیادہ بڑی نہیں۔ پھر بھی اس نے دنیا کے زیادہ تر ملکوں کا سفر کیا ہے۔ پوری دنیا میں اس کے دوستوں کی منڈلیاں ہیں۔ جدھر جاتا ہے وہاں محفل سجا لیتا ہے۔ اس نے پاکستانی ادب کو جن ملکوں میں خاص طور پر متعارف کروایا ہے۔ ان میں ہندوستان، تاجکستان، ازبکستان، آذربائیجان، قزاقستان، کرغستان، بھوٹان، سویڈن، سپین، جاپان، ایران سے لے کر انگلستان تک ہر وہ ملک ہے جس کے آخر میں نون یا نون گنا آتا ہے۔ بیرسٹر اعتزاز احسن کے نام کے آخر میں بھی ''نون'' ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ یہ دونوں پیپلز پارٹی کے انتہائی قدیمی ارکان ہیں۔ انہیں ''نون'' اور ''نون گنا والے'' بھی بہت احترام سے ملتے ہیں۔

فخر زمان کی روح جیسے کبوتر کی طرح اجلی اور شفاف ہے اس کا سراپا ہنس راج کی طرح طرحدار اور بانکا ہے۔ گورا چٹا رنگ، دراز قد، بچوں جیسی محبتی آنکھیں جو جس کو تکتی ہیں تو توجہ اور انہماک سے تکتی ہیں۔ زبان شستہ اور دل کینہ کپٹ سے آزاد۔ اپنے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی قد کاٹھ کی وجہ سے ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہا، بے نظیر بھٹو کی حکومت کے دنوں میں یہ وفاقی وزیر اور چیئرمین اکیڈمی آف لیٹرز تھا۔ انہی دنوں اس نے پاکستان میں پہلی بار انٹرنیشنل ادبی کانفرنس منعقد کی۔ سوا سو سے

سے زیادہ ملکوں سے وفود آئے۔ پہلی بار پاکستان دنیا کے ثقافتی علمی اور ادبی نقشے پہ ابھرا۔ پاکستان کی ایک آبرومندانہ پہچان دنیا میں ہوئی۔

یہ 1995ء کی بات ہے۔

فخر زمان کی کانفرنس سے ایک سال پہلے 1994ء میں عکسی مفتی نے ایک عالمی کلچرل میلہ لگایا تھا، لوک ورثہ میں اس نے انٹرنیشنل کانفرنس برائے آرٹیسن اور آرٹسٹ منعقد کی تھی۔ ایک طرف پنڈال میں آرٹیسن آلتی پالتی مارے بیٹھے فن پارے تخلیق کر رہے تھے۔ دوسری طرف فائیو سٹار ہوٹل میں ثقافت اور پاکستان پر عالمی مقالے پڑھے جا رہے تھے۔ سب مقالے بیک وقت سات زبانوں میں ترجمہ بھی ہو رہے تھے۔ تیسری طرف اسلام آباد اور راولپنڈی کے بڑے بڑے ایڈیٹوریمز میں دنیا بھر سے آئے ہوئے ثقافتی طائفے اپنا فن پیش کر رہے تھے۔ عکسی مفتی نے اس عالمی میلے کے کامیاب انتظام اور اہتمام کے لیے چیف آف آرمی سٹاف کو خط لکھ کر مجھے طلب کیا تھا۔ مجھے جی ایچ کیو سے سگنل آ گیا کہ لوک ورثہ میں عکسی مفتی کو رپورٹ کرو۔ عکسی مفتی کے پاس گیا تو اس نے مجھے اپنا نائب مقرر کر کے عالمی کانفرنس کی گٹھڑیاں میرے سر پر رکھ دیں۔ انہی دنوں ایک دن وہاں فخر زمان نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ بولے تیار رہنا، میں بھی ایک عالمی ادبی کانفرنس کر رہا ہوں، پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار۔ تم نے آنا ہے، اسی طرح۔ میں نے کہا سرکار چیف آف آرمی سٹاف کے حکم سے ادھر آیا ہوں۔ بولے۔ مجھے ان سے حکم دلوانا آتا ہے، تم تیاری کرو۔ وہی ہوا۔ فخر زمان نے جنرل وحید کاکڑ کو خط لکھا کہ کرنل ابدال بیلا نوکری تو آپ کے پاس کرتا ہے، ہے بندہ ہمارا۔ عالمی ادبی کانفرنس ہو رہی ہے، اس کے انعقاد کے لیے اس کا ہمارے پاس ہونا ناگزیر ہے۔ پاکستان کی حرمت کا سوال ہے۔ سوا سو سے زیادہ ملکوں سے وفود آ رہے ہیں۔ جنرل کاکڑ فخر زمان کا خط پڑھ کے بھلا مجھے کیسے

روک سکتا تھا۔ میں ڈیوٹی پہ اکیڈمی آف لیٹرز آ حاضر ہوا۔

فخر زمان نے کہا کہ پوری کانفرنس کا ایک ایسا کنٹرول روم بناؤ، جیسے جنگ جیتنے کے لیے تم فوجی محاذ پہ بناتے ہو۔ کنٹرول روم بن گیا۔ دنیا بھر سے مندوب آنے لگے۔ اسلام آباد، راولپنڈی اور مضاف کے سارے ہوٹل موٹل اور گیسٹ ہاؤس اکیڈمی نے بک کر لیے۔ عالمی مہمانوں کی طرف سے تو کبھی کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ اِکا دُکا شکایات ہمارے اپنے ملک کے ادیبوں کی طرف سے آئیں، کچھ کی شکایات یہ تھی کہ فلاں شاعر سے میں بڑا شاعر ہوں مگر ہوٹل میں اس کے کمرے کا باتھ روم میرے باتھ روم سے بڑا ہے۔ کچھ کہتے وہ بڑے ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ جب کہ اس ہوٹل میں ٹھہرنے کا اصل حق دار میں ہوں۔ انہی دنوں مجھے یاد ہے کہ کراچی سے محمود شام آئے۔ نہ انہوں نے ائرپورٹ سے اکیڈمی کی گاڑی استعمال کی نہ اکیڈمی کی طرف سے ریزورڈ فائیو سٹار ہوٹل۔ اسلام آباد آئے اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہر گئے صرف اطلاع کے لیے فون کر دیا کہ بھائی میں پہنچ گیا ہوں۔ صبح پنڈال میں حاضر ہوں گا۔ اکیڈمی میں کھلبلی مچ گئی۔ اتنا بڑا نام، میڈیا میگنٹ محمود شام کی ائرپورٹ ریسپشن نہیں ہوئی۔ انہیں ہوٹل کا کمرہ نہیں ملا۔ اب کیا کریں۔ فخر زمان دفتر سے باہر تھے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ صرف میری گاڑی نیچے کھڑی تھی۔ میں اپنی گاڑی پہ انہیں ان کے عزیز کے گھر سے لے کر فائیو سٹار ہوٹل چھوڑ آیا۔ سوا بارہ بجے رات گلیاں ڈھونڈتا ڈھونڈتا میں محمود شام کے پاس گیا اور انہیں لے کر ہوٹل چھوڑا۔ اس سارے تردد کو دیکھ کے وہ بڑے حیران ہوئے کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کیوں؟ وہ صوفی منش آدمی ہیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ اکیڈمی کو اپنے ملکی شاعروں اور ادیبوں سے کیسے کیسے طعنے سننے کو ملتے تھے۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرا شکریہ ادا کیا اور فخر زمان کے اعلیٰ انتظام کی تعریف کی۔ اس عالمی کانفرنس میں پاکستان کے پندرہ عظیم

صوفی شعراء کا کلام دنیا کی پندرہ زبانوں میں ترجمہ ہو کے چھپا اور عالمی مندوبین میں بانٹا گیا۔ وہ شاید پہلا موقع تھا کہ دنیا ہمارے صوفی شعراء کی حکمت اور دانائی سے واقف ہوئی۔ اس عالمی ادبی کانفرنس کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ تھا کہ دنیا میں پہلی بار اہل قلم کی طرف سے ایک چارٹر پہ اتفاق ہوا۔ سب نے باقاعدہ اس پر دستخط کیے اور وہ سرکاری حیثیت سے جاری ہونے کے بعد اقوام عالم کے ادارے یونیسکو کا ادبی چارٹر بنا۔ کمیٹی کا چیئرمین فخر زمان تھا۔ فخر زمان نے اس دور میں ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے لیے کئی قابل ذکر کام کیے۔ ادیبوں شاعروں کی ڈائریکٹری بنائی گئی۔ نادار اہل قلم کے لیے وظائف رکھے گئے۔ ادیبوں کی انشورنس کا اہتمام کیا گیا۔ ان کے علاج معالجے کے لیے سہولتیں مقرر کی گئیں۔ نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر فریم کروا کے اکیڈمی کی گزرگاہوں اور ایڈیٹوریم میں آویزاں کی گئیں۔ پھر بے نظیر بھٹو کا دور گزر گیا فخر زمان استعفیٰ لکھ کے گھر چلا آیا۔ نئے آنے والے وزیراعظم نواز شریف نے فخر زمان کو پھر طلب کر لیا اور کہا کہ کام جاری رکھو۔

بے نظیر بھٹو کے کان میں بھی نواز شریف کی شریفانہ بات پہنچی۔ بے نظیر بھٹو نے فخر زمان کو بلا کے کہا، جیسا کہا جاتا ہے ویسا ہی کرو جو کام ادھورے چھوڑے ہیں وہ مکمل کرو۔ ''چارٹر آف ڈیموکریسی'' کی ابتدائی شکل ہمیں فخر زمان کے دونوں ادوار کی چیئرمینی میں نظر آتی ہے۔ فخر زمان بندہ ہے ہی کام کا۔ پھر کام میں جت گیا۔ جب شروع کیے ہوئے اس کے کام مکمل ہو گئے تو بڑی آبرو سے ایک بھکشو کی طرح ہاتھ جھاڑ کے چپکے سے دفتر چھوڑ آیا۔

اس کے اکیڈمی سے اٹھتے ہی مدتوں ویرانوں میں بیٹھے کسی گدھ کی بددعا پوری ہو گئی۔ گدھ اور مرداروں کا بڑا گہرا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ فہم اور خرد کی جب بھی موت ہوتی ہے تو گدھ بھاگم بھاگ نوچنے کو آ پہنچتے ہیں۔ اکیڈمی آف لیٹرز ایک چھوڑی ہوئی ہڈی

کی طرح بھنبھوڑی جانے لگی۔ انہی دنوں ''روزن دیوار سے'' اپنی عقابی آنکھ سے آسماں کی وسعتوں پہ اڑتے ہوئے زمین پہ رینگنے والے ہر کیڑے پر نگاہ رکھنے والے سوہنے کالم کار عطاء الحق قاسمی نے اپنے ایک کالم میں اس وقت کے فوجی ڈکٹیٹر کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے بڑا کمال کیا ہے۔ سال ہا سال ملک پہ حکومت کی مگر کوئی کام نہ کیا۔ ایک آدمی آپ سے بھی بازی لے گیا ہے۔ وہ اکیڈمی کا چیئرمین ہے۔ اس سے ہنر سیکھیں جس نے نہ کوئی کام کیا نہ کسی کو کرنے دیا۔ الٹا اپنی ذات کے لیے تمام میڈل لے لیے۔ وہ ڈیڑھ کتاب کا مصنف ہے۔ کیونکہ اس کی دوسری کتاب میں آدھا حصہ اس کی پہلی کتاب کا ہے۔

اکیڈمی جب کاٹھ کباڑ سے پھر بھر گئی تو وقت نے کروٹ لی۔ گدھ بستی سے نکلا اور فخر زمان پھر اکیڈمی کا چیئرمین بن گیا۔

فخر زمان ہے ہی عالمی ادبی پنچائیت کا سرپنچ۔ فوراً فیصلہ کیا کہ پاکستان میں 1995ء کے بعد دوسری عالمی ادبی کانفرنس، صوفی ازم اور امن ہوگی۔ یہ 2010ء کی بات ہے۔ کانفرنس کی منظوری ملتے ہی اس نے مجھے فون کیا کہ کدھر ہو۔ میں فل کرنل کے بعد ریٹائر ہو چکا تھا۔ فخر زمان نے وزیراعظم سے بات کی یا صدر سے، میں اکیڈمی آف لیٹرز پہنچ گیا۔ کانفرنس کا چیف کوآرڈی نیٹر بنا کے اس کی ساری ذمہ داری مجھے سونپی اور اکادمی ادبیات پاکستان کا ڈائریکٹر جنرل بھی بنا دیا۔ اس کانفرنس میں بھی کوئی اٹھاسی ملکوں سے وفود آئے۔ کانفرنس کی تیاری میں دن رات کام میں جتے رہتے ہوئے میرا وہ حال تھا جو فوج میں ساری عمر رہ کے کسی حالت جنگ میں بھی نہ ہوا ہو۔ انتظامات کے علاوہ اس کانفرنس کی تینوں دن پوڈیم پہ میزبانی بھی مجھے کرنا تھی۔ پریذیڈنٹ ہاؤس میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ اجلاس کے شروع میں صدر زرداری سے میں نے اجازت طلب کی تو انہوں نے بڑے شاعرانہ انداز میں عینک

کے اوپر سے جھانک کے سر ہلا کے کہا، بسم اللہ۔ سویڈن سے فخر زمان کے دوست نوبل ایوارڈ کمیٹی کے صدر پیٹر کرمین کو صدر زرداری اور فخر زمان کے ساتھ سٹیج پہ بٹھایا۔ ان کے ساتھ میرا جرمنی کا دوست فلاسفر سکائی ہاک بیٹھا۔ پہلے ارادہ پولینڈ یا اٹلی کے ادیبوں میں سے ایک کو ادھر بٹھانے کا تھا۔ مگر سکائی ہاک، اقبال کی پرستار آنجہانی میڈم این میری شمل کی ایک ایسی دستاویز لے آیا، جس میں مادام نے سکائی ہاک کو اپنا نائب مانا تھا۔ فخر زمان نے کانفرنس میں مندوبین کو بلانے، بٹھانے اور مقالے پڑھانے کی مجھے مکمل آزادی دی تھی۔ ہندوستان سے بہت بڑا وفد تھا، کوئی بیس ادیبوں کا۔ فخر زمان نے تاکید کی تھی کہ چین سے ہندوستان سے بھی بڑا وفد منگواتا۔ ادھر سے پچیس ادیب بلوا لیے۔ فخر زمان ہندوستانی ادیبوں سے بھی بہت محبت سے ملتے تھے مگر مجھے کان میں کہہ چکے تھے کہ افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں میں کوئی انڈین ادیب اوپر سٹیج پر نہ بیٹھے۔ روس سے آنے والی خوبصورت ادیبہ جس کا نام ''روزانہ'' تھا، آنے سے پہلے ہی روز مجھے ماسکو سے فون کرتی تھی۔ اسے یہ فکر تھی کہ اسلام آباد میں اسے نقاب پہن کے نہ جانا پڑے۔ مغربی میڈیا کے زیر اثر پورے یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ سے آنے والے وفود اسی خوف میں مبتلا تھے کہ پاکستان میں طالبان کا زور ہے۔ لیتھوانیا سے آئی ڈاکٹر ڈالیا اپنے سنہری بالوں پہ سکارف باندھ کے سہمی ہوئی ایئرپورٹ پہ اتری تھی۔ چیک ریپبلک، رومانیہ، پولینڈ، یونان، اٹلی کے وفود بھی خوف زدہ تھے۔ چلی سے آنے والا فلاسفر نڈر تھا، اس کے ملک میں تھوڑے دنوں پہلے ایک بڑا زلزلہ آیا تھا مجھے کہنے لگا، ''میں نے سوچا، اس زلزلے سے زیادہ جھٹکے تو پاکستان میں نہ پڑیں گے۔'' انڈونیشیا سے آیا پروفیسر، سری لنکا کی ڈاکٹر رانیہ اور کھٹمنڈو نیپال سے آئے، سارک کلچر کے صدر میرے پہلے سے دوست تھے۔ ہندوستان سے آئے لوگوں میں مجھے کتاب ''لاہور'' کے مصنف پران نیول سے بڑی

محبت تھی، جو میرے کالج فیلو تھے۔ اولڈ راوین تھے۔ مجھ سے تیس سال پہلے وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے 1942ء میں گرایجویشن کر کے گئے تھے۔

کانفرنس بہت کامیاب تھی۔ کانفرنس کے تین دن، دنیا کے چھ براعظموں سے آئے ادیبوں کا وہ جھرمٹ محبت اور یگانگت کی عملی تصویر تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان کے طول وعرض میں روزانہ خودکش کہے جانے والے ریموٹ کنٹرول دھماکے ہوتے تھے۔ پوری دنیا میں ہمارے ملک کا امیج ایک شدت پسند قوم کا بنا ہوا تھا۔ اس میں بدیسی میڈیا چینلو سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے میڈیا ہاؤسز کی اپنے ملک کے لیے سمیٹی ہوئی بدنامیاں منہ کا کالک تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک سینئر انڈین ادیب نے بھی زیرلبی تسلیم کیا تھا کہ یار پاکستان کے بارے میں پاکستانی چینلو جتنا ڈراتے ہیں ویسی بات تو نہیں دکھتی۔ اٹھاسی ملکوں سے اۓ اہل قلم، ادیب، صحافی، دانشور اسلام آباد میں جمع تھے۔ یہ سولہ مارچ سے اٹھارہ مارچ 2010ء کی بات ہے۔ پوری دنیا میں بگڑے ہوئے پاکستان کے چہرے کو اس کانفرنس نے ایسا سنوارہ کہ وہ سارے لوگ اپنے اپنے ملک جا کے پاکستان کے قصیدے لکھتے رہے۔ چین سے آئے پچیس ادیبوں کو کانفرنس کے بعد بھی ایک دو دن پاکستان میں ٹھہرنا تھا۔ بیجنگ سے ہمارے سفیر کا مجھے فون آیا۔ یار، انہیں اسلام آباد میں کوئی یونیورسٹی دکھا دینا۔ ادھر پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے ریکٹر میرے دوست جنرل اصغر نے مجھے کہا، بیلا! کانفرنس کے اگلے دن اپنے مندوبین، خصوصاً چینی وفد کو میری یونیورسٹی لے آؤ۔ جنرل اصغر خود صوفی سکالر ہیں، مصنف ہیں۔ ان سے میری پرانی شناسائی تھی۔ کانفرنس کے لیے انہوں نے مجھے پانچ آرام دہ کوچز بھی دے رکھی تھیں۔ پاکستان نیوی میں بھی اپنے قدیمی قیام کے حوالے سے میں نے چار منی کوچز مفت میں لے رکھی تھیں۔ کانفرنس کے اگلے دن میں موجود تمام عالمی ادیبوں کو نسٹ (NUST) لے گیا۔

نسٹ والوں نے شاندار لنچ کرایا۔ یونیورسٹی دکھائی، مگر سب سے پہلے یونیورسٹی کی تعارفی سلائیڈ چلائیں پہلی ہی سلائیڈ میں لکھا تھا، یونیورسٹی کا چیف ایگزیکٹو، چیف آف آرمی سٹاف۔ تمام ادیبوں نے مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہندوستان مندوب نے پہلا سوال ہی یہی پوچھا، کہ یہ شاید دنیا کی واحد یونیورسٹی ہے جس کا چیف ایگزیکٹو چیف آف آرمی سٹاف ہے؟ جنرل اصغر پریشانی سے ادھر اُدھر تکنے لگے۔

کانفرنس کے اختتام پر فخر زمان کا تمام وفد سے مشاورت کے بعد تیار کیا ہوا اسلام آباد ڈیکلریشن منظور ہوا اور دنیا میں پاکستان کی، کی گئیں امن کوششوں کو پذیرائی ملی۔

کانفرنس کے مندوبین کے بچھڑنے سے پہلے میں نے فخر زمان کو صلاح دی کہ اس کانفرنس کے مندوبین سے مشورہ کر کے ہم ایک انٹرنیشنل صوفی کونسل بناتے ہیں۔ پاکستان اس کا عالمی سطح پہ ہمیشہ کے لیے سرپنچ رہے گا۔ آپ چیئرمین کونسل بنیں گے۔ اٹھاسی ملکوں سے ہم نے اس کونسل کے صدور چن لیے۔ پاکستان سے مجھے صدر چنا گیا اور کونسل کا سیکرٹری جنرل بھی۔ اسی کونسل کے زیر اہتمام دسمبر 2013ء میں لاہور میں ایک اور عالمی امن کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس بار فخر زمان اور میں دونوں اکیڈمی آف لیٹرز سے باہر تھے۔ کوئی سرکاری فنڈنگ نہیں تھی۔ فخر زمان نے اپنی جیب سے یورپ، امریکہ اور ہندوستان سے آئے ستر مندوبین کے لیے ہوٹل میں قیام اور کانفرنس کے اخراجات برداشت کیے۔ ادیبوں کے لیے ویزوں کے انتظام کے علاوہ کانفرنس کو تینوں دن چلانے اور ایڈیٹوریم کو سجانے بنانے کی ساری ذمہ داری پھر میری تھی۔ اس کانفرنس میں پرانے یورپی اور ہندوستانی دوستوں سے پھر ملاقات ہوئی۔ کانفرنس کے بعد انہیں لاہور کی سیر کرائی۔ لیتھوانیا کی سنہری پری ڈاکٹر ڈالیا اور جرمنی کے جینو کو لاہور بہت پسند ایا۔ انہیں قدیم لاہور کی گلیوں، شاہی مسجد اور لال قلعے میں لے کے گیا۔ شاہی محلے میں بھجے کے پائے کھلائے۔ منجیت اندر؛ کمال کی شاعرہ ہے۔ گا کے کلام پڑھتی تو سماں باندھ

دیتی۔ بولی میرے ابا دیال سنگھ کالج پڑھتے تھے۔ وہ دکھا دو۔ میں لے گیا۔ وہ وہاں رونے لگی۔ مجھے لدھیانہ کی کوتوالی یاد آ گئی، وہاں میرے ابا جی تعینات رہے۔ جب میں وہ دیکھنے گیا تو وہ ڈھائی جا رہی تھی۔ اس وقت میں بھی رویا تھا۔ لدھیانہ سے آئے اپنے یار ڈاکٹر بچن سنگھ گل کو میں گڑھی شاہو کی مچھلی کھلانے لے گیا۔ دہلی کی شاعرہ انجنا کو انارکلی کی فرنی بہت پسند آئی۔ اس کانفرنس نے بھی وہ کام کیا جو کبھی کبھی بڑے بڑے ملکوں کی حکومتیں بھی نہیں کر پاتیں۔ دنیا میں امن کے لیے عالمی سطح پہ ادیبوں اور دانشوروں کا ملنا جلنا کتنا ضروری ہے اس کا احساس فخر زمان سے زیادہ شاید کسی کو نہ ہو۔

اس وقت بھی فخر زمان کے پاس بہت سے چیلنج ہیں۔ اسے ملک میں ادب اور ادیبوں کی ساکھ کو پھر سے زندہ کرنا ہے۔ نئے ادیب شاعروں کے لیے پہلی نرسری ادبی جرائد ہوتے ہیں۔ انہی ادبی پرچوں میں ادیب شاعر سانس لیتے ہیں۔ کہتے ہیں سنتے ہیں چھپتے ہیں۔ مگر ان رسالوں کو چھاپنے والوں کو کچھ نہیں ملتا۔ زیادہ تر رسالے ایسے ہیں جو ایک دو سال کا مجاہدہ کر کے توبہ استغفار کر کے کھسک جاتے ہیں۔ ان کی جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کوئی کریانے کی دوکان کھول لیتے ہیں۔ پورے ملک میں ابھی گنتی کے چند معتبر ادبی پرچے رہ گئے ہیں۔ اکثر بند چکے ہیں۔

سب سے پرانا اور باوقار معتبر ادبی پرچہ لاہور سے اظہر جاوید نکالتے تھے۔ چالیس سال ہو گئے۔

وہ پیٹ پہ پتھر باندھے پرچہ نکالتا رہا۔ اچانک اُن کی وفات ہو گئی۔ اب اُن کا بیٹا سونان باقاعدگی سے وہ پرچہ نکالتا ہے، ایک مہینے کا بھی اس نے ناغہ نہیں کیا۔

آج کل صحافی برادری نے نئے نئے نیوز چینل سے بڑا آسودہ روزگار اپنا لیا ہے۔ اخباری کالم بھی انہیں عزت کی روٹی اور معاشرے میں پہچان دے رہے ہیں۔

مگر افسوس یہ ہے کہ سنجیدہ ادب لکھنے والے جو کسی بھی زندہ اور فعال معاشرے

میں تمام تر طبقوں میں سب پہ فوقیت رکھتے ہیں، ہر عہد کے صحافی جن سے لفظوں کی بنت کے گُر سیکھتے ہیں، وہ تمام تر ادیب اور شاعر ہم نے دھتکار دیے ہیں۔ میں فخر زمان کی گوناں گوں صلاحیتوں اور ان کے عزم کو جانتے ہوئے پرامید ہوں کہ وہ سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلوائیں گے۔ ان کے ذہن میں ادیبوں اور شاعروں کی فلاح کے لیے بہت سے منصوبے ہیں۔ وہ اکیڈمی میں رہتے ہوئے ایک خالص ادبی ٹی وی چینل اور ایف ایم ریڈیو سٹیشن بھی کھولنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں نئے لکھاریوں کی کتابوں کی اشاعت کے لیے آسانیاں بانٹنے کا بھی ارادہ تھا۔ انہوں نے غیر ملکی کتابوں کے اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں ترجمے بھی کروانے تھے۔ پاکستانی ادب کو غیر ملکی زبانوں کا لباس دینا تھا۔ وہ یہ سب کام کریں گے، اگر انہیں یہ سب کرنے دیا گیا۔ میں یہ اس لیے بھی مانتا ہوں کہ میرے گرو ممتاز مفتی جو فخر زمان کو پیار سے ''سوہنا منڈا'' کہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار انگلی اٹھا کے زور دے کر مجھے کہا تھا کہ دیکھ لینا یہ سوہنا منڈا ایک بار اکیڈمی سے جا کے پھر آئے گا اور ادب اور ادیبوں کی عزت منوائے گا۔ فخر زمان کے دوبارہ آنے والی ایک پیشین گوئی تو پوری ہو گئی تھی، دوسری بھی لازمی ہو گی۔ ان شاء اللہ

o

درویش بادشاہ......سردار عبدالقیوم

اسلام آباد سے میری مظفر آباد تبدیلی ہوئی تو میرے گرو ممتاز مفتی رازداری سے میرے کان میں تحکمانہ انداز میں بولے، کشمیر جاتے ہی اس سے مل لینا۔ میں حیران ہو کے پوچھنے لگا، کس سے؟

بولے، سردار عبدالقیوم سے

میں بڑا حیران ہوا، کشمیر کے جس شخص کا یہ نام تھا، وہ تو آزاد کشمیر کا وزیر اعظم تھا۔ میں نے سوچا مفتی جی کسی اور کا کہہ رہے ہوں گے۔ اس لیے بڑے ادب سے پوچھا، کس سردار عبدالقیوم کی بات کر رہے ہیں؟

کہنے لگے بڑا نالائق ہے، کشمیر میں کوئی دو چار عبدالقیوم تھوڑے ہیں، ایک ہی سردار ہے، سردار عبدالقیوم۔

وہ تو وزیر اعظم ہیں ادھر کے!

تو کملا ہے، وزیر اعظم کے قلمدان کے علاوہ بھی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ تو

سیدھا اس کے گھر جانا، دروازے کی گھنٹی بجا دینا، مجھے مفتی جی کی معصومیت پہ بڑی حیرت ہوئی۔ سوچنے لگا ''مفتی جی نوے سال کے پرانے دور کے بزرگ ہیں۔ آج کل ''بڑوں'' سے ملنے کے پروٹوکول سے واقف نہیں۔ وزیراعظم تو دور کی بات ہے۔ وزیروں سے ملنے میں لوگوں کی آدمی عمر گزر جاتی ہے۔

پھر نہ جان نہ پہچان، میں تیرا مہمان۔ میں ایک معمولی بٹالین کمانڈر بن کے ادھر جا رہا تھا۔ کوئی لاٹ صاحب تھوڑی تھا۔ جو وزیراعظم کے دروازے پہ جا گھنٹی بجاتا اور وہ میرا نام سنتے ہی بھاگے چلے آتے۔

مگر گرو کا حکم تھا۔

تعمیل لازم تھی۔

سو چلا گیا۔

وزیراعظم ہاؤس کی راہ پہ جاتے یہی سوچتا جاؤں کہ آج خفگی ہونی ہے۔ پہرے داروں نے بھی خدا جانے کوئی بات کرنی ہے یا نہیں۔ وزیراعظم سے وزیر بھی ملنے کے لیے وقت لیا کرتے ہیں۔ ادھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سردار صاحب مظفر آباد میں ہیں یا نہیں۔ پریشانی میں چلتے سے گاڑی بھی ہراساں ہراساں تھی۔ جیسے سہمی ہوئی ہو۔

میری خوش بختی راہ میں سہیلی سرکار علیہ الرحمۃ کا مزار آ گیا۔

سوچا پہلے ادھر حاضری دے دوں۔ ان کے بارے میں علم تھا کہ کشمیر کی گدی پہ چاہے کوئی بھی براجمان ہو، سکہ انہیں کا چلتا ہے۔

ادھر پہنچا۔

سلام کیا۔

ایک کونے میں ادب سے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک اجنبی درویش قسم کا آدمی

میرے پاس آیا۔ آ کے بیٹھ گیا۔ پھر میری طرف کھسکا۔ قریب آیا۔ ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا، میں نے ہاتھ ملا لیا۔ پھر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بے تکلفانہ انداز میں بولا، ایک کہانی سناؤں۔

میں پہلے ہی پریشان بیٹھا تھا کہ ابھی وزیر اعظم ہاؤس جا کے خفیف ہونا ہے۔ اوپر سے وہ انجانا ڈنڈے والا درویش یارانہ لگا کے کہانی سنانے کی اجازت مانگنے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ چوغے والا گلے میں پہنی ہوئی رنگ برنگے منکوں کی مالا کو ہاتھوں سے پکڑ کے چھوڑتے ہوئے بولا۔

اس بالک کی کہانی سنی ہے جس کے گرو نے اس سے ایک بادشاہ سے جا ملنے کا حکم دیا تھا۔

اس بابے کی بات سنتے ہی میرے جسم میں بجلیاں کڑکیں۔

سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

میں جو بے توجہگی سے بیٹھا تھا، سراپا کان بن کے درویش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا، اس بابے نے میرے اندر کی ساری کہانی پڑھ لی ہے۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔ جسم کے لوں لوں کھڑے ہو گئے۔

آپ کس کی بات کر رہے ہیں، میں نے بڑی مشکل سے یہ لفظ ادا کیے۔ میرا یہ حال تھا جیسے چور پکڑا گیا ہو۔

بابا، بڑے اطمینان سے، لاٹھی ایک طرف زمین پہ دھیرے سے رکھ کے، میرے کندھے پر محبت سے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتا ہوا بولا،

وہ بالک اپنے گرو سے جدا ہونے لگا تو گرو نے اس کے ہاتھ میں ایک پرچی دی، پرچی پہ نام لکھا ہوا تھا کسی کا۔ گرو بولا، جدھر جا رہا ہے ادھر جا کے اس شخص سے ملنا۔

پھر؟

پھر کیا، بالک ادھر گیا، لوگوں کو پرچی پہ لکھا نام دکھایا، پتہ چلا، اُس نام کا تو ادھر ایک ہی آدمی ہے اور وہ اُس ریاست کا بادشاہ ہے۔

میں دیوار سے ٹیک ہٹا کے، دونوں پیروں پہ بیٹھ گیا۔ یہ تو میری کہانی ہے۔

پھر کیا ہوا؟

ہونا کیا تھا، بالکا سمجھا، گرو سے غلطی ہوئی ہے۔ نام لکھتے سمے ہجے غلط لکھ گیا۔ پھر سوچنے لگا، گرو غلطی تھوڑی کرتے ہیں، کوئی بھید ہوگا، چلا گیا ادھر بادشاہ کے محل میں۔

پھر!

پھر کیا ہونا تھا، ایک دن اس کا بادشاہ سے سامنا ہو گیا۔ بادشاہ کو وہ پرچی دکھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بادشاہ سمجھ گیا۔ بولا چل، اندر میرے ساتھ محل میں محل کے طول و عرض میں کوئی جشن ہو رہا تھا۔ شہر میں بھی کسی تہوار کا میلا لگا تھا۔ چاروں طرف رنگا رنگی تھی۔ بالک یہی سمجھے جائے گرو نے کسی اور کا کہا ہوگا، میں کدھر آ پھنسا، ایک بادشاہ کا درویش سے کیا تعلق۔

یہی سوچتا ہوگا نہ وہ بالک، اس بار اس درویش نے سیدھا میری آنکھوں میں ایسے دیکھا، جیسے کسی اور کی بات نہیں میرے خدشات بول رہے ہوں۔ بولو ناں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

ہاں جی یہی سوچنا چاہیے تھا اسے۔

شاباش، ہو سچے تم۔ مگر بالک کا سب سے بڑا سچ اس کا گرو ہی ہوتا ہے۔

ہاں جی! میں پھر تذبذب پڑ گیا۔

وہ درویش خود ہی کہنے لگا، ہونا کیا تھا۔ بادشاہ نے آئے ہوئے اس بالک کے ہاتھ میں دودھ کا بھرا ہوا ایک گلاس رکھا، بولا، خبردار ابھی اسے پینا نہیں۔ ہاتھ کی ہتھیلی

پہ ہی رکھنا۔ باہر شہر بھر میں میلے کا سماں ہے۔ جاؤ تین چار دن میلا دیکھو۔ مزے کرو۔ مگر احتیاط کرنا، ہتھیلی پہ رکھا دودھ کا گلاس اچھلے نہ۔ ایک بوند بھی اس سے گری تو یہ ساتھ دو ننگی تلوار والے پہرے دار ہیں تمہارے، دائیں بائیں۔ یہ تمھارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ انہیں کہہ دیا کہ تمہیں کسی میلے ٹھیلے کو دیکھنے سے نہ روکیں، لیکن اگر گلاس میں سے ایک بوند بھی دودھ گر گیا، یا تو پی گیا، تو یہ تیری گردن اتار دیں گے، سمجھ گئے؟

اب جاؤ

بالک کے پیروں سے زمین کھسک گئی۔ کلیجہ اچھل کے حلق میں آ گیا۔ اپنا آپ کیا وہ اپنا گرو بھی بھول گیا۔ تین دن میلا دیکھ کر واپس بادشاہ کے پاس آیا۔ جیسے مردہ لاش قدم قدم چلی آ رہی ہو۔ بادشاہ پوچھنے لگا، سناؤ، خوب مزے کیے۔ میلا دیکھا، سرکس دیکھی، ناچ گانا سنا۔ بالک سر سے پاؤں تک پسینے پسینے تھا، ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ رنگ اڑا ہوا تھا۔ بولا، سرکار ان دو پہرے داروں کی ننگی تلواروں کے سایوں میں ہاتھ کی ہتھیلی پہ رکھا دودھ بھرا گلاس ہی تکتا رہا، کہ کوئی بوند نہ گر جائے، میلے ٹھیلے کا مزہ کیا خاک آتا تھا، ادھر تو جان کے لالے پڑے تھے۔

بادشاہ نے اس کی ہتھیلی سے دودھ کا گلاس اٹھایا، گلے سے لگایا اور چپکے سے کان میں کان کہنے لگا۔ تجھے اپنے ہاتھ پہ رکھے دودھ بھرے ایک گلاس نے تین دن میلا نہیں دیکھنے دیا۔ ایک ذرا ہماری کیفیت بھی دیکھ، جس کی ہتھیلی پہ رکھنے والے نے اس راجیہ کا پورا راج سنگھاسن رکھ دیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے مجھے اپنے دائیں بائیں ننگی تلواروں والے نظر نہیں آتے۔ بے نا بے وقوف، جلد باز، تو یہی سمجھے بیٹھا ہے کہ میں میلے ٹھیلے کی خوش وقتی میں مبتلا ہوں۔ کملے، گرو سے مغالطہ نہیں ہوا۔ تجھے ہمارے پاس ہی بھیجا گیا ہے۔ شاید صرف اتنا سا سبق لینے کہ دنیا جہاں کی ہر چمکتی نظر آتی نعمت کے

ہوتے ہوئے بھی اس سے ''بے نیاز'' ہو کے کیسے جیا جاتا ہے۔ کچھ سمجھ آئی۔

میری تو آنکھیں کھل گئیں۔

بابے سے ہاتھ ملایا، اٹھ کے سہیلی سرکار کی پراندی کو چوما اور گاڑی دوڑاتا سیدھا وزیر اعظم ہاؤس کے دروازے پر گیا۔ وہاں پہرے دار کھڑے تھے۔ مگر میرے اندر ''سہیلی سرکار'' سے ملا اعتماد اور گرو کے کہے لفظوں کا اعتبار ایسا تھا کہ مجھے پہرے داروں کا پہرہ نظر ہی نہ آیا۔ ایک پہرے دار میرے قریب آیا۔ میں نے پوچھا سردار عبدالقیوم صاحب موجود ہیں۔ جی ہیں تو سہی۔ مگر اندر کیبنٹ کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ وزراء کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اللہ جانے کہاں سے مجھ میں اعتماد آ گیا تھا، بولا سردار صاحب سے کہیں ابدال آیا ہے۔

ایک دو اور پہرے دار مہمان آ کھڑے ہوئے۔ بولے، جناب ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جب تک وہ خود باہر نہ آئیں ہم اندر جا کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

بھئی دیکھو۔ میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ نہ مجھے ان سے کوئی کام ہے۔ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔ دیکھو شاید وہ کمرے سے نکل کے برآمدے میں پھر رہے ہوں۔ میں جو کچھ دیر پہلے پھٹے ہوئے غبارے کی طرح چڑ مڑ ہوا پڑا تھا، پٹاک پٹاک بول رہا تھا۔

ہیں جی!

پہرے دار بھی تذبذب میں پڑ گیا اور گیٹ کے اندر گردن گھما کے کچھ دیکھتے ہوئے ایک دم بڑبڑایا۔

وزیر اعظم صاحب واقعی برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔

میں ابھی پوچھ کے آیا۔

وہ اندر گیا تو دوسرا پہرے دار جو اندر گئے پہرے دار کا افسر معلوم ہوتا تھا، مجھ سے بولا، چلیے، سردار صاحب باہر کھڑے ہوں تو کسی ملاقاتی کو نہیں روکتے، آیئے۔

میں اندر چلا گیا۔ ابھی پہلا پہرے دار سردار صاحب سے میرا نام شاید کہہ بھی نہ پایا تھا کہ سردار صاحب ایک دم محبت سے لپکتے ہوئے میری طرف آئے۔ ہاتھ ملایا، گلے سے لگایا اور پھر مجھے اندر لے جا کے اپنے وزیروں کی منڈلی میں اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھا لیا۔ اللہ جانے وہاں کیا باتیں ہو نا تھیں، کیا فیصلے ہو رہے تھے۔ کیا اس میٹنگ کا ایجنڈا تھا۔ سارا کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ سردار صاحب ایسی شفقت اور محبت سے مجھے اپنے ساتھ ایک صوفے پر لیے بیٹھے تھے، جیسے انہیں میرا ہی انتظار تھا۔ میں نے مفتی جی کی بات شروع کی تو انہوں نے مکمل نہ ہونے دی۔ جیسے چوری پکڑے جانے کا ڈر ہو۔ بولے سناؤ مفتی جی کیسے ہیں؟

مفتی جی اور قدرت اللہ شہاب کی باتیں ہونے لگیں۔

اشفاق احمد کی کہی باتیں وہ سنانے لگے۔

"بیلی سرکار" اور میاں محمد بخش کا ذکر چھڑا تو وہ جیسے وجد میں آ گئے۔

ہم دونوں آپس میں بزرگوں کی کھسر پھسر میں لگے تھے اور کشمیر کے سارے وزراء چہروں پہ حیرت لیے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والا کون ہے۔

سردار صاحب محبت سے کہنے لگے اب ابدال آتے جاتے رہنا۔ جب جی چاہے آ جانا۔

میں عاجزی سے بولا، سرکار آپ وزیراعظم ہیں میں رعایا۔

بولے دیکھ۔ تیرا گرو ہم سے مذاق کر سکتا ہے۔ تو نہیں۔

واقعی، حیرت کی بات ہے، میرے گرو نے پاکستان میں قدم رکھا تو ادھر آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ ہو گیا۔ ان کے بابے قدرت اللہ شہاب آزاد کشمیر کے جنرل سیکرٹری بنا دیے گئے۔ ممتاز مفتی کی باتوں میں کشمیر کا ذکر ایسے ہوا کرتا تھا جیسے کسی

مقدس صحیفے کی بات کر رہے ہوں۔ اس جنت کی بات کر رہے ہوں جس کا ہر پاک روح سے وعدہ ہے۔ جس دن ان کے جانے کا سمے آیا، وہ کشمیر ڈے تھا۔ 25 اکتوبر 1995ء۔ اب زندگی بھر کی باتیں اور موت کا دن اور اس کی تاریخ، یہ سب تو اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اسی دن سردار عبدالقیوم اسلام آباد کے ایک مہنگے ہوٹل میں کشمیر کی آزادی پر گفتگو کر رہے تھے۔ اسی جلسے میں جواد جعفری نے اپنی گلوگیر موثر آواز میں مفتی جی کی وفات کی خبر سنائی۔ ادھر جلسہ ختم ہوا۔ ادھر سردار عبدالقیوم گاڑیوں کے ہجوم میں مفتی جی کے گھر پہنچ گئے۔ میں تو مفتی جی کے گھر بیٹھا تھا۔ سردار صاحب آئے، عکسی مفتی اور مجھے دونوں کو بانہوں میں لے کر مفتی جی کے جانے پہ دعائے خیر پڑھنے لگے۔ سوچنے بیٹھو تو ساری اتفاقی باتیں اتفاق تھوڑی لگتی ہیں۔

ایک دن سردار صاحب سے میں نے پوچھ لیا، سرکار کشمیر کی آزادی میں ابھی کتنی کتنی دیر ہے۔ کتنی دیر اور ابھی انتظار ہے۔

بولے میں نے بھی جا کے یہی پوچھنا ہے۔

کس سے؟ میں حیران ہوا!

بولے، دیکھ، وہ مجھے ادھر جانے نہیں دیتے۔

انڈیا میں؟

ہاں۔

آپ کو سری نگر جانا ہے؟

نہیں، اس سے پہلے کہیں اور

کہاں؟

اجمیر شریف

کیوں؟

کملے، ادھر شاہِ ہند کا تخت ہے۔ تجھے تیرے بابا نے نہیں بتایا؟

مفتی جی تو کہا کرتے تھے، کشمیر کے لوگ پاکستان کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہماری بقا کے لیے خود قربانیاں دے رہے ہیں۔

صحیح کہتے ہیں، سردار صاحب بولے۔

بات یوں سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے مفتی جی سے پوچھا بھی تھا کہ کیوں؟ بولے دیکھو، اگر تقسیم میں کوئی سقم نہ رکھا جاتا تو گمان یہی تھا کہ دونوں طرف کے جذبات جلد سرد پڑ جانے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ واپس جدھر جدھر سے ہجرت کر کے آئے تھے، ادھر پلٹ جانا تھا انہوں نے۔ لکیر مدھم پڑ جانی تھی۔ یہ جو ایک طاقت ور ایٹمی قوت والا، ایک اسلامی ملک پاکستان آج دنیا میں نظر آ رہا ہے۔ وہ نہیں ہونا تھا۔ کہنے کو لوگ لاکھ خوشحال اور روشن خیال ہوتے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ لبنان کی طرح ہونا تھا۔ جب اسلام سے بیر رکھنے والوں کے دماغ میں فتور آتا، انہوں نے ہماری اینٹ سے اینٹ بجا دینی تھی۔ دیکھو یہ ساری ملی عزت، وقار اور قوت ہمیں کشمیر سے ملی ہے۔ مگر سوچ کشمیر کے لوگ ہماری اس آسودگی اور آبرو کی کتنی بھاری قیمت دے رہے ہیں۔ ذرا سوچ۔

سوچنے بیٹھتا تو میں لرز جاتا۔

سردار صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔

ہر دفعہ میں نت نئے سوال لے کر ان کے پاس جاتا۔

وہ ایک وزیرِ اعظم کی گدی سے اتر کے ایک بوریا نشین بابے کی طرح میرے ہر سوال کا جواب دیتے۔

ایک دن میاں محمد بخشؒ کا ذکر چھڑ گیا۔

بولے ان کی زیادہ باتیں نہ کر۔

کیوں سرکار؟

دیکھ، انہیں سوچنے بیٹھوں تو مجھے بخار چڑھ جاتا ہے۔ تو تو ڈاکٹر ہے، دیکھ میری نبض۔

میری ڈاکٹری کی بھی مت ماری گئی۔

کسی بزرگ سے کوئی ایسی محبت بھی کر سکتا ہے کہ اسے سوچنے بیٹھے تو اسے بخار چڑھ جائے۔ چلو بندہ تو جھوٹ بول سکتا ہے مگر ایک ڈاکٹر کی انگلیاں اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھرمامیٹر تو جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

میں نے ایک بار، سردار صاحب سے رازداری میں پوچھ لیا، سرکار آپ کا گرو کون تھا؟

مسکرائے، بولے۔ یوں تو بہتوں سے سبق لیے، مگر وہ قطب دوراں تھے، اور راجہ بازار راولپنڈی کے ایک چوبارے میں رہا کرتے تھے۔

کب کی بات ہے؟

پاکستان بنے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ نیلا بٹ میں کشمیر آزادی کے لیے بندوق کی گولی چلائے مجھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ایک طرف میں جہادِ کشمیر میں لگا ہوا تھا۔ لوگوں میں مجاہد اول مشہور ہو گیا تھا۔ دوسری طرف اپنے بابے کے پاس حاضری دینا مجھ پر لازم تھا۔ یہ جہاد اکبر کی صورت تھی۔ اپنے نفس سے لڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ میرا بابا کبھی اس محاذ سے نکلنے نہ دیتا۔ انہوں نے ایک بار مجھے آزمایا تھا؟

گرو آزماتے بھی ہیں؟ میں حیران ہو کے پوچھنے لگا۔

ہاں!

کیسے؟

وہ یوں کہ میں نے ہی ان سے ایک بار سوال کیا تھا، کہ سرکار ہر علاقے میں ایک

ابدال ہوتا ہے، اس علاقے میں کون ہے ڈیوٹی پر۔ بولے اچھا بتاؤں گا۔ میں کہہ کے بھول گیا، انہیں یاد رہا۔ ایک دن چوبارے میں بیٹھا تھا ان کے ساتھ مجھ سے بولے۔ عبدالقیوم تجھے حاضر ڈیوٹی ابدال سے ملنے کی خواہش تھی نا۔ جا نیچے بازار میں جو ملنگ بنا، بڑا سا سوٹا لیے اس پر گھنگرو باندھے، ٹل بجائے جا رہا ہے۔ وہی ہے۔

جا، جا کے مل آ۔

آپ گئے پھر نیچے؟ میں پوچھنے لگا۔

نہ، میں نے چوبارے کی کنی سے نیچے اس بزرگ کو دیکھ لیا۔ پھر آ کے اپنے بابے کے پاس آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا، میرا بابا بولا، گیا نہیں؟ شوق تو بڑا تھا، اس سے ملنے کا۔

پھر؟ میں پوچھنے لگا۔

پھر کیا میں نے ہاتھ جوڑے، کہا سرکار پہچاننے والا، پہچانے گئے سے بڑا ہوتا ہے۔ میں بڑے کو چھوڑ کر چھوٹے کے پاس کیوں جاؤں۔

پھر؟

پھر کیا وہ مسکرائے اور مجھے دعا دی، جا نسل در نسل تو اپنی ریاست پہ راج کرے۔

سوچنے کی بات ہے،

سردار صاحب کو جب یہ دعا ملی، وہ ایک عام سے نوجوان تھے، شاید انہیں کسی مناسب نوکری کی بھی تلاش ہو۔ یہ سوڈان، ترکی اور اردن اور مڈل ایسٹ کے دوسرے ملکوں میں کچھ عرصہ نوکریاں بھی کر چکے تھے۔ ایک معمولی صوبے دار کے بیٹے تھے۔ کوئی سونے چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوئے تھے۔ آزاد کشمیر کے ایک دور افتادہ غازی آباد ضلع پونچھ کے علاقے سے ان کا تعلق تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی ریاست کے تین بار وزیر اعظم بنیں گے۔ چار بار صدر اور انہی کی زندگی میں ان

کا بیٹا بھی وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھے گا۔

بس اپنے گرو کی محبت کو کسی اور سے نہ بانٹنے کا اتنا بڑا انعام ہے یہ۔

مگر سچ یہی ہے کہ دوسروں کو تو ایک بادشاہ کی ہتھیلی پر راجہ سنگھاسن والا دودھ بھرا گلاس پڑا نظر آتا ہے۔ ایسے درویش کے دونوں طرف کھڑے تلوار والے نظر نہیں آتے۔ نفس سے لڑنا تمام تر لڑائیوں میں سب سے بڑا ئید ہے۔ یہ ایسی جنگ ہے جس میں بڑے بڑے سورما اوندھے منہ گر جاتے ہیں۔

ایک دفعہ سردار صاحب کا کوئٹہ آنا ہوا۔ میں اتفاق سے وہیں تھا۔ ایک لمبی نشست ان کے ساتھ ہوگئی۔ باتوں باتوں میں میں نے پھر پرانی ادھوری بات پوچھ لی۔

پوچھ لیا۔ سرکار پھر اجمیر شریف والوں سے رابطہ ہوا؟

بولے، ادھر گیا تو نہیں پر جواب آ گیا ہے۔

کیا؟

سردار صاحب چپ ہوگئے۔

مجھے سمجھ نہ آئے، یہ کیا کہنے والے ہیں۔

سردار صاحب کے بارے میں اکثر مجھے مغالطے رہے ہیں۔ کافی عرصہ سمجھتا رہا کہ سردار صاحب اپنی مقامی زبان کے علاوہ اردو پر اچھی دسترس رکھتے ہیں مگر باقی زبانوں سے کہاں واقف ہوں گے۔ معاملہ الٹ ہوگیا۔ ایک بار اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں دنیا بھر کے مندوبین جمع تھے۔ گفتگو کشمیر پر ہونا تھی۔ سردار صاحب ان دنوں صدر آزاد کشمیر تھے۔ کشمیر پر گفتگو کرنے یہ وقت پر پہنچ گئے۔

اتفاق سے اسی محفل میں میزبان عکسی مفتی نے اپنی جگہ بڑوں کے استقبال کے لیے میری ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ سردار صاحب نے مجھ سے صرف دو تین سوال کیے۔ بولے اس محفل میں مختلف ملکوں سے آئے لوگوں کے نام کیا کیا ہیں؟ اقوامِ متحدہ کے

مندوب کا نام کیا ہے؟ ان ناموں کا انہی کی زبانوں میں اصل تلفظ کیا ہے؟ میں نے ساری باتیں ایک چٹ پر لکھ دیں۔ میں سوچ رہا تھا خدا جانے سردار صاحب اس انٹرنیشنل کانفرنس میں کیسی انگریزی بولیں۔ مجھے پتہ تھا ان کی کہی باتیں بیک وقت دنیا کی پانچ زبانوں میں ترجمہ بھی ہونی ہیں۔ مندوبین فرانسیسی، سپینش، عربی اور روسی مترجمین کی ترجمہ کی ہوئی باتیں سننے کے لیے ہیڈ فون لگائے بیٹھے تھے۔ زیادہ لوگ انگریزی کی فہم رکھتے تھے۔ وہ سر کہنیوں پر رکھ کے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

بس سردار صاحب جو انگریزی بولنا شروع ہوئے تو میں حیران۔ ایسی انگریزی، انگریزوں نے آکسفورڈ میں بھی شاید نہ سنی ہو۔ پھر باتیں ایسے منطق اور ایسی دلیل کے ساتھ، کہ کسی کو اگر کوئی شک بھی تھا کشمیر بارے تو وہ بھی نکل گیا۔ میں کشمیر کی قسمت پہ حیراں۔ کہ کشمیر کو کیسا شاندار وکیل ملا ہے۔

مگر بات وہی تھی، رازداری والی۔ جو میں نے کوئٹہ میں پوچھ لی۔ آخر یہ تو بتائیں، کشمیر کی آزادی میں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ اجمیر شریف سے کیا پیغام آیا ہے؟

بولے زیادہ تفصیل بتانے کی اجازت نہیں۔

بس اتنا سوچ لو ادھر بھی بیس کروڑ مسلمان ہیں۔

اگر تم ان کا نہیں سوچتے، تو کسی کو تو ان کا بھی خیال رکھنا ہے۔ بولو۔

میں کیا بولتا، سوچ میں پڑ گیا۔

مجھے سوچتا دیکھ کے بولے۔

بس ذرا سی دیر ہے، اندھیر نہیں۔

یوں سمجھ، رات گزر گئی، صبح کی آمد آمد ہے۔

مجھے تو رات کا سینہ چیر کر بھاگتی چلی آتی صبح نظر آ رہی ہے۔ کوئی بھی غور سے اس درویش بادشاہ کو دل کی آنکھ سے دیکھ کے کہے، اسے ان کی آنکھوں میں سدا سے

جاگتی چلی آتی مقدس صبح کی روشنی نظر آتی ہے یا نہیں۔ جنہوں نے مدتوں ہاتھ ہتھیلی پر دودھ سے بھرا گلاس لیے رکھا، مگر ایک بوند بھی اس سے نہیں گرنے دی۔

یہ باتیں میں، درویش بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کر رہا، درویش بادشاہ تو کب کا بادشاہی چغہ بھی اتار چکا ہے۔ جب اسے پہنے ہوئے تھا وہ اس وقت بھی اس سے بے نیاز تھا۔ وہ تو اپنی درویشی کا بھی عجز میں اقرار نہیں کرتا۔ میں یہ گزارشات تو ان کے صاحب پناہ بیٹے وزیراعظم سے کر رہا ہوں کہ ان پہ صرف کشمیر کی تعمیرِ نو اور اس کی آزادی کے لیے جدوجہد کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں۔ ایک درویش صاحب مقام باپ کے صحیح اور سچے وارث ہونے کی بھی سخت ذمہ داری عائد ہے۔

o

رانی کنگن پور...... بشریٰ رحمان

کنگن پور کے کسی شہر یا قصبے میں بشریٰ رحمان رہی تو نہیں، مگر وہ جہاں بھی رہی، اُسے اپنی ریاست کنگن پور بنا کے رکھا۔ اور اس کی راج گدی پہ خود رانی بن کے راج کیا۔ ویسے کنگن بھرس نام کی ایک رانی تھی بھی۔ تھی بھی بشریٰ رحمان اور میرے قبیلے سے۔ وہ رانی بورے والا کے مضاف میں ایک قدیم درگاہ کے بزرگ حاجی شیر دیوان صاحب چاولی سرکار کی چہیتی بہن تھی۔ کہتے ہیں، بابا حاجی شیر برصغیر پاک و ہند کے قدیم ترین ولی ہیں۔ جنہوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ کے دست مبارک پہ بیعت کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ اس بیعت مقدس کے لیے وہ اپنی راج گدی سے ہزاروں میل دور چل کے عرب کے ریگزاروں میں گئے۔ چالیس سال وہیں رہے۔ جب عمر پچانوے سال کے لگ بھگ تھی تو وہ عرب سے دیبل کی طرف آنے والی محمد بن قاسم کی فوج کے ایک سپاہی بن کے آئے۔ چونکہ حاجی شیر دیوان صاحب کا آبائی علاقہ یہی تھا، جہاں اب انکا مزار ہے۔ ملتان کی

مسلمانوں کے ہاتھ فتح کے بعد وہ ملتان سے پچاسی میل دور اپنی راجدھانی میں آ ئے۔ اس وقت تک اُنکے راجپوت بہن بھائی پرانے قدیمی مذہب پہ تھے۔ انہیں مسلمان کے حلیے میں دیکھا تو انہیں شہید کر دیا۔ حاجی شیر راجکمار جب شہید ہوئے تو ان کی عمر سو برس کے لگ بھگ تھی۔ ان سے دلی محبت کرنی والی ان کی بہن بھی راجکمار حاجی شیر کے اندر کے اُجالے کو دیکھ کے کلمہ گو ہو چکی تھیں۔ کہتے ہیں، اِدھر حاجی شیر کے بوڑھے ناتواں مقدس جسم سے شہادت کا مقدس خون نکلا اُسی لمحے آسمان کے بادلوں نے وہ رنگ چرا کے سرخ آندھی میں بدل دیا۔ پھر ایک زلزلہ آ گیا۔ پوری بستی، جو اونچے ٹیلے پہ آباد تھی گھائل دل کی کپکپاتی دھڑکن کی طرح لرزی اور ساری کھڑی بجی راجدھانی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ یہ بھی سنا ہے کہ زلزلہ آنے سے چند ساعت پہلے ہی محل کی بالکونی پہ رانی کنگن بھرس کھڑی تھی۔ حاجی شیر کی شہادت کا واقعہ اُسکے سامنے ہوا۔ وہ ایسی دل گرفتہ ہوئی کہ محل کی بالکونی سے نیچے حاجی شیر کے شہید ہوئے جسد پاک کے پاس آ گری۔ پہلے لال آندھی ابھری، پھر زلزلہ آ گیا۔ محل کے درباری، راج پاٹ سے جڑے اہل کار اور بستی کے لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ قدرت کا یہ انتقام حاجی شیر کے قتل ناحق سے ہوا ہے۔ زلزلے کے بعد جو تھوڑے بہت راجپوت کے لوگ بچ گئے، انہوں نے حاجی شیر کے مقتل کو انکا مزار بنا دیا۔ مزار کے ساتھ ہی ایک چوبی چوکھٹے کے اندر رانی کنگن بھرس کو دفنا دیا گیا۔ یہ ساری تفصیل میں اس لیے جانتا ہوں کہ میرے والدین کا مزار بھی وہیں پہ حاجی شیر دیوان صاحب کے مزار کے مقابل ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بابا فرید پیدا ہوئے، اُسی قبرستان کے اندر آج بھی وہی کنواں موجود ہے جہاں بابا فرید گنج شکر نے چلہ معکوس کیا۔ وہیں پہ بابا گرو نانک جی نے کچھ وقت گزارا، اور سکھوں کے عہد میں وہاں ایک یادگار گردوارہ بنایا گیا۔ اُسی مقام پہ ملتان کی فتح کو جاتے سے محمود غزنوی نے بھی ڈیرہ ڈالا اور وہاں

ایک مسجد بنائی جس کے آثار آج بھی وہاں موجود ہیں۔اتنی اہم تبرکات کے باوجود وہ جگہ لوگوں کی نظر سے دُور ہے۔سال ہا سال گزر گئے۔صدیاں بیت گئیں۔اسی قبیلے کے لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ان میں ایک گھرانہ بہاولپور شہر کے اندر ملتانی دروازے کے پاس ایک حویلی میں جا آباد ہوا۔وہ حویلی بشریٰ رحمان کے باپ کی تھی۔

بشریٰ رحمان کے باپ حکیم عبدالرشید،نواب آف بہاولپور کے چہیتے سرکاری حکیم تھے۔دربار سے منسلک تھے۔راج پاٹ کا حصہ تھے۔اونچی لمبی حویلی،ان گنت کمرے،حجرے اور دالان۔مردانہ جاہ وحشم کا علاقہ ایک طرف،دوسری طرف زنان خانہ۔درمیان میں چھوٹی اینٹوں کی پھول پتیوں سے بنا صحن،صحن کے کناروں پہ خوش رنگ پھولوں بھری کیاریاں،گملے،درمیان میں فوارے،فواروں کی پھوار میں کچے رنگوں سے بجی اڑتی تتلیاں۔پچھواڑے میں پائیں باغ،باغ میں پھول اور بلبلیں۔

حویلی کا اونچا چوبی دروازہ تھا۔دروازے کے اندر وسیع ڈیوڑھی۔ڈیوڑھی کے ساتھ کئی اصطبل۔گھوڑے گھوڑیوں کے ہنہنانے کی آوازیں۔شاہی حکیم کی بجی سجائی بگھی۔

مردانہ حصے میں ملاقاتیوں کی قطاریں۔

زنان خانہ نت نئے پکوانوں کی خوشبو سے بھرا۔تنجن،بریانی،آب دار موتی پلاؤ،نرگسی کوفتے،ریشمی کباب،ست رنگی ترکاریاں،پستے اور بادام کی کھچڑیاں،مربے آچار،چٹ پٹی چٹنیاں۔باروچی خانے کی خوشبو پوری حویلی میں دندناتی پھرتی۔اسی مہک کے ساتھ مردانے سے آتی حکیم صاحب کے طب کی مخصوص صحت افروز خوشبوئیں:مفرح بوعلی سینا،خمیرہ گاؤزبان،مروارید،ماءاللحم،عنبراشہب،قند اور کیوڑے،عجیب سماں بندھ جاتا۔

حویلی تھی بھی نرالی۔چوبی دروازوں پہ نقش ونگار بھرے چھجے،ملائم لکڑی کے

پھول بوٹوں سے مزین بالکونیاں۔ محرابی دروازے، دروازوں پہ خس کی چکیں۔ کمرے کی چھت پہ ڈوری سے باندھ کے ہلا ہلا کے ہوا دینے والے پنکھے۔ ننگی گوری پنڈلیوں میں جھانجریں باندھ کے چھم چھم دوڑتی پھرتی، کومل مدھ بھری کنیزیں اور اُجلے موتیوں جیسے کانچ کے بنے کم عمر بالکے۔ یہ وہ عہد گزشتہ کی اچھوتی انہونی تصویر تھی جس کے ایک نقرئی پنے پہ بشریٰ رحمان نے آنکھ کھولی۔

آنکھ کیا کھولی، ساری حویلی کے قمقموں کی روشنی کو گم کر دیا۔

بشریٰ رحمان پہ خدا مہربان نکلا، اس کے گورے پیدا اُجلے ملائم چہرے پہ جو کاغذی بادام کی میٹھی گری جیسی آنکھیں رکھیں تو ان میں حویلی کے سارے قمقموں کی ضیاء یکبارگی میں مقید کر دی۔ جو اس پری چہرہ بچی کو دیکھتا، اُسے حویلی کا ہر قمقمہ بجھا بجھا لگتا۔

مسکراتی تو جیسے گھنگھرو بجتے۔

اٹھکیلیاں کرتی تو باغ کے غنچے چٹختے۔

ماں اور باپ دونوں کی لاڈلی تو تھی ہی، حویلی کے ہر مہمان کی آنکھ کا تارا بھی ہو گئی۔

بشریٰ رحمان اس لحاظ سے بھی خوش قسمت نکلی کہ اس نے اپنے باپ اور ماں دونوں کی بہترین چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ باپ سے حکمت، دانائی، علم، گیان اور صوفیاء کی محبت سمیٹی تو ماں سے ملائمت، گوری رنگت، مسکان بھری مسکراہٹ اور شاعرانہ مزاج چُرا لیا۔

ماں اس کی اس علاقے سے نہ تھی۔

اس کی ماں لاہور میں حضرت داتا علی ہجویریؒ کی پڑوسن تھی۔ ابا اسکے ایک دفعہ ایک لمبا چلہ کاٹنے داتا حضور کی درگاہ پہ بیٹھ گئے۔ خواب میں انہیں ایک سندیس

ملا کہ آپ کے لئے ہم نے ایک زوجہ طے کر لی ہے۔ ان کے ابا حکیم عبدالرشید گیان وعرفان کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ ایسی کسی منزل میں انہیں انعام کے طور پہ ایک نقرئی پنے پہ بنی ہوئی کسی حسینہ کی تصویر خواب میں دکھائی گئی تھی۔ خواب میں آواز بھی انہوں نے سنی تھی، حکیم عبدالرشید دیکھ لو غور سے، یہ تمہاری ہونے والی بیوی ہے۔ حکیم صاحب نے اتنے غور سے اس تصویر کے سراپا کو دیکھا کہ سارے نقش از بر کر لیے۔ اب جب کہنے والی نے کہا، کہ حکیم صاحب آپ کو ایک رشتہ دکھائیں تو حکیم صاحب بولے۔

اگر وہ میری بیوی بننے والی ہے تو اس کا سراپا مجھ سے سن لو۔

رشتہ کی بات لے کر آنی والی سٹ پٹا گئی، بولی، کہیے:-

حکیم صاحب نے آنکھیں بند کیں، خواب میں دیکھے گئے پنے پہ بنی اپنی ہونے والی بیوی کا سراپا کہنا شروع کر دیا:-

قد دراز، بال لمبے، رنگ گورا۔

آنکھیں، غزال جیسی، کھول کے دیکھے تو صبح ہونے لگے۔ موند لے تو شام ہو جائے۔

اندر لال لال ڈورے۔

پلکیں یوں جیسی ریشم کی جھالر۔

ماتھا کشادہ،

گال گلاب کی پنکھڑیوں میں پروے ہوئے قندھاری سیب

اور ہونٹ، اس کی بناوٹ کا کوئی پھل ہے ہی نہیں۔ ایسے بنے ہوئے ہیں جیسے بنانے والے نے گھنٹوں اس کی ڈرائنگ کی ہے۔

ادھر حکیم صاحب بولتے جائیں، اُدھر رشتہ لے کے آنی والی بوڑھی عورت

چنری کو بل دیے حیرت سے ہاں جی، ہاں جی، کہتی جائے۔

جب سارا سراپا کہہ چکے، تو بولے کدھر ہے ہماری بیوی؟

بیوی آ گئی۔

کچھ عرصہ بعد اُسی سراپا میں باپ کی پیوندکاری کے ساتھ بشریٰ رحمان آ گئی۔

باپ راجستھان کے چندربنسی راجپوت، عالم ہونے کے باعث نثر میں لکھتے، حکمت سے بات کرتے۔ ماں ریشم میں پلی تھی۔ ریشمی باتوں کے جال بُن کر شاعری کرتی۔

بشریٰ رحمان نے باپ اور ماں دونوں کو کشید کر لیا۔

سکول میں پہنچی تو رسالوں اور کتابوں کا ڈھیر لگا لیا۔ کالج میں جاتے جاتے اس ڈھیر سے شہد کی مکھی کی طرح، ہر میٹھی بات چن چن کے چاٹ لی۔ اوپر سے باپ سے ملا جلال اور ماں سے میسر ہوا جمال۔ دونوں کو گوندھ کے اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔

پہلے پہلے تو بشریٰ رحمان کو علم ہی نہ ہوا کہ اُسے بات کہنا آ گئی ہے۔

وہ تو ایک بار کسی نئے فلاحی سکول کے فنکشن پہ لوگوں سے سکول کی بہتری اور نشوونما کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی ایک مہم پہ کچھ لوگ تقریروں کے لیے بلائے گئے۔ ہر مقرر رٹی رٹائی برسوں سے کہی سنی فرسودہ باتیں کہتا رہا۔

پنڈال میں بیٹھے لوگ اونگھتے رہے۔

سٹیج پہ چندہ کے لیے بچھائے رومال پہ مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔

اچانک بشریٰ رحمان کے اندر ہل چل سی ہونے لگی۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس کا اپنا بیٹا حسن بھی اُسی سکول میں پڑھتا تھا۔ اس نے پنڈال میں سے ایک چٹ اوپر سٹیج پہ بیٹھے بڑوں کے پاس بھیجی۔ لکھا صرف اتنا، میں ایک ماں ہوں اس سکول کے ایک بچے کی، مجھے چند منٹ کے لیے موقعہ دیا جائے، بات کرنے

کا۔ سٹیج سیکرٹری نے وہ چٹ پکڑ کے بے دلی سے صدر محفل کو دکھائی، صدر محفل ایک جرنیل تھا، اس نے اونگھتے ہوئے چٹ دیکھی اور نیند میں سر ہلا دیا۔

بشریٰ رحمان کا نام پہلی بار مائیکروفون پہ بولا گیا۔

وہ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ سٹیج پہ چڑھی۔

ادھر اس نے بولنا شروع کیا، اُدھر سوئی آنکھیں جاگنا شروع ہو گئیں۔ مرجھائے تھکے دل دھک دھک کرنے لگے۔ وہ جنگی نبضوں کو بے رنگی گفتگو نے زنگ آلودہ کر کے بے ربط کیا ہوا تھا، یکبارگی میں کنپٹیوں میں بجنے لگیں۔ بشریٰ رحمان نے ایک ماں اور بچے کے حوالے کو ایک بہتر سکول کے مستقبل کے خواب میں کچھ یوں پُرو دیا کہ محفل میں طوفان آ گیا۔ ابھی اس کی تقریر جاری تھی کہ وہ مرد جو بشریٰ کی آنکھوں کی لال ڈوریوں میں ممتا کا اُبال دیکھ رہے تھے انہوں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے بٹوے لا لا کر سٹیج پہ الٹا دیے۔ وہ عورتیں جو اپنے خوابوں کو بشریٰ رحمان کے منہ سے سن کے زنانے میں آ گئیں تھیں انہوں نے اپنی کلائیوں سے سونے کے کنگن اتار کے ڈھیر پہ رکھ دیے۔ بس وہ چند منٹ کی تقریر بشریٰ رحمان کی زندگی میں ایسا طوفان لیکر آئی جو آج تک تھما نہیں۔

اُدھر تقریر ختم ہوئی۔

ادھر سٹیج والوں کے بچھائے بچھونے پہ خزانہ آ گیا۔

جرنیل صاحب ایک صوبے کے گورنر بھی تھے انہوں نے زیرلبی میں ساتھ بیٹھے لوگوں سے اس طوفان میل کا نام پتہ پوچھا۔ بس ہونا کیا تھا، تھوڑے ہی دنوں میں گورنر صاحب کا چیف سیکرٹری گورنر کا پیغام لیکر بشریٰ کے پاس آ گیا۔

بشریٰ رحمان چونکی۔

بولی میں شادی شدہ ہوں۔ اور میرا خاوند پچھلے جنم میں شیش ناگ تھا۔

چیف سیکرٹری بولا، بی بی میں وہ پیغام لیکر نہیں آیا۔ آپ کو صوبائی اسمبلی کی نشست اور وزارت کی دعوت دینے آیا ہوں۔

بشریٰ رحمان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ہاتھ جوڑے۔

بولی، بھائی میرا گھر بسنے دو۔ میرا خاوند نام کا رحمان ہے۔ آپکی بات اُسکے کان جا پڑی تو میرا وہ حشر کرے گا جو بھگوان نے بھی کسی کا نہ کیا ہو۔ میرا گھر نہ اجاڑو۔ مجھے کچھ نہیں لینا سیاست سے۔ وہ دن چلے گئے جب میرا باپ راج نیتی کا سرپنچ تھا۔ اب میں سر جھکا کے، چادر لپیٹ کے، درود شریف کا ورد کرنے والی ایک بے بس ماں ہوں۔ بس میرا ایک بھائی سر پھرا ہے۔ وہ ادیب ہے، چُھپے علوم کا ماہر ہے۔ احمد غزالی۔ مگر وہ مرد ہے، دلیر ہے، میں عورت ہوں۔ مجھے بس اپنے بچے پالنے ہیں۔

چیف سیکرٹری کہے، میڈم اس ملک کے بچے بھی تو آپ کے ہی ہیں۔

بشریٰ رحمان کہے، میں ان بچوں کو کیسے اپنا مان لوں، جب میرا خاوند اُنکا باپ نہیں۔

بھائی تم جاؤ۔

کہنے کو وہ چلا گیا۔ مگر انہوں نے بشریٰ رحمان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

ایک بار کہیں آس پاس کے دو پنڈالوں میں دو جلسے تھے۔ ایک میں بشریٰ رحمان کے ایک رشتہ دار کا جلسہ تھا، دوسری طرف بہت بڑا لیڈر پہنچا ہوا تھا۔ وہ لیڈر شہید ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ امن کے دن تھے۔ دونوں جلسے ساتھ ساتھ ہوتے رہے۔ دونوں طرف کی باتیں دونوں طرف سنی جاتی رہیں۔ ادھر جب بشریٰ رحمان سٹیج پہ چڑھی تو ذوالفقار علی بھٹو بیٹھے سن رہے تھے۔ جب یہ اپنی تقریر کر چکی تو انہوں نے اپنے کسی لاڈلے کو حکم دیا، پتہ کراؤ یہ بولنے والی کون ہے؟ جیسے بھی ہو اسے اپنی طرف لاؤ۔

کھینچا تانی شروع ہو گئی۔

بھنک بشریٰ رحمان کے رحمان صاحب تک بھی پہنچی۔

انہوں نے ایک دن کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا۔ اندر سے کنڈی چڑھائی۔ پھر آستین چڑھائی، آنکھوں میں چولہے کے انگارے اگائے، منہ سے نکلتی جھاگ کو الٹے ہاتھ کی پشت سے پونچھا اور کونے میں دبکی کھڑی میمنی کی طرح سہمی ہوئی بشریٰ رحمان کو انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ پھر اُسی انگلی کو اٹھائے اپنی دونوں آنکھوں کے بیچ لائے اور بولے، ایک بات یاد رکھنا، سیاست میں دخل نہ دینا۔

لاحول ولاقوۃ۔ بشریٰ رحمان ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے تیزی سے گھمانے لگی۔

وقت گزرتا رہا۔

بشریٰ رحمان کے رحمان صاحب کامیاب بلڈر تھے۔ انکا حلقہ احباب بھی ان کی بنائی بلڈنگوں کی طرح وسیع اور اونچا تھا۔ ہوتے ہوتے بات اُنکے دوستوں کے حلقے میں ہونے لگی۔ شاید کچھ دانا دوستوں نے رحمان صاحب کو سمجھایا، میاں رحمان، آپکی بیگم بیٹھی بٹھائی صوبے کی وزیر بن رہی ہیں، آپکا کیا حرج ہے؟ الٹا جو اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، اس سے بچ جاؤ گے۔ کبھی کوئی فائل دباتا ہے، کوئی فائل کو پہیے لگانے کا کہتا ہے، وہ چپ ہو جائیں گے۔ انہیں کیوں روکتے ہو۔ بات رحمان صاحب کی عقل میں آ گئی۔

پھر ایک دن ایسا ہی ہوا۔

رحمان صاحب، بڑے سنجیدہ موڈ میں گھر آئے، بشری رحمان کو اشارے سے ایک کمرے میں بلایا۔ کمرے کا دروازہ پھر بند گیا۔ کنڈی بھی چڑھائی۔ مگر بشریٰ رحمان کو انگلی کے اشارے سے بلانے کی بجائے، خود دھیرے دھیرے کھسکتے بشریٰ رحمان کی طرف گئے، کچھ دیر چپ رہے۔ پھر آہستگی سے بولے۔ گورنر صاحب کی

تجویز اتنی بُری بھی نہیں!

اس بار بشریٰ رحمان چیخی

کونسی تجویز؟

وہ جو تمہیں وزیر بنانے کا کہتے ہیں!

کیوں کہتے ہیں؟

چلو کہہ دیا، کیا حرج ہے وزیر بننے میں۔

یہ آپ کہہ رہے ہیں؟

ہاں، میں نے سوچا ہے، لکھی پڑھی تو تم ہو ہی، تقریریں بھی کرتی ہو۔ وہاں بھی یہی کرتی رہنا۔

نا۔ اس بار نہ کہنے کی باری بشریٰ رحمان کی تھی۔ میں نے نہیں وزیر بننا۔ آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے، میں وزارت کروں؟ آپکی بیوی ہو کر؟

تم میری بات نہیں مانتی؟ رحمان صاحب کے چہرے پہ عجیب طرح کی حیرت تھی۔ اور ایک مان بھی، تم میرا کہا ٹال رہی ہو؟

آپ ہی کا کہا مانا ہے! آپ نے کہا تھا، سیاست سے دُور رہو۔ میں دُور ہو گئی۔

آپ نے کہا تھا، کہانیاں لکھو، مگر اپنی تصویر نہ چھاپو۔

میں نے کہانیاں لکھیں، مگر تصویر نہیں چھپنے دی۔

وہ تو خیر، چھپتی رہی۔

میں نے کبھی نہیں کہا، رسالے، اخبار کو اپنی تصویر چھاپنے کا۔ خود وہ چھاپ دیں تو میں کیا کروں۔

چلو چھوڑو، میں تو تمہیں شاباش دینے آیا ہوں۔

کس بات کی؟

تمہارے حق میں لوگ باتیں کرتے ہیں۔

آپ تو کہتے تھے تمہاری باتیں اگر کسی نے کیں تو زبان نکال لوں گا اُسکی۔

وہ تو بُری باتوں کے لیے کہا تھا، یہ تو اچھی باتیں کرتے ہیں۔

کون کرتے ہیں؟

تم جانتی ہو!

میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا علم آپکے گھر کی اس چاردیواری سے باہر نہیں نکلا۔

اب ضد کر رہی ہو؟

جی نہیں۔

تو اب تم میرا حکم نہیں مانو گی؟

ہمیشہ مانا ہے۔

تو سنو

جی

جاؤ

کدھر؟

اسمبلی میں جا کر، اپنی نشست سنبھالو۔

پھر

پھر کام کرو، رفاعی

وہ تو پہلے بھی کر رہی ہوں۔

اب بحث نہ کرو۔ جو کہا ہے وہ کرو۔ سمجھی۔ رحمان صاحب جلال میں آ گئے۔

جی اچھا۔ بشریٰ رحمان دل ہی دل میں مسکرائی اوپر سے سہمنے کا سوانگ رچایا۔

اب ایک طرف بشریٰ رحمان کی کہانیاں چھپ رہی تھیں۔ ناول چھپ رہے

تھے۔ کالم لکھے جا رہے تھے۔ دوسری طرف اسمبلی کے اندر اس کی دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ یہ وزیر تو بن گئی مگر وزارتوں کے ساتھ جتنی جو اچھل کود کرنے اور کروانے والے چرمرے ہوتے ہیں جنہیں لوگ پرکز اور صوابدیدی اختیارات کہتے ہیں، ان سے ناواقف رہی۔ اسمبلی ممبروں کے حصوں میں کئی طرح کا کوٹا ہوتا تھا۔ بھرتی کے لیے الگ کوٹا، بندوق پستول کے لائسنس کے لیے الگ کوٹا۔ اِدھر اُدھر کے لائسنسوں اور اجازت ناموں کی شکل میں الگ پرچیاں۔ یہ سیدھی سادھی خاتون قلم کار ہونے کے ناطے ان سب سے نابلد رہی۔ ہولے ہولے اسے پتہ چلا کہ، ہیں، یہ بھی یہاں ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے سارے لائسنس اور اجازت ناموں کے کوٹوں کو ادھار کے ساتھ وصول کرتی، یہ اسمبلی کے فلور پہ ان کے خلاف تقریریں کرنے لگی۔

بشریٰ رحمان پیدائشی مقرر ہے۔ اسے اگر مائکروفون پہ کھڑا کر دیا جائے تو یہ مولویوں کی طرح مائیکروفون نہیں چھوڑتی۔ چاہے سننے والوں کی ساری نمازیں چھوٹ جائیں، یا ٹرینیں نکل جائیں۔ مگر اُسے بات کرنے کا سلیقہ ہے۔ ہنر ہے۔ عورتوں کے حقوق کی بات کرنا اسکا محبوب مشغلہ ہے۔ عورتوں کے حق میں جب یہ بات شروع کر دے تو پنڈال میں بیٹھی عورتوں کے چہروں پہ غازہ چڑھ جاتا ہے۔ وہ عورتیں جو تیز روشنی کے بھبکوں میں بھی مرجھائی دکھتی ہیں، اس کی ٹانک بھری تقریر سے یوں چمکنے لگتی ہیں جیسے کسی بیوٹی پارلر سے خصوصی نشست کروا کے نکلی ہوں۔ مردوں کے چہروں کو بھی یہ مرجھانے نہیں دیتی۔ کیونکہ جس طرف یہ آنکھ بھر کے دیکھ لیتی ہے، وہ مرد اگلے پانچ مہینے آئینہ دیکھنے میں گزار دیتا ہے۔

مجھے ساری باتیں بیٹھے بیٹھائے معلوم نہیں ہو گئیں۔

میں نے ان ساری باتوں کو بیتا ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور، اور پھر میڈیکل کالج کے دونوں میں جب میں افسانے

لکھتا تھا تو بشریٰ رحمان کی تصویریں ادبی جرائد اور اخبارات کے ادبی ایڈیشن میں چھپتی تھیں۔ اس وقت سچی بات ہے مجھے علم نہیں تھا کہ محترمہ مجھ سے کئی سال عمر میں بڑی ہیں۔ میں تو ان کی تصویروں کو دیکھ دیکھ کے فریفتہ ہوا کرتا تھا۔ میں نے کہانی کہنے سے بہت پہلے مصوری کا فن سیکھا تھا۔ اسی فن کی بدولت یہ ہوا کہ میں نے اپنے ہاسٹل میں بشریٰ رحمان کی تصویروں کے مختلف ٹکڑوں کی ڈرائنگ بنا کے دیوار پہ چپکا لیا۔ کہیں صرف آنکھیں۔ کہیں ناک، کہیں تھوڑی زیادہ ڈرائنگ بشریٰ رحمان کی آنکھوں کی ہوئی۔ اس کی آنکھیں ہیں بھی گم کر دینے والی ہیں۔ صرف بندے کو نہیں وقت کو بھی، جگہ کو بھی۔

ٹائم اینڈ سپیس کہیں آ کرا گر ملتے ہیں تو وہ بشریٰ رحمان کی آنکھیں ہیں۔

اتنی بڑی کہ جنوبی کوریا کی آدھی آبادی کی آنکھوں کو جمع کر لیں تو بشریٰ رحمان کی ایک آنکھ بنتی ہے۔ دوسری آنکھ کے لیے نارتھ کوریا کے آنکھیں جمع کرنی پڑیں گی۔ پھر ان آنکھوں میں جو ڈورے ہیں، ان میں جو رنگ پچکاریاں ہیں وہ اُچھلتی ہیں، ناچتی ہیں۔ بس اُسے دیکھتے ہوئے دیکھنا ہر ایک کے بس میں نہیں۔ اس لیے لگتا ہے کہ بشریٰ رحمان کے عہد کے سیاست دان سب اُسکے ہاتھوں ایسے پٹے ہیں کہ اب وہ اسے اسمبلی کا ممبر تو بنا لیتے ہیں، وزارت دینے سے ڈرتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں بشریٰ رحمان کھڑی ہو گئی وہاں بونوں کو کون دیکھے گا۔

بولنے لگے تو سب لاجواب، دیکھنے لگے تو سارے گونگے۔

ایک بار کئی سال پہلے، بشریٰ رحمان میرے گُرو ممتاز مفتی کے پاس آئی اور انکے چرنوں کو چھو کے بولی، سرکار مفتی جی میرے لیے کوئی دُعا کر دیجئے۔

مفتی جی بولے۔ دیکھ ایک تو تو حسین ہے، حسین بھی بدمعاشی کی حد تک۔

بشریٰ رحمان کے چہرے پہ روح افزاء کی ساری بوتل جیسے مونڈھی ہو گئی دودھ

کے ساتھ۔

بولی، اور

مفتی جی بولے، پر یہ بات تیرے حق میں نہیں، میرے حق میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ تو لکھاری ہے۔ مگر سن یہ بات بھی تیرے حق میں نہیں، کیونکہ یہاں لکھاریوں کو کمی قسم کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔

بشریٰ رحمان کے چہرے سے روح افزاء اتر گئی۔

مفتی جی پھر بولے، مگر تو کامیاب ہے۔ اس لیے کہ تو سیاست دان ہے اور سیاست دان بھی ایسی کہ جو جیتے اُس کے ساتھ، تیری حکومت رہنی ہے، حکومت چاہے کوئی کرے۔ جا موج کر۔

بشریٰ رحمان کے بارے میں اتنا کچھ میں نے بھی نہیں کہنا تھا، اگر میں اُسے قریب سے نہ دیکھتا۔ کہتے ہیں کسی کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ سفر کیا جائے۔ میں نے لاہور سے واہگہ، واہگہ سے لدھیانہ، لدھیانہ سے دہلی، دہلی سے جلندھر، جلندھر سے لدھیانہ، لدھیانہ سے امرتسر اور امرتسر سے لاہور تک پورا ہفتہ بشریٰ رحمان اور اس کے بیٹے حسن کے ساتھ گزرا۔ سفر کے دنوں میں تو بشریٰ رحمان کو احساس ہوا کہ میں ان کے بیٹے حسن پہ فریفتہ ہو گیا ہوں۔ ان پہ توجہ کم ہے۔ سچ بھی تھا اور نہیں بھی۔ سچ یوں کہ بشریٰ رحمان کا بیٹا حسن صفت میں ایسا لاجواب انسان ہے کہ جو اُسے ملے اس کا یہ ہو جاتا ہے۔ عقل وخرد سے مالا مال، پروقار، دلکش شخصیت کا مالک۔ اور آج کی نئی پود سے صدیوں پُرانا۔ اصلی سونا۔ مگر یہ سب کمال تو بشریٰ رحمان کا ہے۔ جس نے اس کی ایسی تربیت کی۔ اسے دنیا میں کامیابی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی قدروں کا پابند کیا۔

اس سفر کے دوران میں نے بشریٰ رحمان کی شخصیت کے بہت سے دلکش انداز

دیکھے۔ ایک تو وہ پکی سچی دیس بھگت، سولہ آنے کھری ہے۔ مجال ہے جو کوئی اُسکے منہ میں اپنی کوئی بات ڈال سکے۔ ایک بار ایک مشاعرے میں دہلی کے ایک بڑے پنڈال میں ایک شاعر 1947ء کی تقسیم کے حوالے سے اپنی غزل سنا رہا تھا

''نہ تم خوش ہو۔

نہ ہم خوش ہیں''

بشریٰ رحمان مسکرا کے بولی، مگر ہم تو خوش ہیں۔

وہ دونوں ملکوں کے درمیان تمام تر تنازعات امن و راستی سے میز پہ بیٹھ کے حل کرنے کی حامی ہے۔ کئی بار وہاں کے زعماء اور پریس والے ان کا پوائنٹ آف ویو لینے کے بعد مجھ سے پوچھتے آپ اپنی رائے دیجئے۔ میں صرف یہی کہتا، جو بشریٰ رحمان نے کہا ہے میں اس سے ایک انچ بھی کمی یا زیادتی نہیں کر سکتا۔ میرا موقف بھی یہی ہے۔

بشریٰ رحمان کے بزرگ جہاں سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے وہیں وہ چشتیہ اور مجددیہ سلسلوں کے بھی فرماں بردار رہے۔ دہلی سے لدھیانہ آتے ہوئے راہ میں سرہند شریف آتا ہے۔ وہیں مجدد الف ثانیؒ کا مزار ہے۔ بشریٰ رحمان کہنے لگی میرے ابا کئی مہینے مجدد صاحب کے دربار پہ چلہ کاٹتے رہے۔ آخر خرقہ پایا اور آ گئے۔ میرا دل خود بھی چاہتا تھا کہ سرہند رکیں اور مجدد صاحب کو سلام کریں۔ مگر سفر کی تھکن ایسی غالب تھی کہ ہر کوئی جلد سے جلد لدھیانہ پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر مجدد صاحب نے ہمیں روکنا ہوگا تو روک لیں گے۔

وہی ہوا۔

عین سرہند آتے ہی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ہم سب اتر آئے۔ ڈرائیور پہیہ بدلنے لگا۔ میں نے بشریٰ رحمان سے کہا،

آپ کے ابا کا چلہ آج بھی موثر ہے۔ دیکھیں مجد د صاحب نے آپ کو روک لیا ہے۔

بولی چائے بھی پلائیں گے۔

میں نے کہا، کیوں نہیں

قریب ہی ایک کھوکھے سے ہمیں گرم گرم چائے مل گئی۔

سفر میں میری دوستی بشریٰ رحمان کے بیٹے حسن سے، بہت گہری ہو گئی۔

لدھیانے سے دہلی کی طرف کا سڑک سفر سات آٹھ گھنٹوں کا تھا۔ آتے ہوئے بھی، جاتے ہوئے بھی۔ بشریٰ رحمان نے اپنے برابر کی نشست سے اپنے بیٹے کو اٹھا کے مجھے بٹھا دیا۔ سارا راستہ میں انہیں سنتا رہا۔ راہ میں رُکتے، کھاتے، پیتے۔ پھر چل پڑتے۔ جلندھر میں ایک بہت بڑے ہندوستانی میڈیا ٹائکون نے ہماری ضیافت کی۔ ہم سب کو تحائف بھی دیے۔ انکے تین اخبار چھپتے ہیں۔ ہندی، اُردو اور گرومکھی میں۔ بشریٰ رحمان کا ایک ناول قسط وار انکے اخبار میں چھپتا ہے۔ اس کیسری گروپ آف نیوز پیپرز کے مالک وجے چوپڑا نے ایک واقعہ سنایا۔

بولے۔

ایک بار اخبار کے ہاکروں نے ہڑتال کر دی۔ ہمیں اخبار گھر گھر پہنچانا مشکل ہو گیا۔ اسی دوران جلندھر شہر کے عین بیچوں بیچ عورتوں کا ایک جلوس ہاتھوں میں رسوئی کی ڈوئیاں، کفگیر اور بیلنے لیکر ہمارے ہاکروں پہ پل پڑا کہ ہمیں آج کا اخبار دو۔ اس اخبار میں بشریٰ رحمان کے ناول کی قسط ہے۔ پورا ہفتہ ہم نے آج کا انتظار کیا ہے۔ آج کا اخبار لاؤ۔

وجے چوپڑا بولا، آج پہلی بار کسی کو یہ بات بتائی ہے۔ بشریٰ رحمان کے چہرے پہ یہ بات سن کے جو روشن تمتماتا اطمینان ابھرا، وہ ایک قلمکار اپنی کتاب کی ایسی

پذیرائی کے بعد ہی محسوس کر سکتا ہے۔ دوسرے سب بھی مسکرانے لگے اور داد دینے کے انداز میں بشریٰ رحمان کو تکتے گئے۔ وجے چوپڑا، ڈاکٹر کیول دھیر سے کہنے لگے، اگلے سال میں یہاں ایک میگا میڈیا فیسٹول کر رہا ہوں۔ پاکستان سے میرا ارادہ ہے دو مہمانوں کو بلانے کا۔ ان دونوں کی خطے کے امن کے لیے بڑی خدمات ہیں۔

سب غور سے سننے لگے۔

وجے چوپڑا بولا، ایک تو آپ کے نواز شریف ہیں۔ انہوں نے ہمارے اٹل بہاری واجپائی جی کے ساتھ امن کے لیے بڑی سنجیدہ کوشش کی تھی۔ سب نے سر ہلایا۔

دوسرے ابدال بیلا ہیں۔ جنہیں میں بلانا چاہتا ہوں۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔

وجے چوپڑا میرے طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر کیول دھیر سے بولے، انہوں نے صدیوں کے اتہاس اور ہمارے قدیمی کلچر کے حوالے سے جو دنیا کا سب سے بڑا شاہکار ادبی ناول لکھا ہے جسے آپ نے ہندی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کی یہ خدمات بھی کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ میں دل ہی دل میں پریشان ہو گیا۔ نواز شریف صاحب نے تو شاید میرا ناول دیکھا بھی نہ ہو مگر انڈیا کے سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال صاحب نے دہلی میں مجھے اور بشریٰ رحمان کو اپنے گھر پانچ جنپت نیو دہلی میں چائے پہ بلایا۔ بانوے سال کی عمر میں وہ ایک نحیف کمزور اور بیمار آدمی تھے۔ مگر چونکے خود صاحب کتاب اور ایک عالمی علمی شخصیت ہیں اسی لیے شاید ان کے دل میں ادیبوں کی عزت ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک میں اور بشری رحمان ان کی سٹڈی میں اُنکے ساتھ رہے۔ اس دوران انہوں نے میرے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' سے کچھ اقتباس بھی مجھ سے سنا۔

بشری رحمان کہنے کو آج کل نواز شریف کی پارٹی کے دوسرے دھڑے میں

ہے، مگر دل ہی دل میں وہ نواز شریف کی مداح ہیں۔ کئی بار بشریٰ رحمان نے کہا بھی کہ نواز شریف کی حکومت میں رہتے ہوئے ملک اور خطے کے لیے کچھ تعمیری کام کرنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر کیول دھیر سے بشریٰ رحمان کا قدیمی سمبندھ ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر بشریٰ رحمان کو اپنی بہن مانتے ہیں اور یہ انہیں بڑے بھائی کا درجہ دیتی ہے۔ انہی بڑے بھائی نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنا رکھا ہے۔ انہوں نے ہی میرے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' اور چھ ناولوں کو ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ میری لکھی ایک ایک لائن کو کئی کئی بار پڑھا اور پھر اسے ہندی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ سارے ناول لاہور کے سنگ میل پبلشرز نے ہی چھاپ دیے۔ یوں اس ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کے دنوں میں دونوں ملکوں میں برسوں سے بند دروازہ کھلنے کا سمے آ گیا۔

واپسی پہ ہم سب کو چھوڑنے ڈاکٹر کیول دھیر ساتھ آئے۔ راہ میں امرتسر میں ہم کچھ دیر گولڈن ٹیمپل کی یاترا کے لیے رُک گئے۔ واہگہ پہنچے تو دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کیول دھیر محبت کے دیوتا ہیں۔ کمر کا اپریشن ہو چکا ہے۔ دل کا پرانا عارضہ ہے۔ شوگر کی تکلیف ہے۔ عمر بہتر سال ہے۔ مگر وہ بھاگے بھاگے اِدھر سے اُدھر پھرتے رہے۔ آخر تھک کے بیٹھ گئے۔

بولے، ابدال لگتا ہے آج دروازہ نہیں کھلتا، واپس امرتسر جانا پڑے گا۔

میں نے تھپکی دی اور کہا نہ بھاء جی

''دروازہ کھلتا ہے'' کے مصنف کے لیے دروازہ بند نہیں ہوتا، ان شاء اللہ، کھل جائے گا۔

ہندوستان بارڈر والے بھی اپنی جگہ سچے تھے۔ پینسٹھ سال سے چلا آتا قانون تھا، سہ پہر تین بجے جب دروازہ ایک بار بند ہو جائے، دونوں طرف کی پریڈ شروع ہو

جائے تو پھر یہ صرف اگلے دن ہی کھلتا ہے۔ آخر ہندوستان والوں نے یہ شرط رکھی کہ اگر پاکستان کی طرف سے اجازت مل جائے تو ممکن ہے کہ دروازہ کھلتا ہے۔ مجھے علم تھا ، پاکستان بارڈر پہ جو اس وقت انچارج تھا، وہ میری کتابوں کا مداح تھا۔ اُدھر سے آتے سمے اس نے بہت محبت سے مجھے رخصت کیا تھا۔ میں نے انڈین کرنل کو کہا، آپ ہماری طرف یہ پیغام بھیجیں کہ "دروازہ کھلتا ہے" کے مصنف ابدال بیلا کو واپس آنا ہے، دروازہ کھولیں۔

تھوڑی دیر بعد پاکستان کی طرف سے کئی لوگ دروازہ کھولنے پہنچ گئے۔ ہندوستان کی طرف سے بھی کوئی مشکل نہ آئی۔ طے ہو گیا کہ دروازہ کھلے گا۔ مگر پہلے طے شدہ پریڈ ہو جائے۔ وہ پریڈ ہم نے ہندوستان کی طرف بیٹھ کے دیکھی۔ بشری رحمان، انکا بیٹا حسن، ڈاکٹر کیول دھیر اور ہندوستانی کرنل۔ ہم سب کو پنڈال میں خواتین کمانڈو سولجر کے حلقے میں گارڈ آف آنر دیتے ہوئے لایا گیا، اور وی آئی پی کرسیوں پہ ہمیں بٹھا کے پریڈ دکھائی گئی۔ اس وقت میرے سامنے پاکستانی اور ہندوستانی سپاہی پریڈ کر رہے تھے۔ ایک طرف پاکستانی کراؤنڈ نعرے مار رہا تھا۔ پاکستان زندہ باد، اور ہم دوسری طرف جے ہند کہنے والوں کی سب سے اگلی قطار میں بیٹھے تھے۔ میرے کوٹ کالر پہ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لگا ہوا تھا۔ جب دروازے کے دوسری طرف سے آواز آتی، "پاکستان"، تو میں ہندوستان کی طرف بیٹھا بیٹھا ہاتھ اٹھا کے کہتا، "زندہ باد"۔ ہندوستان کا سارا کراؤنڈ مجھے پلٹ کے دیکھتا۔ جب ہندوستان کے سپاہی بھی اپنی خوبصورت ڈرل کرتے سمے ہمیں داد طلب نظروں سے دیکھتے تو میں دل کھول کے تالیاں بجاتا۔ پریڈ ہو گئی۔ دونوں طرف کے لوگ پلٹنے لگے۔ اور پھر وہ ہوا جو پچھلے پینسٹھ سال میں کبھی نہ ہوا تھا۔

بند دروازہ کھلتا ہے۔

بشریٰ رحمان، انکا بیٹا حسن اور میں وہ دروازہ پار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کے دونوں دیسوں کے درمیان لگی لکیر کے دونوں طرف پاؤں رکھ کے ہمیں گلے لگا کے رخصت کرتے ہیں۔ ہم پاکستان کی سرزمین پہ پاؤں رکھتے ہیں۔

واہگہ بارڈر پہ جب بشریٰ رحمان اپنے بیٹے حسن کے ساتھ، جسے میں محبت سے سینئر کہتا ہوں، رخصت ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا، بشریٰ جی، جیسے ہندوستان میں اتنی قربت سے ملتی رہی ہیں، ایسے ہی کبھی کبھار پاکستان میں بھی مل لیجئے گا۔

وہ جی کھول کے مسکرائی۔ حسن قہقہے سے ہنسنے لگا، لیکن بات وہی ہوئی۔ ہندوستان سے لوٹے سال ہونے کو آیا، کہنے کو کئی بار ٹیلی فون پہ بات ہوئی لیکن ان سے ملاقات نہ ہو پائی۔ لگتا ہے کبھی ملک سے باہر کسی اجنبی دیس میں ان سے دوسری تفصیلی ملاقات ہوگی۔ رانی کنگن بھرس اور بابا حاجی شیر کی درگاہ کو انہوں نے کنگن پور تو سمجھا ہے، مگر کافی عرصے سے اُدھر بھی اُن کا جانا نہیں ہوا۔

o

پیا دیکھن کی آس......اظہر جاوید

لدھیانے سے بلاوا آیا، تو میں زمین سے ڈھائی انچ اوپر چلنے لگا۔ اس کی تین وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ لدھیانہ میری ماں کا شہر ہے۔ میرے ابا جی کا گاؤں ''ماؤ میووال'' لدھیانے سے دس میل پرے جالندھر ضلعے میں ہے۔ اسی گاؤں کے ''سائیں بگو شاہ'' میرے دادا کے بھائی ایک عظیم روحانی بابے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی، کہ اس سفر میں اظہر جاوید میرا اہم سفر طے ہوا تھا۔ لدھیانے کی طرف سفر میرے لیے اپنے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کی طرف کا سفر تھا۔ لدھیانہ اس ناول کا مرکزی شہر ہے۔ جیسے پرکار کی نوک رکھ کے دائرہ لگایا جاتا ہے، ایسے ہی لدھیانہ پہ پرکار رکھ کر اگر سارک کے آٹھ ملکوں کا دائرہ لگایا جائے تو ''دروازہ کھلتا ہے'' کا سارا علاقہ بنتا ہے۔ اس شہر کو برسوں میں نے سنا، سوچا اور لکھا۔ امی جی اور ابا جی سے سنے قصوں کا سارا کاروان یہاں رکا پڑا تھا، جسے لکھ دیا۔ وہ کہانیاں سنا کے چلے گئے۔ ان کی روحوں سے ان کے جسم جھڑ گئے۔ مگر ان کی آنکھوں سے دیکھن سے جو محبت بھرے ستارے چمکا

کرتے تھے۔ وہ ستارے ادھر ہی رہ گئے۔ وہ ستارے میں نے لکھے۔ زندگی کے باہر جو بھی موسم رہا، یہ ستارے نہ او جھل ہوئے۔ کسی بادل، دھوپ، دھول اور طوفان سے یہ ستارے نہ گرے نہ چھپے۔ یہ چمکتے رہے۔ راہ دکھاتے رہے۔

''پیا دیکھن'' کی آس والے یہ ستارے عجیب ہوتے ہیں۔ (ان پہ نگہ پڑتے ہی ان کی کیمسٹری بدلنے لگتی ہے) آنکھ کے شیشے کو یہ ایک لمحے کے سوویں حصے میں بدل دیتے ہیں۔ شیشے پہ ہیرے کی چمک کا لشکارا ابھرتا ہے۔ ہیرے کی کنی جھلملاتی ہے۔ لمحے کی ذرا سی بوند میں یہ اندر باہر کے سارے موسم بدل دیتے ہیں۔ موسموں کی سختیوں سے جھلسی روح، جیسے گنگا اشنان کر لیتی ہے۔ تیز دھوپ چبھنا بند کر دیتی ہے۔ برف گلیشئر میں جمی ہوئی اعصابی تاریں جگنو شرارے چھوڑنے لگتی ہیں۔ طوفان اتر جاتے ہیں۔ زلزلے تھم جاتے ہیں۔ سونامی پلٹ جاتا ہے۔ اندر کی روح لمحہ بھر میں یوں تر و تازہ ہو جاتی ہے جیسے ابھی اس نے جنم لیا ہو۔ معصوم ہلکی اور لطیف۔ خوش بختی سے میرے نصیب میں ایسی کئی آنکھیں آئیں۔ یہ آنکھیں میری ماں کی تھیں۔ مجھے تکتیں، میں پیدا ہو جاتا۔ جی اُٹھا۔ یہی آنکھیں مجھے اپنے گرو ممتاز مفتی کی نگہ میں نظر آتی تھیں۔ میں ان کے سامنے جاتا تو ہیروں کی طشتری پہ پڑا رومال جیسے سرک جاتا۔ جگمگ ہو جاتا۔ دوسرے شہر میں رہتی اپنی بہن کی آنکھوں میں بھی ایسی چمک مجھے دکھتی ہے۔ میرے چھوٹے بھائی بلال کے چہرے پہ بھی امی جی کی آنکھیں ہیں۔ ایسی ہی چمک مجھے اپنے لیے ہمیشہ جہاں ٹھہری ہوئی منتظر ملتی وہ اظہر جاوید کی آنکھیں تھیں۔ اظہر جاوید کی آنکھوں میں اپنے دوستوں کے لیے ممتا والی، چمک تھی۔ پرانی انارکلی سے ہوتا ہوا، بھگوان سٹریٹ میں ''تخلیق'' کے کھلے دروازے پہ تنے پردے کے بیچ دروازے پہ دستک دیتا۔ دروازہ کھلتا ہے، پردہ ہٹتا ہے۔ میں دو قدم اس کے دفتر میں رکھ کے سلوٹ مارتا ہوں اور اظہر جاوید ''بسم اللہ'' کا نعرہ مارتا ہوا، اپنی کرسی

سے اٹھتا ہے۔ بازو کھول کے میری طرف لپکتا ہے۔ میں جھک کے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ وہ بازو پھیلا کے مجھے لپیٹ لیتا ہے۔ میرا ماتھا چومتا ہے، سر سے پیر تک جیسے جھوم جاتا ہے۔ ''تیرا آنا مکہ تے مدینہ'' ''بسم اللہ''۔ کتابوں، رسالوں اور محبت بھرے خطوں کے انبار میں اس کا میز تھا، میز کے پیچھے کرسی جب اس کا کوئی دوست اس کے دفتر آ گیا، وہ اپنی کرسی کو جیسے بھول گیا۔ کبھی اٹھ کے کسی شیلف سے کوئی کتاب نکال کے دے رہا ہے۔ کہیں جھکا رسالوں کے بنڈل کھول کے کوئی رسالہ دکھانے یا دینے کے لیے ڈھونڈ رہا ہے۔ کونے میں پڑے چائے کے برتن اٹھا رہا ہے۔ کبھی اٹھ کے گئے ہوئے دوستوں کے کھائے ہوئے سموسوں کی پلیٹ دھونے بغلی دروازہ کھول کے جا رہا ہے۔ چائے کے کپ دھو کے لا رہا ہے۔ پیالیوں میں چائے ڈال رہا ہے بسکٹ والی پلیٹ آگے رکھ رہا ہے۔ اسے کسی دوست کے آنے سے ایسا چاؤ چڑھ جاتا، جیسے ماں جی کو کبھی کبھار، مدتوں بعد میکے سے آئے کسی پروہنے کو دیکھ کے چڑھتا تھا۔ پھر میری ماں بھی رسوئی اور دالان میں بھاگتی پھرتی۔ میں روحوں کے جسموں میں حلول کے نظریے کو ماننے والا تو نہیں، مگر ایسی کیفیت کا مشاہدہ کرنے والا ضرور ہوں۔ مجھے اپنی کئی عزیز، ہستیوں کی روحوں میں اپنی ماں کی روح کے منتقل ہونے کا احساس ہوا ہے۔ جب کبھی کوئی ایسی ہستی، خدا کی طرح، لاگ اور لگاؤ سے بالاتر ہو کے، اپنی روح کے من اندر، بے لوث چاہت کی موم بتی جلاتی ہے، تو اس کی آنکھوں میں ہیروں کی پیوند کاری ہونے لگتی ہے۔

فروزاں بتیاں صاف جلتی نظر آ جاتی ہیں۔

ایسی آنکھوں سے بہتر کوئی راہ دکھانے والی روشنی نہیں۔ ایسی آنکھوں کا ساتھ ہو تو راہ گم نہیں ہوتی۔ ایک راہ سے ہزار رستے نکلتے ہیں۔ ہر رستہ کھلا، ہر راہ شاندار، میں نے بچپن میں، جوانی میں اپنی ماں کے ساتھ کئی سفر کیے۔ بڑے رستے کھلے، کھلے رستے

ملے۔ مفتی جی کے ساتھ بھی دور دور تک جانا ہوا۔ دور راہوں کی نشاندہی ہوئی۔ اس بار اظہر جاوید کے ساتھ سرحد پار اس شہر جانے کا سندیس ملا، جدھر کی مٹی میری ماں کی روح نے اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ میرے قدم زمین سے ڈھائی انچ اوپر کیوں نہ اٹھتے۔

لدھیانے سے کیول دھیر کا جب بھی فون آتا، دوسرے فقرے کی پہلی بات وہ یہی کہتا۔ ''ابدال، اظہر جاوید کو ساتھ لے کر آنا۔''

''کیوں نہیں، بھاجی، وہ ساتھ ہوں گے۔''

''یار! تیرے پاس سارک ویزہ ہے، بشریٰ رحمان کے پاس بھی یہی ہے۔ بشریٰ اعجاز کو بھی مسئلہ نہیں ہونا۔ فرحت بھی لگوا لے گی۔ یار، دیکھ، اظہر جاوید کو مشکل ہونی ہے۔'' دیکھ! میں اظہر جاوید کو جانتا ہوں۔ وہ درویش منش ہے۔ بڑا خوددار ہے اس نے کسی کو کہنا نہیں۔ دیکھ! وہ رہ نہ جائے۔ اسے ساتھ لے کر آنا۔

ڈاکٹر کیول دھیر لدھیانے کا ''بادشاہ'' ہے۔ میری ماں کے شہر کا رلجہ۔ پتہ نہیں لدھیانے کی مٹی کوئی انوکھی مٹی ہے۔ اس کی کوئی خاص خصوصیت ہے۔ میری ماں بھی اسی طرح کیا کرتی تھیں۔ ویسے تو انہیں زندگی بھر کبھی مجھ سے کوئی ایسا کام نہ پڑا، جس کے لیے انہیں مجھے کچھ کہنا پڑے۔ ایک بار، کہیں ان کی گلی کی کوئی عورت کسی کام سے ان کے پاس آ گئی۔ اس عورت کو اپنے بیٹے کے لیے شاید نوکری چاہیے تھی یا کوئی من پسند پوسٹنگ۔ کچھ ایسا ہی چھوٹا موٹا کام تھا۔ کام بھی میرے شہر میں۔ وہ عورت تھی پیچھے لدھیانے کی۔ کہیں سے اسے میرے بارے میں خبر ملی ہو گی کہ فلاں شہر کے فلاں دفتر میں ہے۔ بس جی امی جی کے پاس پہنچ گئی۔ اب جب کبھی امی جی سے فون پہ بات ہوتی تو دوسری بات، کیول دھیر کی طرح یہی کرتیں'' پتر! میری پڑوسن کے بیٹے کا مسئلہ حل کیا؟ پتر! تیرے شہر سے اسے تیری وجہ سے آس ہے۔ اس کا مان نہ توڑنا۔ اس کا کام کرا دینا۔''

''جی، امی جی۔'' میں فون پہ سر جھکا دیتا۔

کیول دھیر ٹیلیفون پہ کہتا،

''ابدال، تو اسلام آباد میں بیٹھا ہے۔ اظہر جاوید کا ویزہ تو نے خود جا کے سٹیمپ کروانا ہے۔''

''سمجھ گئے نا!''

''جی، بھا جی۔ میری ان سے بات ہو گئی ہے۔ وہ آئیں گے میرے پاس۔''

بات ہوئی بھی تھی کئی بار۔ ایک بار اظہر جاوید کہنے لگا۔ ''یار مینوں نال لے جائیں۔!''

''سرکار، آپ کے ساتھ جانا ہی تو میرا اعزاز ہے۔'' میں ممیا کے بولا۔ کہنے لگا!

یار سچی بات یہ ہے۔ تیرے ساتھ جانے کا سن کے حوصلہ ہو گیا۔ پہلے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ تو جانتا ہے، بیمار آدمی ہوں۔ لوگوں کو اپنی بیماری کی تفصیل نہیں بتاتا۔ وہ سمجھتے ہیں، خود سری ہے، تو ڈاکٹر ہے، اپنے بیمار کو جانتا ہے۔ بس اب تسلی ہے،'' میں کہتا

''آپ پاسپورٹ بھیجیں۔''

وہ کہتے ''میں خود آؤں گا، پاسپورٹ سمیت۔

دن تو تھوڑے رہ گئے ہیں۔''

''ہاں دن تو تھوڑے ہی ہیں۔''

''اتنے بھی تھوڑے نہیں، آپ حوصلہ کر کے آ جائیں

ادھر حوصلہ ہی تو نہیں ہوتا۔''

''کریں نا، حوصلہ۔''

''تو دعا کر دے۔''

''میں تو دعا کروانے والا ہوں۔''

''تیریاں خیراں، میں فون کر کے آؤں گا۔''

میں ہر فون پہ ان کا انتظار کرنے لگا۔

اس دن سارا دن دفتر میں کچھ عجیب مصروفیت رہی۔ سیل فون میں نے بند کر کے جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے فون آن کر دیا۔ ٹرن ٹرن کر کے، کئی ایس ایم ایس فون میں گرنے کی آواز آئی۔ میں گاڑی چلاتا رہا۔ سوچا گھر جا کے پیغام پڑھوں گا۔ پھر ایک گھنٹی بجی۔

میں نے سٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کے، فون دیکھا۔

کیول دھیر کا نام چمک رہا تھا۔

''جی بھا جی''

مجھے پتہ تھا اب سلام دعا کے بعد انھوں نے دوسری بات اظہر جاوید کی کرنی ہے۔ بڑا حیران ہوا جب انہوں نے پہلی بات ہی اظہر جاوید کر دی۔

اظہر جاوید کا نام سن کے میں فوراً بولا۔

''آپ فکر نہ کریں، بھا جی، انہیں لے کر آؤں گا۔''

''وہ تو چلا گیا!

تجھے پتہ نہیں چلا۔''

''ہیں!''

''کس بات کا؟''

میرا دل ایک دم سے ان کے لہجے کی اداسی اور دکھ سن کے ڈوبنے لگا۔ جیسے بھاگتی کشتی کے پیندے کا کوئی پھٹہ کھسک جائے۔ اس میں ایک دم سوراخ ہو جائے۔ وہ پانی سے بھرنے لگے اور ڈوبنے لگے۔

''تجھے اظہر جاوید کی خبر نہیں ملی؟''

کیول دھیر کی آواز میں سسکیاں تھیں۔ جیسے روتے روتے بول رہا ہو۔ بولتے

بولتے رو رہا ہو۔ میں سہم گیا۔ جیسے اونچے گول جھولے پہ جھولتے ہوئے بندہ ایکا ایکی میں اوپر سے نیچے تہہ میں آ لگے۔ میرا دل کنویں میں گرنے لگا۔

میں مری روڈ پہ گاڑی چلا رہا تھا۔ چاندنی چوک کے فلائی اُوور کی تعمیر کی وجہ سے ٹریفک نچلی سڑک پہ جام تھی۔ کوئی دو گز گاڑی آگے بڑھتی تو پھر بریک لگانا پڑتی۔ اب کیول دھیر کی فون پہ بات سن کے دل کی دھڑکن رک رک کے چلنے لگی۔ میں سہم گیا۔ کوئی بہت ہی دکھ بھری خبر سننے کے لیے روح کے اندر لرزا طاری ہو گیا۔

گاڑی خود بخود جس رفتار میں رینگ رہی تھی، رینگتی رہی،

کیول دھیر کی سسکتی آواز آئی۔

''یار، اظہر جاوید فوت ہو گیا۔''

''ہیں؟''

''میری گاڑی اگلی گاڑی سے ٹکرانے لگی، بریک لگی اور ٹھاہ سے پچھلی گاڑی میری گاڑی کے بمپر سے آ لگی۔

''ہیں یہ کیا ہوا!!''

میں گاڑی روک کے سٹیرنگ پہ سر رکھ کے بیٹھ گیا۔

ٹاں، ٹاں، پیچھے ہارن بجنے لگے۔

میرے اندر کے سارے فیوز اڑ گئے۔

سارا شہر ایمبولینس کی چیخ بن گیا۔

میرا خون برف کی ڈلیاں بن کے رگوں میں جمنے لگا۔

یہ کیا ہوا!

ہیں۔

اظہر جاوید!

میرا یار، میرا بابا،

درویش بادشاہ،

چلا گیا۔

اس طرح، چپ چاپ، اور شہراب چیخ رہا ہے۔

اس سے تو ابھی جی بھر کے باتیں بھی نہ ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ تو مجھے لدھیانے جانا تھا۔ کتنی باتیں میں نے سوچی ہوئی تھیں، راہ میں سفر کرتے کرتے یہ پوچھوں گا۔ ابھی پچھلے دنوں میرے اکٹھے چھ ناول سنگِ میل پبلشرز نے چھاپے۔ ان میں ''ماؤ میوو ال'' نام کے ناول کا انتساب میں نے اظہر جاوید کے نام کیا تھا۔ کچھ دن پہلے میں نے فون پہ انہیں انتساب کی عبارت پڑھ کے سنائی تھی۔

''ماؤ میوو ال ناول

بھگوان سٹریٹ کے کرشنا

اظہر جاوید

کے نام

جسے ہر صاحباں سوڈی شاہ مانتی ہے۔ مگر اس کے ٹالنے سے ٹل جاتی ہے۔''

اظہر جاوید یہ سن کے بہت ہنسا۔ ڈھیروں دعائیں دیں۔ بولا، صحیح کہتے ہو۔ سب صاحبائیں ٹل جاتی ہیں۔ میں بریک پہ پاؤں رکھے، ایمبولینس کی طرح چیختے شہر کی شاہراہ پہ گم ہوا سوچ رہا تھا۔

یہ کون سی صاحباں، اظہر جاوید کے سامنے آ گئی۔ جو نہ ٹلی۔

وہ چلا گیا۔

میں نے تو اسے انتساب والا یہ صفحہ بھی نہیں دکھایا تھا۔ ابھی دکھانا تھا۔ فون پہ انہوں نے کہا بھی۔ ناول بھیج دے۔ چھ کے چھ۔ میں نے کہا، آپ کے دو قدم پہ

سنگ میل کا دفتر ہے۔ پورا سیٹ منگوا لیں۔ میں افضال احمد کو فون کر دوں گا۔ پھر ''ماؤ میوو ال'' ناول پہ آپ کے لیے لکھنے والی بات تو اندر چھپی ہوئی ہے۔ سارے ناول میرے ساتھ ہوں گے۔ لاہور سے لدھیانے کا سفر ساڑھے تین گھنٹے کا ہے۔ تسلی سے باتیں ہوں گی۔ مجھے کیا پتہ تھا انہیں اتنی جلدی ہے۔

بیمار تو تھے وہ، مجھے پتہ تھا۔

جن دنوں میری ملتان پوسٹنگ تھی۔ میں ان کے لیے دوائیاں لے کر آتا۔ انہیں میری ماں کی طرح دل کا عارضہ تھا۔ دوائیاں بھی کم وبیش وہی تھیں۔ امی جی کے جانے کے بعد وہ دوائیاں کبھی لی ہی نہیں۔ چونکہ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ دوائیوں کے میرے پاس ڈھیر لگے تھے۔ جب کبھی لاہور جاتا، تو اظہر جاوید کے لیے دوائیوں کا ایک لفافہ لے جاتا۔ ادھر جانے میں دیر ہوتی تو لفافہ پوسٹ کر دیتا۔ دوائیاں اس کے دفتر پہنچ جاتیں۔ ایک بار میں اس کے دفتر گیا۔ باتوں باتوں میں اسے بتانے لگا کہ نئی ذمہ داریاں عجیب سی ہیں۔ ملتان ڈویژن کی سپیشل مونیٹرنگ ٹیم کا انچارج بن گیا ہوں۔ ادھر کے ہسپتال، جیل خانے، لائبریریاں، میونسپل کارپوریشنز، محکمہ فوڈ سب پہ اختیار مل گیا ہے۔ بھاگ دوڑ میں لگا ہوں کہ کوئی بہتری ہو۔ پہلے مارشل لاء میں جسے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہتے تھے، اسے یہ نیا نام دیا ہے۔ ایک دن ملتان کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کو فون کر کے بلایا۔ کہا آتے ہوئے ملتان شہر کا نقشہ ساتھ لیتے آنا۔ اللہ جانے اس نے کیا سوچا ہوگا۔ نقشہ آ گیا۔ میز پر بچھ گیا۔ وہ ایڈمنسٹریٹر خود بھی دانشور آدمی تھا۔ بیرسٹر ظفر اللہ۔ شاید اسے خیال آیا، کہیں کوئی پلاٹ الاٹ کرانا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اس کا خیال پڑھ کے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا۔

''ممتاز مفتی کو جانتے ہو؟''

''بولا، جناب، انہیں بابا مانتا ہوں۔''

''کبھی اس کے لیے کچھ کیا، جسے بابا مانا؟''

''کیا کر سکتا ہوں؟ حکم کریں۔''

''میں نے میز پر پھیلے ہوئے ملتان کے نقشے پہ ہاتھ پھیرا اور کہا، کوئی ایسی سڑک بتاؤ، جس کا ابھی کوئی نام نہ رکھا گیا ہو۔''

''کیوں؟''

''شاید وہ سوچنے لگا ہو کہ سڑک کیسے الاٹ ہو سکتی ہے!''

میں نے کہا ''سڑک کا نام بدلنا ہے۔''

''کیا نام رکھنا ہے؟ اب۔''

''ممتاز مفتی روڈ۔''

اس نے ایک ایک کر کے شہر کی ساری سڑکوں پہ انگلیاں پھیریں۔ پھر کہنے لگا۔ ''یہ ایک بڑی سڑک ہے۔ وہاڑی روڈ۔ ملتان کی حدود میں کم و بیش پندرہ بیس کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ ملتان دہلی روڈ کہلوایا کرتی تھی۔ یہ ہوگئی اب، ممتاز مفتی روڈ۔ ٹھیک ہے؟

ٹھیک۔''

نوٹیفیکیشن ٹائپ ہو کے آ گیا۔

اس نے دستخط کر دیے۔

ایک اور عقیدت مند ممتاز مفتی کا ادھر بیٹھا تھا۔ وہ صنعت کار تھا۔ اس نے کئی لوہے کے بورڈ بنوا کے وہاڑی روڈ کے ہر چوک میں لگوا دیے۔ نیا نام ''ممتاز مفتی روڈ۔ نوٹیفیکیشن نمبر فلاں فلاں۔'' اسی شہر کے عین قلب میں، بہاؤالدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ کے درباروں کے درمیان، پرانے قلعے پہ ایک قدیمی لائبریری ہے۔ اس کی بات کی۔ کہ اسے بہتر بناؤ۔

کہنے لگا "لائبریری کا آدھا حصہ شہر کے ایک بڑے پیرزادے سیاست دان نے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ کسی قانون کچہری کو وہ نہیں مانتا۔ سال ہا سال سے آدھی لائبریری کی عمارت اس کے تصرف میں ہے۔"

میں اگلے دن جیپ میں بیٹھ کے ادھر گیا۔

مقبوضہ لائبریری میں بیٹھے بندے بلوائے۔

پوچھا "ادھر کیوں بیٹھے ہو؟"

"اتنے سال ہو گئے ہیں!"

"یہ تو اور بھی غلط بات ہے، مگر کیوں!"

وہ خاموش

پوچھا "اگر یہ تم لوگوں کی جگہ ہے تو دکھاؤ کاغذ۔"

وہ خاموش۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساتھ کھڑے صوبے دار سے دن پوچھا۔ صوبے دار بولا، سوموار۔ کہا "سنو۔ جمعرات تک تمہیں مہلت ہے۔ اپنا سامان اٹھا کے لے جاؤ۔ سرکاری لائبریری کے کمرے خالی کر دو۔"

پھر میں نے گردن موڑ کے، صوبے دار کو مخاطب کیا "صاحب۔ یہ چار کمرے دیکھ لیں، یہ آگے کا دالان۔ یہ باہر کا لان۔ اس دیوار سے لے کر یہاں دروازے تک۔ یہ جمعرات تک خالی ہونا چاہیے۔ جمعرات سہ پہر آپ ٹرک لے کر ادھر آ جائیں۔ اگر کوئی سامان یا کوئی بندہ اس جگہ پر نظر آ جائے تو اسے دھیان سے اٹھا کے سڑک پہ رکھ دیجیے گا۔"

"سمجھ گئے؟"

"جی۔ سمجھ گئے۔"

''کوئی شک۔''

''کوئی نہیں۔''

تھینک یو۔ کہہ کے میں آ گیا۔ جمعرات کی صبح لائبریرین کا فون آیا، جناب کرنل صاحب، وہ لائبریری کے کمرے بدھ، ہال اور سارا لان بدھ کی شام ہی ''خالی کر کے چلے گئے۔ آپ تشریف لائیں۔ لائبریری ہمیں پوری مل گئی۔ نئے کمروں میں کتابیں پھیلانے لگے ہیں۔ آپ آئیں گے آج!'' میں پہنچ گیا۔

لائبریری کو ملے نئے کمروں کو ریڈنگ روم بنا دیا گیا۔ ایک ریڈنگ روم کے باہر تختی لگ گئی، ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' روم، دوسرا کمرہ ''ماہنامہ افکار ریڈنگ روم'' تیسرے کمرے پہ تختی تھی ''ماہنامہ تخلیق ریڈنگ روم۔'' لائبریری کے بڑے ہال کو ''ممتاز مفتی ہال'' بنا دیا گیا۔ لیڈیز ریڈنگ روم کا نام میں نے دیا۔ ''پروین شاکر روم'' اور ریفرنس کتابوں والے کمرے کے باہر تختی پہ لکھوایا ''قدرت اللہ شہاب روم''۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر یہ سارے نام کھد کے آ گئے۔ سیمنٹ کے ساتھ لگ گئے۔

اظہر جاوید کو یہ باتیں، یونہی چائے پیتے پیتے کہہ دیں۔ اظہر جاوید کی آنکھوں کے ستاروں کا چاند بن گیا۔ چاند بھی چودھویں کا۔ بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا، شاید میں اول فول بول گیا ہوں۔ شرمندہ ہو کے چپ ہو گیا۔

اگلی بار، جو ''تخلیق'' کا پرچہ ملا تو میں حیران۔ تخلیق کے ایڈیٹوریل ''اپنی بات'' میں اظہر جاوید نے اپنی ایک بات کہی صرف یہ کہ ''آج تک، چالیس سالوں تک میں نے کسی تاجور، کسی بادشاہ، کسی تخت یا کسی تخت نشیں کی مدح نہیں کہی۔ نہیں لکھی۔ آج یہ قسم توڑ رہا ہوں۔'' پورا ایڈیٹوریل اظہر جاوید نے مجھ پہ لکھ دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ سمجھ نہ آئے۔ یہ ہوا کیا۔ اتنی چھوٹی سی معمولی بات۔

اظہر جاوید نے ذرّے کا پہاڑ بنا دیا۔

وہ تو پہاڑوں کو ذرہ ذرہ کرنے میں مشہور ہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا۔

میں چونکہ اظہر جاوید کے لیے سر سے پاؤں تک احسان مندی میں بھیگا ہوا تھا۔ اس لیے اسی رات کئی صفحوں کا اسے ایک خط لکھا۔ پتہ نہیں عقیدت اور محبت میں اسے اور اس کے رسالے کے لیے کیا کیا لکھ گیا۔ اگلی بار جب رسالہ آیا تو دنیا جہان کے خط چھپے تھے، صرف میرا وہ خط نہیں تھا۔

میں نے فون اٹھا کے پوچھا۔

''سرکار! میرا خط ملا تھا؟''

''ملا تھا۔''

میں چپ۔

بولے ''تم پوچھنا چاہتے ہو گے کہ چھپا کیوں نہیں؟''

میں سمجھ گیا۔

اس دن مجھے سمجھ آئی۔ اظہر جاوید بہت وکھرا آدمی ہے۔ یہ آدمی تو اس ساری مدح سرائی اور القابات سے کہیں بلند ہے۔ یہ تو اپنے رسالے میں اپنی تعریف نہیں چھپنے دیتا۔

دوسرے ادبی پرچے اٹھا کے دیکھ لیں۔

ٹائٹل پہ مدیر کا نام۔ بلکہ مدیر اعلیٰ۔

اندر نام۔

مضامین کچھ اپنے لکھے ہوئے، کچھ اپنے اوپر لکھوائے ہوئے۔ کچھ اپنی شاعری، کچھ اپنی شاعری پہ ہوئی شاعری، خطوط بھی وہ چُن چُن کے چھپے ہوتے ہیں جن میں مدیر کے دشمنوں کی ہجو یا مدیر کی واہ واہ۔

یہ کیسا درویش ہے!

اسے اپنا مفاد بھی عزیز نہیں۔

بازار میں بیس روپے ایک کوکا کولا بوتل کی قیمت ہے اور یہ تین مہینوں کی تپسیا کے بعد دو ڈھائی سو صفحوں کا پرچہ چھاپ کے۔ ایک ایک کہانی، ایک ایک شعر پڑھ کے، پروف ریڈنگ کر کے، چھپوا کے، بڑے لفافے میں ڈال کے، اوپر ہاتھ سے پتہ لکھ کے، ہونٹوں سے چوم کے خریدے ہوئے ٹکٹ لگا کے مفت بھیجتا ہے۔ پھر فون کر کے پوچھتا ہے۔ رسالہ ملا؟

یہ کیسی درویشی ہے!

میرا دماغ اسے سوچ کے ہل جاتا۔ جب کبھی فون کرتا۔ ادھر سے آں آں شوں شر کی آواز آتی۔ اسی شور سے اظہر جاوید کی آواز کہتی۔

''یار۔ رکشے میں ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد فون کرنا۔''

پتہ نہیں اس کی زندگی میں یہی آدھا گھنٹہ کیوں اتنا طویل ہو گیا۔ اس کی زیادہ تر زندگی رکشے اور ٹیکسی میں گزری، پتہ چلا آخری سفر پر جاتے ہوئے بھی وہ ٹیکسی میں سوار تھا۔ ذرا طبیعت بگڑی تو ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ٹیکسی منگوائی۔

ٹیکسی بھلا کتنا تیز دوڑ سکتی ہے!

اس کی زندگی میں بہت گوپیاں اور صاحبائیں آئیں۔

سب اس نے ٹال دیں۔

بس یہ آخری ''صاحباں'' نہ ٹلی۔

ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے، ٹیکسی میں سوار کی سواری وہیں چھوڑ کے، سوار کو لے گئی۔ ''یار جی! میرے ساتھ تو لدھیانے جانے کا وعدہ تھا؟''

''میری ادھر نہیں چلتی۔''

''آپ نے اپنی چلائی کہاں!''

''بس یار۔''

''ہم کدھر جائیں؟''

جانا اور کدھر ہے، سب ادھر ہی آئیں گے ایک دن۔

اس کے جانے کے بعد میں اس کے دفتر گیا۔ اتفاق سے لوڈ شیڈنگ کا وقفہ تھا۔ دروازہ کھلا تھا، پردہ تنا تھا، اندر اندھیرا، اس کی کرسی پہ ذرا سی روشنی کا ہیولہ تھا۔ دیکھا میز پہ پڑی ایک چھوٹی سی ایمرجنسی لائٹ جل رہی ہے۔ شاید، ایمرجنسی لائٹ کا بہانہ ہو۔ اس کی روح چمک رہی ہو۔ غم سے میرا دل کٹ گیا۔ بسم اللہ کہہ کے آنکھوں میں تاروں کی کہکشاں کی جوت جگانے والا چلا گیا۔

یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے سوچا۔

اندھیرے میں پڑے ایک صوفے سے ایک لڑکی اٹھی۔

سر! ''ویل کم''

''میں کھڑے کھڑے، اکھڑے اکھڑے سانسوں سے وہ کمرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس لڑکی کو کیول دھیر کی کتابوں کا ایک بنڈل دے کر کہا۔ یہ کتابیں لینے اظہر جاوید نے خود جانا تھا۔ نہیں جا سکے۔ کیول دھیر نے ان کا حصہ میرے ہاتھ میں دے دیا، کہ پہنچا دو۔ پہنچانے آیا ہوں۔

کچھ دیر میں خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اظہر جاوید کے لیے مغفرت کی دعا کی۔

دعا مانگ کے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، اللہ کی طرف کانی آنکھ سے دیکھ کے دل ہی دل میں کہا، اگر ایسے درویش بندے کو بھی جنت نہیں دینی تو پھر کسے دے گا؟

ایسا درویش۔ صورت سے بھی، سیرت میں بھی۔ لمبے ریشمی بال، مسکراتا محبتی چہرہ۔ ہیرے کی کنی والی چمکتی آنکھیں۔ سب پیا دیکھن کی آس بن گئیں۔ اعلی پائے

کا شاعر تھا۔ مگر شاعروں جیسا بیوپار کرنا نہ آیا۔ انشاء پرداز تھا۔ مگر اس سے شاہ کا قصیدہ نہ لکھا گیا۔ ایڈیٹر تھا، آدھ صدی تک اپنی ٹیم نہ بنا سکا، عجیب کپتان تھا۔ 42 سال اس نے "تخلیق" کی آبیاری کی۔

اک بے نیاز مالی کی طرح باغیچہ سنوارا۔

کسی پیڑ پودے میں اپنی ذات کی پیوند کاری نہیں کی۔

اپنی پہچان کی نرسری نہیں تیار کی۔

ہر رنگ، ہر خوشبو، ہر ذائقے کے پھل پھول اگائے۔

گلاب کیاریوں میں چھتر تھور تک پرے نہ کیا۔

ہر بوٹے کو پانی دیا۔

بوٹے کی ہر شاخ اور پتے کا منہ دھویا۔

پودے تناور ہو گئے، تو ان کے پھل پھول سے دور جا کے بیٹھ گیا۔ ان کا سایہ تک اپنے نصیبوں کی دھوپ کم کرنے کے لیے استعمال نہ کیا۔ بس پالے ہوئے جواں درخت کو دور بیٹھ کے دیکھتا رہتا۔ مسکراتا رہتا۔

دعائیں دیتا رہتا۔

ایسا بے نیاز مالی ہوا ہے کہیں؟

آخری سفر پہ جاتے سمے بھی کسی کو تردد نہ کرنے دیا۔

کسی سے تیمارداری نہیں کروائی۔

دوپہر تک دفتر تخلیق میں رسالے کا کام کیا۔

سینے میں درد بڑھ گیا تو ٹیکسی منگوا کے ڈاکٹر کی طرف نکلا۔

شاید، راہ میں اسے خیال آیا ہو، ڈاکٹر کو بھی کیا تکلیف دینی ہے!

ممکن ہے، اس نے بول دیا ہو۔

میں تیار ہوں، اللہ جی۔

بسم اللہ۔

اظہر جاوید جیسے بڑے لوگوں کے جانے کے بعد خیال آتا ہے۔ سمجھ آتی ہے، لوگ بندے کا بھگوان کیسے بنا لیتے ہیں۔

ایک دن میں نے اظہر جاوید سے کہا۔

''سرکار! میں نے آپ کی گلی کا نام بدلوانا ہے۔''

''اظہر جاوید سٹریٹ'' نام کا نوٹیفکیشن نکلوا کے لاتا ہوں۔''

تڑپ کے بولا'' دیکھ ایسا نہ کرنا۔''

''کیوں؟''

''دیکھ یہ ملتان دہلی روڈ یا دہاڑی روڈ نہیں ہے۔''

''پھر''

''اس کا نام جانتے ہو! بھگوان سٹریٹ ہے۔''

''بھگوان سے بدل کے انہوں نے رحمان سٹریٹ کیا ہوا ہے۔''

''پھر!''

''تو میری مان، بھگوان اور رحمان کی گزرگاہ میں میری پلیتی کو نہ لا۔ انہیں نہ چھیڑ۔''

میں ٹھنڈا ہو کے بیٹھ گیا۔

ایک بار میں نے ضد کی۔'' آپ پچاس سال کی'' اپنی بات'' کو جمع کر کے، کتابی شکل میں لائیں۔''

''خریدے گا کون؟''

میں اعلان کرتا ہوں، پہلا پورا ایڈیشن میرا ہو۔

چل ایک ایڈیشن ہوگیا، اب دوسرے کو بیچ کے کیا کرنا۔

میں پھر لاجواب ہوگیا۔

سمجھ نہ آئی یہ بابا کیا چیز ہے۔

بے نام سے لوگوں کو چھاپ کے ان کی واہ واہ کروا دیتا ہے۔ پھر خود بھی اس کے عقیدت مندوں کا سوانگ رچا کے اس کو رجھانے لگتا ہے، کئی کم ظرف ایسے بھی دیکھے جو اسی پارس سے چھوئے جانے کے بعد سونا بن کے، اسی میں کھوٹ نکالنے کی سوچ پال لیتے۔ کبھی کبھی میں کہہ دیتا۔ ''سرکار! اتنے دیالو بھی نہ ہوا کریں۔''

''کتنے تک کی اجازت ہے؟'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگتا۔

سمجھ ہی نہ آئی، یہ بابا کس مٹی کا بنا ہے۔

بندہ بندہ ہوتا ہے، خدا تھوڑی ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں سوچے ہی نا۔ بھئی اپنے لیے بھی کچھ سوچو۔ اپنے لیے بھی کوئی نعمت، کوئی سہولت، کوئی ایوارڈ، کوئی تمغہ، اس نے کبھی بھی اپنے لیے کچھ نہ سوچا۔

اکیڈمی آف لیٹرز (اکادمی ادبیات) میں ڈائریکٹر جنرل ہونے کے دنوں میں، یوں تو میں نے اچھے برے بہتیروں کاغذوں پہ دستخط کیے، ایک کاغذ یاد رہ گیا۔ وہ یادگار کاغذ تھا۔ وہ کاغذ تھا، اظہر جاوید کے لیے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی کے لیے میری لکھی ہوئی سائٹیشن۔ اس پہ دستخط کرنے کے بعد دل مچلنے لگا کہ فون کر کے اظہر جاوید کو بتاؤں۔ فخر زمان اکادمی کے چیئرمین تھے۔ وہ شیشہ دل آدمی، دل بولی کے سے آشنا ہے۔ اس نے پتہ نہیں کیسے میری سوچ پڑھ لی۔ کہا ''دیکھ سرکاری معاملات ہیں۔ جب تک ایوان صدر سے اعلان نہ ہو جائے اظہر جاوید کو نہ بتانا اور کسی کا فخر زمان نے نام نہ لیا۔ ورنہ کرنے کو میں نے اور بہتیروں کے لیے دستخط کیے تھے۔ وہ جانتا تھا اور لوگوں سے مجھے کیا واسطہ۔ جب، جس کو بتانا تھا اسی سے منع کر دیا گیا تو

خاموش ہو گیا۔ جس دن اظہر جاوید کے لیے حتمی اپروول کے دستخط ہو گئے تو اس دن بھی میں متعلقہ وزارت میں بیٹھا تھا، پھر خاموش رہا۔ اگلے دن خبر اخبار میں چھپ گئی۔ اب بتانے کا کیا فائدہ تھا۔ اب یہ خبر تھوڑی تھی۔ اب تو واقعہ تھا جس سے سب آ گاہ تھے۔

بس اظہر جاوید کو ابھی ایوارڈ لینا تھا۔

مل تو گیا، سینے پہ اسے سجانا باقی رہ گیا۔

23 مارچ کو ایوارڈ ملنا تھا۔ 3 مارچ کو لدھیانے کی دعوت تھی پندرہ دن پہلے اسے اوپر سے بلاوا آ گیا۔

آخری بار فون پہ بات ہوئی تو بولے۔

یار۔ لدھیانے سے واپس کب آنا ہے؟

کوئی جلدی ہے؟

"نہیں پھر ادھر بھی پہنچنا ہے نا؟"

"تیرے شہر، 23 مارچ کو۔ ایوارڈ لینے۔"

"ہاں،

ہوا تو آ جاؤں گا۔"

"کیوں کہیں اور بھی جانا ہے؟"

"کوئی اور لے جانے والی آ گئی تو؟"

"ہاں جی، کرشن مہاراج کی گوپیوں کو کون منع کر سکتا ہے!"

"تجھے سب سے بڑی گوپی کا پتہ ہے؟"

میں ذہن میں کئی نام سوچتے سوچتے چپ ہوا تو فون کے دوسری طرف سے آواز آئی "یہ ساریاں تو چھوڑنے والی گوپیاں ہیں، لیجانے والی گوپی صرف ایک ہوتی ہے!

اچھا جی۔"

میں نے ان کی سنجیدہ بات، ہنسی میں اڑا دی۔

وہ آئی اور اظہر جاوید کو لے گئی۔

ٹیکسی چلانے والے ڈرائیور تک کو آہٹ نہ ہوئی کہ اس کی ٹیکسی میں ڈاکہ پڑ گیا ہے۔ اس کی سوار، کا سوار، اپنی سواری سے اتر گیا ہے۔ اتار لیا گیا ہے۔

اظہر جاوید کے چاہنے والے پریشان کیوں نہ ہوتے۔

پریشان خٹک سے ایک بار سردار عبدالقیوم خان سابق صدر اور وزیراعظم آزاد کشمیر کے گھر ملاقات ہوئی۔ ادب کی بات ہوتے ہوتے ادبی پرچوں کی بات ہونے لگی۔ کہنے لگے "جن دنوں شفیق الرحمان اکادمی ادبیات کے چیئرمین تھے، میں ان کا ڈائریکٹر جنرل تھا۔ ایک دن شفیق الرحمان کہنے لگے۔ ادبی پرچے آندھی میں چراغ جلائے بیٹھے ہیں۔ ان کی کچھ مدد کرنی چاہیے۔ یوں ہم نے ملک کے ہر اہم ادبی پرچے کے لیے ایک معقول رقم کا بنک ڈرافٹ بنوایا اور بھیج دیا۔ ہر طرف سے ہمیں واہ واہ کے فرشی سلام بھرے خطوط ملے۔ ایک دوسطری خط ملا، ساتھ ہمارا بھیجا ہوا ڈرافٹ ملفوف۔ حیرانی سے خط پڑھا، لکھا تھا۔

"آپ کی توجہ کا شکریہ۔ ابھی اس عاجز کے کندھوں میں اپنے پرچے کا بوجھ اٹھانے کی سکت ہے، اظہر جاوید۔"

"پریشان خٹک کہنے لگے، میں اور شفیق الرحمان حیران۔ یار، یہ کیسا بندہ ہے۔ ہمیں سمجھ نہ آئی، بولے اب سمجھ آئی ہے، بہت بڑا آدمی ہے، کیسا ہے؟"

میں نے کہا، "سرکار! ویسا ہی ہے۔"

اکادمی ادبیات میں مارچ 2010ء عالمی ادبی کانفرنس برائے صوفی ازم کے موقعے پر اٹھاسی ممالک سے مندوبین اسلام آباد پہنچے ہوئے تھے۔ سب اسلام آباد

ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اسی ہوٹل میں کچھ گنے چنے پاکستانی ادیب بھی ٹھہرا لیے۔ اظہر جاوید انہی میں سے ایک تھا۔ کانفرنس سے ایک شام پہلے میں، کانفرنس کی تیاریوں میں الجھا ان کے پاس گیا تو بولے۔

''یار۔ ایک کام کرنا۔''

''حکم۔''

''میں بیمار آدمی ہوں۔ میرے ساتھ غیر ملکیوں والا سلوک کرنا۔''

کیا مطلب؟

''تم نے غیر ملکیوں کو سنگل کمرہ دیا ہے، پاکستانی ایک کمرے میں دو ٹھہرائے ہیں۔''

''جی۔''

''مجھے بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ مجھے کمرہ اکیلے کو دینا۔''

''ڈن۔''

اس وقت ہوٹل میں ڈنر سرو ہو رہا تھا۔ ڈنر میں کہیں کراچی سے آئے میرے بڑے بھائی افضال بیلا ان کے ساتھ جا بیٹھے۔ وہ شاعر ہیں، اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ڈنر کے بعد پلٹنے لگا تو اظہر جاوید نے مجھے پھر بلایا۔

بولے، ''یار۔ اکیلا کمرے میں کیا کروں گا۔ تم افضال بیلا کو میرے کمرے میں کر دو۔''

کانفرنس کے دنوں میں رات کو فارغ ہو کے میں انہی کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ بڑے بھائی بھی ادھر تھے۔ خوب باتیں ہوتیں۔ ادب کی، ادب والوں کی، پھر بھی بڑے بھائی کی موجودگی میں کئی پوچھنے والی باتیں، پوچھنی رہ گئیں، کئی بتانے والی باتیں، بتائی نہ گئیں، سوچا تھا، لاہور سے لدھیانے اور لدھیانے سے دہلی کے سفر

میں وہ ساری باتیں کریں گے۔

اللہ جانے، اللہ قسمت میں سفر کس طرح لکھتا ہے!

نصیب میں لکھے سفر تو رہنے دیتا ہے۔ہم سفر بدل دیتا ہے۔

لدھیانے پہنچ کے، میں کیول دھیر کی کھلی بانہوں میں سر دے کے رو پڑا۔ کہنے کو کچھ کہا تو نہیں، دل کہہ رہا تھا بھاجی۔ میں بے بس آدمی ہوں، بغیر سوچے سمجھے وعدہ کر لیتا ہوں۔اظہر جاوید کو ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ پورا نہ کر سکا۔

کیول دھیر بھی لدھیانے کی سوہنی مٹی سے بنا ہے۔اس کے چہرے پہ بھی میری ماں کی آنکھیں ہیں۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے میرے کندھے تھپتھپا کے زیر لب بولا۔ ''یار جس کے لیے ہم ادھر کا ویزہ لگوانے کے جتن کرتے رہے اس نے آناً فاناً وہ ویزہ لگوا لیا کہ ساری کائنات اس کی اُڑان میں آ گئی۔اس کی روح تیرے آنے سے پہلے کی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔تو اوپر اسٹیج پہ چڑھ کے اسے دیکھ، سُن۔''

اظہر جاوید تو مجھے نظر نہیں آیا۔اُس کی آنکھیں ہر محبت سے تکتے چہرے پہ نظر آنے لگیں۔ان سب کی آنکھوں میں میری ماں کی دیکھن والی آنکھ تھی۔

ایسی تاروں کی جوگ میں جیتی آنکھوں کو موت نہیں آتی۔ یونہی تو نہیں، بابا فرید نے کہہ دیا تھا

کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس
اک نیناں مت کھائیو، پیا دیکھن کی آس

چوبر جی...... محمود شام

حکمت اور دانائی وہ عظیم تحفہ ہے، جو اللہ اسے دیتا ہے، جس سے وہ خوش ہو۔ اللہ کے دیے سارے انعامات ہی بے مثل ہوتے ہیں۔ اللہ خود حکیم، دانا ہے۔ تمام تر علم، خرد اور آگہی کا منبع۔ اس لیے جب کسی کو جی بھر کے نوازتا ہے تو اسے اپنے عرفان نور خزانے سے اپنے ہاتھ سے چٹکی بھر کے دیتا ہے۔ سجا دیتا ہے۔ محمود شام ایسا ہی خوش بخت ہے۔ والد گرامی یونانی خرد سے لبریز، پٹیالہ شہر کے مرکز میں ارسطو دوا خانہ چلاتے تھے۔ ان کا مطب مجویات، کشتوں اور میٹھے شربتوں سے بھرا ہوا تھا۔ بات کرتے تو لگتا شربت پلا رہے ہیں۔ تھپکی دیتے تو گویا کشتہ فولاد کھلا دیتے۔ مسکراتے تو زعفران کی خوشبو آتی۔ مطب میں مرتبان، صراحیاں، سل بٹے اور نسخہ جات۔ گھر میں کتابیں، مخطوطے اور دستاویزات۔ اس دور کے سب عالم و حکیم و دانا لوگوں کے باوصف شاعری بھی کرتے تھے۔ دل گداز اور عقل فروزاں۔ ایسے میں خدا، خدا کے بندوں اور خدا کے چاہنے والوں سے پیار کیوں نہ ہوتا۔ نظام الدین اولیاء کے فیض

یافتہ تھے۔ حضرت عبدالقادر رائے پوری کے مرید، ایسے نابغہ درویش حکیم ودانا کے بیٹے ہیں محمود شام۔

ریاست پٹیالہ کے قصبے راجپورہ میں پانچ فروری سن انیس سو چالیس کو محمود شام پیدا ہوئے۔ یوں سمجھ لیں کہ شام جی۔ قرارداد پاکستان سے سنتالیس دن بڑے ہیں۔ سن سنتالیس کو جب پاکستان بنا تو سات سال کے تھے۔ پاکستان بنتے سمے برصغیر کی جو خون آشام تصویر بنی وہ ساری محمود شام کی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ اس تصویر میں جو مقدس لالی ہے اس میں محمود شام کے گھرانے کا خون بھی ہے۔ محمود شام کے چچا اور ایک تایا اسی تقسیم کے دنوں میں شہید ہوئے۔ لٹا پٹا ان کا کنبہ ریل گاڑی کی چھت پر چڑھ کے لاہور آیا۔ لاہور سے ان کے بزرگوں نے جھنگ کی گاڑی پکڑی۔ ''جھنگ'' سے ''جنگ'' میں آتے آتے انہوں نے ساتوں جنم کی شکتی پوری دکھا دی۔ شاعروں کی منڈلی میں عظیم المرتبت شاعر، صحافی برادری میں اعلیٰ رتبہ صحافی۔

مہذب معاشروں میں ادیب، شاعر اور دانشور کا سماجی درجہ سب سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ اور سربراہِ مملکت سے بھی اوپر۔ یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا راج وقت پہ ہوتا ہے۔ موجودہ وقت سے لے کر آنے والے ہر وقت پر۔ یہ دلوں میں رہتے ہیں، ہونٹوں سے بولے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر سن کے آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگتے ہیں۔ مہذب معاشرے اپنے ان آدرش باش مہاپرشوں کے مجسمے اپنے ہر بڑے شہر کے چوک میں بناتے ہیں۔ اپنی بہترین سڑکوں کے نام وہ انہی ادیبوں اور شاعروں کے نام پر رکھتے ہیں۔ مگر یہ ساری باتیں سلجھی ہوئی تہذیب یافتہ قوموں کی ہیں۔ تہذیب کے سلجھے پن کی سب سے بڑی نشانی بھی یہی ہے کہ کون سی قوم اپنے بڑے ادیب بڑے شاعر کو کتنا بڑا مقام دیتی ہے۔

ادیبوں شاعروں کی منڈلی کے آس پاس، کچھ چوکنے ذہین چوکس قلم کار بھی

ہوتے ہیں۔ یہ بے کپٹ، بے ساختہ راست قلم لوگ ہر گزرتے دن کی نبض پہ ہاتھ رکھ کے نسخے لکھتے ہیں۔ ہوتے یہ بھی لکھاری ہیں۔ انہوں نے اپنے لفظوں کی بنت، فقروں کی اٹھان، تراکیب کا استعمال، لکھے لفظوں کی چمک، بین السطور تحریر کا مزاج ٹھنڈا، میٹھا، کڑوا یا کڑک اپنے سے بڑی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کے شہ پاروں سے سیکھا ہوتا ہے۔ یہ لکھاری اخبار کے لیے لکھتے ہیں، چونکہ جانتے ہیں کہ اخبار کی عمر ایک دن ہوتی ہے اس لیے ہر نئے دن کے لیے جیتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ ان کی مشاق باریک بین آنکھیں ہر سیاسی اور سماجی آنچل کے آر پار دیکھ لیتی ہیں۔ تہذیب کی طرف گامزن ترقی پذیر ملکوں میں ان کا بہت نام ہوتا ہے۔ شہرت ہوتی ہے۔ قوت ہوتی ہے۔ پہچان ہوتی ہے اور مزے کی بات ہے، یہ لوگ اپنی ان طاقتوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یہ صحافی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی زبردستی گن پوائنٹ پہ چھینی ہوئی قوت کا ادراک ہوتا ہے۔ محمود شام اپنی اس قوت کو پردہ نشین پاکیزہ عورت کی طرح چھپا کے رکھتا ہے۔

اس کے پاس سدھ راگ کی راگنی ہے۔

ہمارے معاشروں میں پاپ اور راک سنگروں کی زیادہ مانگ ہے۔ کلاسیکی گائیگ کو کوئی باذوق کبھی کبھی سن کے انعام دینے بھی لگے تو ایک پگڑی، ایک چادر اور ایک ملتانی جوتوں کی جوڑی دے کے مکت ہو جاتا ہے۔ مگر راک اور پاپ کے آرکسٹرا پہ ناچنے والوں میں نوٹوں کی بارش کے نیچے پورا شہر ناچتا ہے۔ کبھی کبھار شاذ و نادر کوئی نابغہ پاپ سنگر ایسا نکلتا ہے جو راگ کے آہنگ و راگنی کی لے اور آواز کے سُر کو سیکھ کے آیا ہوتا ہے، ایسا فنکار بڑا نام کماتا ہے۔ ویسے بھی یہ زمانہ بھیروی راگ کا نہیں درباری راگ کا ہے۔ محمود شام چونکہ بے ہی ذات کا شاعر اور شاعر بھی اونچے درجے کا۔ اس لیے ان کی صحافت میں موہنی چاشنی ہے۔ جیسے راگ مالکوس۔

محمود شام کی ساری زندگی چار کلیدی ستونوں پہ کھڑی ہے۔ ایثار، حکمت، کتاب اور تصوف۔ ایثار کا حال تو یہ کہ پاکستان کی طرف آتے آتے اپنے چچا اور تایا کے پورے گھرانے قربان کر آئے۔ حکمت ان کے گھر کی صراحی ہے۔ بیماروں کو شفایاب کرنے والی حکمت بھی اور ذہنوں کو روشنی دینے والی بھی۔ کتاب سے ان کا پیار پیدائشی ہے۔ بچپن میں ہاتھ سے کتابت کر کے اخبار لکھا کرتے تھے۔ باقاعدہ بانٹا کرتے تھے۔ لائیل پور سے اس کا ڈیکلریشن تک لیا ہوا تھا۔ آٹھویں تک جھنگ کے ایم جی ہائی سکول میں پڑھے۔ میٹرک جھنگ ہی کے گورنمنٹ ہائی سکول سے کیا۔ وہیں انٹرمیڈیٹ تک پڑھ کے پھر ندی سے دریا میں آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور محمود شام کے شانِ شایان جگہ تھی، وہاں پہنچے تو گویا مچھلی پانی میں آ گئی۔ جھنگ میں بھی انہوں نے وہاں کے سارے جید عالموں شاعروں اور ادیبوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ شیر افضل جعفری، حنیف باوا، بلال پانی پتی۔ شارب انصری اور طاہر سردھنوی۔

طاہر سردھنوی شاعری میں ان کے استاد تھے۔ ان کی پان کی دوکان سے یہ روز پان کھانے جاتے اور شاعری کی بحریں چباتے، قافیے ملاتے، ہونٹ لال کر کے آتے۔ لاہور آئے وہ بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں تو ان کے اندر کا چانن نکل کے باہر آ کھڑا ہوا۔ صوفی تبسم، اشفاق احمد، ناصر کاظمی، مشکور حسین یاد اور ڈاکٹر مرزا منور۔ انہوں نے خرد اور دانش کا کوئی پہاڑ نہ چھوڑا۔ جھنگ میں چوتھی جماعت پڑھتے پڑھتے یہ قدرت اللہ شہاب سے مل چکے تھے۔ وہ ان دنوں جھنگ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کے سکول آئے۔ سکول کے دوسرے بچے تو شہاب صاحب کو محض ڈپٹی کمشنر سمجھ کے دور دور سے کن اکھیوں سے گھبرائے گھبرائے سے دیکھتے رہے۔ یہ پہچان گئے۔ پہچان پرکھ اور گیان کی آنکھ انہیں ورثے میں ملی ہے۔ شہاب صاحب کے سامنے جا کے سلام کیا اور اپنی چوتھی جماعت کی تاریخ کے مضمون کی کاپی میں ان سے آٹوگراف لے

لیے۔ بعد میں سال ہا سال سے ان کی میرے گرو ممتاز مفتی سے بھی عقیدت رہی۔ مفتی جی بھی ان کا ذکر یوں محبت میں کیا کرتے گویا میٹھا پان منہ آ گیا ہو۔

گورنمنٹ کالج لاہور کا ادبی مجلّہ ''راوی'' بہت بڑا پرچہ ہے۔ محمود شام کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں ''راوی'' کی ادارت مل گئی۔ یہ 64-1963 میں راوی کے مدیر اعلیٰ رہے۔ باکمال پرچے نکالے۔ میں راوی کی ادارت میں ان کے آٹھ سال بعد گیا۔ راوی کے دفتر میں محمود شام کی ادارت میں پچھلے پرچے دیکھے اور ان سے سبق لیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے محمود شام نے اقبالؒ کی پیروی میں ایم اے فلاسفی کیا۔ اقبالؒ سے ملنے تو ان کے والد گرامی اکثر گڑھی شاہو جایا کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے فلاسفی شعبہ میں ڈاکٹر حمید الدین ان کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ انہوں نے فلاسفر بننے تک ہی اکتفا نہ کیا پھر ایم اے انگلش لٹریچر بھی پاس کیا۔ اب ایسے مہان فلاسفر دانشور اور عالمی ادب کی پرکھ رکھنے والے بڑے شاعر اور بڑے صحافی کی سمجھ ہر ایک کو کہاں آتی ہے۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ محمود شام شاعروں اور صحافیوں کی منڈلی میں سوٹی پکڑ کر مونیٹر بن کے سب کو ہانکتے۔ مگر یہاں الٹا ہے۔ سر سے پیر تک عجز۔ نہ علم کی کڑک نہ حکمت کا رعب نہ بلند عہدے سے گردن تنی ہوئی۔ حیرت ہے محمود شام کی بنت کیسے نفیس ریشم سے ہوئی ہے۔ مزاج میں، گفتگو میں، برتاوے میں سراسر ریشمی۔ شخصیت میں اخلاص بھرا سچ، ملاقات میں خلوص۔ خدائے واحد سے انوکھا پیار اور دربار رسالت ﷺ سے اٹوٹ عشق۔ ان کی شخصیت کا چوتھا اور مضبوط ترین ستون یہی ہے۔ ان کے گھر میں بھی قدیم ریاست پٹیالہ کے قصبے راجپورہ جیسی سادگی، عمدگی، تہذیب اور وضع داری ہے۔ مجال ہے کبھی ان کے بچوں نے یہ مان کیا ہو کہ اتنے بڑے اشاعتی ادارے کے گروپ ایڈیٹر کے بچے ہیں۔ میرا تو خیال ہے خود محمود شام ہر شام خود کو یہ سمجھاتے رہتے ہیں کہ خبردار، اکڑنا نہیں، جھکنا ہے۔ انہیں دیکھ کے واقعی

اس کہاوت کی صداقت پہ یقین آ جاتا ہے کہ پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنی جھک جایا کرتی ہے۔ یہی عجز، فراق، وصال، وچھوڑا، تنہائی اور حیا ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری پہ بات پھر کبھی سہی۔ ویسے بھی دو درجن کتابوں کے مصنف، ہزار ہا اخباری کالموں کے صحافی اور کئی سفر ناموں کے لیکھک بارے کھڑے کھڑے کیا تفصیل دوں۔ صرف شاعری کی ان کی پانچ کتابیں ہیں۔ اظہر جاوید کے پرچے ''تخلیق'' میں ان کی شاعری نگینوں کی طرح چمکتی ہے۔ یہ نظم کہیں، غزل کہیں یا کالم لکھیں۔ محمود شام کی ہر تخلیق میں صبح صادق کا سا حسن ہے۔ شام نہیں۔ یہ بھی ان کے عجز کا انوکھا انداز ہے کہ چار حسین اور قوی برج نما ستونوں کی چو برجی شخصیت کے اندر رہتے ہوئے بھی یہ شرمائے شرمائے سے رہتے ہیں۔ صبح ہوتے ہوئے بھی خود کو شام کہتے ہیں۔

o

شہد کی بوتل...... ناصر شہزاد

شہد کی بوتل کا ڈھکن کھولنے سے پہلے ایک حقیقت بیان کرتا چلوں کہ جہاں خدا نے اپنے تمام انبیاء پر وحی بھیجی اور اس وحی کا سلسلہ ہمارے نبی پاک حضرت محمد ﷺ پر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ وہیں مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا نے کبھی شہد کی مکھی کے کان میں بھی وحی کہی تھی۔ اسے کسی کام پہ لگایا تھا اور وہ آج بھی فرماں برداری سے اسی بندھن سے بندھی اس بدبودار دنیا میں خوش رنگ شہد کشید کیے جاتی ہے۔ اسے شاید کہا گیا تھا کہ اس کے بنائے اگائے رنگ ہا رنگ کے پھولوں کو گلے لگا کے ان کا رنگ رس اور خوشبو کچھ ایسے اٹھائے کہ وہ اس کے جسم و جاں سے گزر کر چکھنے والوں کے لیے خوش ذائقہ شفا بن جائے۔ اس قسم کا درس پیغمبر بھی دیتے آئے ہیں۔ ان سب کے پیغام کا لب لباب یہی ہے کہ انسان دنیا کی غلاظتوں پر منڈلاتی ہیضہ پھیلانے والی مکھی سے ترقی کر جائے۔ شہد کی مکھی بن جائے۔ کسی رخ پہ لگ جائے، اسے سمت مل جائے اور اس کا وجود اس کائنات میں دوسروں کے لیے باعث رحمت اور شفا ہو۔ دیکھ لیں۔

جن جن کو رخ مل گیا۔ وہ ایسے ہی بنا دیے گئے۔

ایسا ہوتا آیا ہے۔ ہر بھلائی توفیق سے ملتی ہے۔ یہ بھلائی شفا کی صورت میں شہد میں ہو یا علم کی آبیاری کے لیے قلم میں۔ قلم تو وہ مقدس شے ہے جس کی خدا نے قسم کھائی اور یہ بھی بتایا کہ قلم کے بس میں لکھنا کہاں تھا۔ قلم کو لکھنا خدا نے سکھایا۔ اب جس قلم کو خدا نے لکھنا سکھایا ہو وہ کیسے اپنا سبق بھولے۔ جس قلم والے کے ہاتھ پر خدا اپنا ہاتھ رکھ دے تو پھر اس نے صرف سچ ہی لکھنا ہے اور سوہنا لکھنا ہے۔ خدا اس قلم کار کو پھر سونے میں کھوٹ نہیں ملانے دیتا۔ رنگ و آہنگ کی لہر پہ لکھی سچی تحریریں موتیوں جڑی مالائیں ہوتی ہیں۔ ان میں خدا ایسا کوئی سیپ نہیں پرونے دیتا جو اندر سے خالی ہو۔ جس کے اندر موتی نہ ہو صرف ہلتا جلتا کوئی بدہیت نفس کا کیڑا ہو۔

ایسے قلم بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جو عطا ہو جاتے ہیں۔

ایسے قلم ہیں۔

سلطان باہوؒ کے پاس ہے، بابا فریدؒ، خواجہ فریدؒ، بلھے شاہؒ، امیر خسروؒ، شاہ لطیف بھٹائیؒ، میاں محمد بخشؒ، غالبؒ، اقبالؒ، ممتاز مفتیؒ، قدرت اللہ شہابؒ، فیض احمد فیض اور اشفاق احمد بھی ایسے ہی سوہنے قلم ملے۔ جو عطا کیے گئے ہیں۔ ایسے قلم بندے کو بندے سے جوڑتے ہیں۔ یہ قلم اس لیے عطا نہیں کیے جاتے ہیں کہ ایسے قلم کا حامل شاہوں کے قصیدے لکھے، سچ کو جھوٹ میں غلط ملط کرے۔ نا۔ یہ شہد کی مکھی کی طرح اس کائنات کی رنگارنگی سے خدا کی بڑائی کشید کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ کہ ان سے جو لکھا جائے اس سے بیماریوں کو پاکیزگی کی قوت ملے۔ انہیں شفا ہو۔ یہ قلم وہ ہوتے ہیں جو بازار سے نہیں ملتے۔ کسی سٹیشنری کی دوکان سے نہیں خریدے جا سکتے۔ ان کو پانے کے لیے قلم کار کو سب سے پہلے جس قلم کو قلم کرنا پڑتا ہے وہ خود اس کائنات میں اس کا اپنا بت ہوتا ہے۔ اپنی ''میں'' ہوتی ہے۔ ''میں'' کی منزل سے گزرے بغیر

''وہ''، ''تو'' کی رسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ یہ اس کا قانون ہے۔ یہ منزل طے ہو گئی تو قلم تھامنے کی پہلی شرط پوری ہو گئی۔ قلم کار کی قلم کی برکتوں تک رسائی ہو گئی۔

ہر راجیہ، عمل داری اور سلطنت کا اپنا قانون ہوتا ہے۔ خدا سے بڑا کون ہے۔ پوری کائنات جس کی ریاست ہے۔ کون ہے اس سے بڑا حکمران۔ جس کی حکمرانی دلوں میں پیدا ہونے والے خیال کی نوک پلک تک کو محسوس کر لیتی ہے۔ جس نے کائنات کے کارخانے میں وقت کی لگا میں ڈال کر اسے انسان کو سواری بنایا۔ اس کمزور انسان کو اپنی سلطنت کی راج گدی پہ بٹھایا اور کہا ہے کہ اس کی سواری کرو، موج کرو، صرف اتنی نصیحت کی ہے کہ دیکھو، اس سواری کو خود پر سوار نہ ہونے دینا ورنہ بے توقیر ہو جاؤ گے۔ اپنی توقیر سلامت رکھنی ہے تو سوار اور سواری میں فرق سمجھنا۔ اگر مغلوب ہونا تمہاری مجبوری ہے تو صرف اس سے مغلوب ہونا، جس کے سامنے تم مجبور محض ہو اور وہ کوئی نہیں سوائے خدا کے۔ اس لیے شاید پوری کائنات کو انسان کی سواری بنا کر خدا نے اپنی سواری کے لیے انسان کو پسند کیا ہے اور انسانوں کے ہجوم میں اس انسان کو بہتر جانا ہے جو صاحب علم ہو۔ جو صاحب قلم ہو۔ جس کے پاس وہ قلم ہو جو خدا کی قسم پہ پورا اترتا ہو۔

یہ سوچنے کی بات ہے۔

ذرا سوچیں، ہمارے ملک میں یا کسی بھی ملک میں چڑیاں، کبوتر مارنے والی بندوق کو حاصل کرنے کے لیے بھی پہلے اسلحہ لائسنس لینا پڑتا ہے۔ بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ کہنا سننا پڑتا ہے۔ اپنے ضروری کریڈینشلز دکھانے پڑتے ہیں۔ پھر جا کے اسلحہ لائسنس جاری کرنے والا منشی ہمارے لائسنس پر مہر لگاتا ہے اور حاکم شہر دستخط کرتا ہے۔ یہ شرائط ہیں ایک ناکارہ سی چڑیاں مارنے والی بندوق کو لینے کی۔ اب سوچیں، وہ قلم جس کاٹ، ان گئی صدیوں کے گریبان اور دامان تک جاتی ہے جنہوں

نے ابھی جنم لینا ہے۔ جس سے لکھے ہوئے لفظوں کی پہنچ اتنی دور مار ہے کہ جس وقت
نے ابھی جنم نہیں بھی لیا، اس ہدف تک کو جا لینا ہے۔ اس قلم نے صرف موجود لمحے کی
شرح نہیں لکھنی۔ جو وقت گزر گیا، اسے بھی لپک کے پکڑ لانا ہے۔ ایسا قلم کیا سوچ
سمجھے بغیر ہی دیا جاتا ہوگا...... سوچیے...... ایک غلط فہمی دور کرتا ہوں۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے
کہ جو بھی قلم ہے اور جو بھی لکھ رہا ہے وہ عطا کیا ہوا ہے...... نہ...... ایسا نہیں ہے۔ جس
طرح بغیر لائسنس اسلحہ آج کل عام ہے۔ جس سے چوری کی جاتی ہے۔ ڈاکے ڈالے
جاتے ہیں۔ قتل و غارت ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر عطائیہ قلم بھی بہت ہیں اور کچھ اسی
طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ دوسروں کو گرانے کے لیے۔
اپنا قد بت بنانے کے لیے۔ اپنے حاشیہ بردار، چھاتہ بردار گلی محلوں میں اترانے کے
لیے، اپنے چھیچھڑا غبارے میں پھونکیں مارنے کے لیے۔ اپنی ''میں'' کا غبارہ پھلانے
اور فساد کا دھواں اڑانے کے لیے۔ پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے یہ قلم کام آتا ہے۔
چوک میں مجمع لگا کے، ڈگڈگی بجا کے، اس سے تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ شہرت
کے کچے رنگوں کی رنگینی کے مغالطے دیتا ہے۔ اسے ہاتھ میں پکڑ کر یا جیب میں لگا کر
اپنی ''میں'' کے بھوت کو بوتل میں بند رکھنے کی کوئی شرط عائد نہیں ہوتی۔ ایسے قلم سے
لکھی تحریروں کے لیے خدا کے کسی وعدے کا بھی انتظار ضروری نہیں۔ کیونکہ ایسے قلم
کے حامل بے صبروں کو ایک طوائف کی طرح، ان کی ہر رات کی صبح سے پہلے ان کی
مزدوری مل جاتی ہے۔ جسے چودھراہٹ کی خواہش ہو، خدا اسے اسی مغالطے میں
غلطاں کر دیتا ہے۔ جو شہرت کا رسیا ہو، اسے رنڈیوں کی طرح مشہور کر دیتا ہے۔ جو کم
ظرفوں کی قصیدہ گوئی کرنے لگے خدا اس کا نام انہی ظالموں کی فہرست میں لکھ لیتا
ہے۔ ایسے لوگوں سے خدا کا کوئی ادھار نہیں ہوتا۔

ہاں جو لوگ عطا کیے گئے قلم والے ہوں۔ وہ عجز کی دہلیز پر بیٹھ کر کبھی وہاں سے

اٹھنے کی دعا نہیں کرتے۔ بے عطائیہ قلم اور عطا کیے ہوئے قلم میں وہی فرق ہوتا ہے جو غلاظت پر منڈلاتی ہوئی مکھی اور شہد کی مکھی میں ہوتا ہے اور دونوں کی لکھی ہوئی تحریروں میں بھی وہی تفاوت ہوتی ہے جو حاجتوں کے فرسودہ ڈھیر اور شہد کی بوتل میں فرق ہوتا ہے۔

عطا کیے ہوئے قلم کو لے کر چلنا آسان نہیں ہے۔

بڑا کٹھن، طویل اور مشکل سفر ہے۔ خاردار جنگل کے بیچوں بیچ اپنی قبا کو سلامت روی سے نکال کر، لے جانے کا سفر ہے۔ یہ اپنے آپ سے نکل کر، اس کی طرف جانے کا سفر ہے۔ یہ وہ بن باس ہے جس پر نکلنے والے ہر شہزادے کے لیے یہ قانون لکھا گیا ہے کہ جب وہ اپنی راجدھانی اپنی ''میں'' کو اس کی خاطر چھوڑ کے، خالی ہاتھ جھاڑ کے، کسی دور انجانے سفر پر، بے سروسامانی سے نکلے گا تو پیچھے چھوڑی ہوئی راجدھانی پہ پھر اس کے چھوڑے ہوئے جوتے راج کریں گے۔ یہ قانون سب کے لیے ہے۔ یہ قانون صرف رام جی کے لیے نہیں تھا۔ رام چندر جی بن باس پر نہ جاتے تو اغراض کے مارے راج کی ہوس کو جوتے کی نوک پر رکھنے کی اصطلاح بھی نہ بنتی۔ بن باس کے چودہ سال میں ویرانوں کی تپسیا سے ملی شکتی کی کوئی کہانی نہ بنتی۔ پھر وہ دیوالی بھی نہ ہوتی جب چودہ سال پورے ہوئے تھے۔ جب چراغاں ہوا تھا۔

چراغاں اس بار پھر ہو گیا ہے۔

بن باس پر نکالے ہوئے شیخو بابا ناصر شہزاد پلٹ آئے ہیں۔

بتیاں جل گئی ہیں۔

گیت اپنے پیروں میں سرتیاں اور مرتیاں باندھے خود بخود گنگنانے لگے ہیں۔ پرانے قصے، لوک داستانیں، صحیفوں کی روایات، ترچھی تیکھی تراکیبیں، انوکھے پیرائے، نئے انداز۔ یہ سب کچھ تو ہونا تھا۔ انھی پھولوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ جنھیں کبھی

تیاگ دیا گیا تھا۔ انہی بتیوں نے اب جلنا تھا۔ جس چراغاں سے کوئی بے نیاز ہوا تھا۔

ناصر شہزاد کا یہ سفر کسی ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر نہیں ہے۔ یہ ایک وقت سے دوسرے وقت کا سفر ہے۔

سفر میں دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک مقام، دوسرا وقت

سفر کیسا بھی ہو، انسان کو بیک وقت ان دونوں کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ناصر شہزاد کے سفر میں وقت کی اڑان کے گزرے چودہ سال نظر آتے ہیں۔ اسی سے اس کی تحریر میں جگ مگ ہے، مگر انہوں نے مقام نہیں بدلا۔ قدم جما کے جہاں بیٹھے تھے وہیں جمے رہے۔

دیکھو۔

مقام سے نکلنے کے بھی دو راستے ہیں، دو راہیں ہیں۔ ایک افقی راہ ہے۔ زمین کے مدار کے ساتھ ساتھ۔ ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک...... ایک جگہ سے دوسری جگہ تک۔ جیسے خانہ خدا سے بیت المقدس تک۔ دوسری راہ عمودی ہے۔ جیسے بیت المقدس سے شجر المنتہا تک۔ یہ دوسری راہ کا سفر وقت کے پہیوں کو بیک وقت گھماتا بھی ہے اور تھامے بھی رکھتا ہے۔ ایسا وقت جو نظر آئے مگر اوروں پہ نہ گزرے۔ جو منزلیں گزر چکی ہوں وہ نیا جنم لے لیں، جس وقت نے جنم نہ لیا ہو وہ پیدا ہو جائے۔ گزرتا یہ سفر عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ سفر ان کے لیے ہے جنہیں اس سفر کے مقدس ترین مسافر ﷺ سے نسبت ہو۔ نسبت بھی ایسی کہ ہیر، ہیر نہ رہے رانجھن ہو جائے۔

ناصر شہزاد نے اپنے سفر کے سارے ماہ و سال ہمیں گن گن کے بتا دیے ہیں اور اپنے مقام کی پوری نشاندہی بھی کر دی ہے۔ راوی کنارے اپنے گاؤں کا سارا نقشہ دکھا دیا۔ وہاں کی ٹھنڈی چھاؤں میں محبتوں کی ساری بوندا باندی برسا دی ہے۔ مگر وہ اس مقام سے ابھرے نہیں۔ اسی لیے شاید انہیں یہ گلہ بھی ہے کہ بڑے شہروں میں نہ رہ

سکنے کے باعث انہوں نے کچھ کھو دیا ہے۔ کہنے کو اس کھونے کی لمبی فہرست ہے۔ میں گنواتا ہوں۔ بڑے ہوٹلوں کی چمکتی دمکتی محفلیں، جو اخباروں کی خبریں بنتی ہیں۔ کافی ہاؤس کی چٹخارہ دار باتیں، جن سے دلوں میں فساد پلتا ہے۔ ٹیلی ویژن ٹاک شو جنہیں اپنی کہی منوانے والوں کے علاوہ کوئی دل جمعی سے نہیں سنتا۔ پبلک ریلیشنگ کی افیم جو مست کیے رکھتی ہے۔ مغالطوں کو پالتی ہے اور خوشامد سے پلتی رہتی ہے۔ پھر اس افیم سے ملے سرکاری وقتی عہدے، تمغے اور بلند مرتبے۔ ہاں دور افتادہ، بظاہر کم نصیب ویرانے میں رہتے ہوئے، یہ ناکارہ چیزیں انہوں نے ضرور کھوئی ہیں۔ مگر جس دن انہیں یہ کھونا، کم نصیبی کی جگہ خوش نصیبی محسوس ہوا۔ وہ اپنے بن باس کے سفر میں، وقت کی لگامیں تھامے تھامے اپنے مقام سے بہت اوپر ابھر آئیں گے اور کسی عمودی پگڈنڈی پر قدم رکھ کر نئے جہان دریافت کرنے نکلیں گے۔ مجھے پتا ہے ناصر شہزاد یہاں ٹھہرنے نہیں آئے۔ یہ بن باس پورا کر کے ضرور آئے ہیں۔ مگر راجدھانی سے اپنے جوتے اٹھانے نہیں آئے۔ اس لیے کہ راج دھانیوں پر پڑے جوتوں میں جو ایک بار پاؤں دے دیتا ہے، اس کی باقی زندگی انہی جوتوں کا تسمہ بن کے قید ہو کے رہ جاتی ہے۔ شہد کا چھتہ خالی رہ جاتا ہے۔ شہد کی مکھی اڑ جاتی ہے۔ میٹھی چاشنی پہ چپکتی پر مارنے والی لذت سے لتھڑ کے اپنی منزل بھول جاتی ہیں اور شہد کی مکھی پھر سے گڑ پر اڑنے والی مکھی بن جاتی ہے۔ ہر ''بن باس'' شہد کی بوتل ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ اس کو قطرہ قطرہ بھرنے والا، ہمیشہ شہد کی مکھی بنے رہنے کو ترجیح دے گا اور اس بات پر شکوہ نہیں، سجدۂ شکر ادا کرے گا کہ برسوں وقتی بناوٹی، بناؤ سنگھار کے مرکز سے دور رہا۔ شاید اسی لیے اسے شہد کی بوتل بھرنے کے لیے چنا گیا۔

(ناصر شہزاد کی کتاب ''بن باس'' پر ایک تاثر)

○

درویش صحافی ...... خالد بن مجید

پرسوں دوپہر خالد بن مجید کا فون آیا۔ آواز بے حد کمزور، نحیف اور کپکپاتی ہوئی، ٹھہر ٹھہر کے بول رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔

بابا جی، خیریت تو ہے؟

ادھر سے آواز آئی، بھائی مل لو، ٹکٹ مل گیا ہے۔

یار، چلا تو جاتا نہیں، پھر کس سفر پہ نکلنے والے ہو؟

میں نے شگفتگی چھیڑی، اندر سے ہل گیا کہ کہہ کیا دیا، کیا پوچھ لیا۔ وہی ہوا، خالد بن مجید بولے۔

سر جی، اسی وقت تو اذنِ سفر ملتا ہی، جب چلا نہیں جاتا۔

مٹی کو مٹی بلا رہی ہے، بھائی۔

دیمک منہ کھولے اپنا رزق مانگ رہی ہے۔

میرے اندر سنسناتے سناٹے سرسرانے لگے۔ روح کانپ گئی۔

خالد بن مجید پچھلے سال سے بیمار تھا، یہ میں جانتا تھا۔ مگر میرا ڈاکٹری علم کہتا تھا، درد ہے۔ فوری کوئی خطرہ نہیں۔ میں جاتا پین کلر اور تسلی دے آتا۔ ہسپتال بھی وہ داخل ہوا۔ میں دوسرے تیسرے دن ادھر جاتا۔ اس کے دکھی چہرے کو چھیڑ چھاڑ کے سکھی کر کے آ جاتا۔ ہر طرح کے ٹیسٹ ہوئے۔ ایم آر آئی کی تصویریں ڈراؤنی نکلیں۔ کمر کے مہروں بیچ کسی مہرے کا ٹیومر نکل آیا۔ وہ سپائنل کارڈ کو دبانے لگا۔ درد کی لہریں اس کی ٹانگ میں سرسرانے لگیں۔ جیسے کمر کے اندر سے کوئی سانپ نکل کے دائیں ٹانگ کو ڈستا رہے۔ وہ درد سے بے حال ہو گیا۔ ٹیومر کا پھیلاؤ دیکھ کے نیورو سرجن بھی آپریشن سے کنی کترا گیا۔

ریڈی ایشن لگیں۔ پہلے کچھ افاقہ بھی ہوا۔ رپورٹ بھی حوصلہ افزا آئی۔ میں بھی کچھ مطمئن ہو گیا۔ پھر وہ گھر چلا گیا اور اس دن اچانک اس کا فون آ گیا کہ ٹکٹ مل گیا ہے، مل جاؤ۔

میں بھاگا بھاگا اس کے گھر گیا۔

اس کا گھر میرے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ وہی مجھے اپنے پڑوس میں لایا تھا۔ میرے لیے پلاٹ پسند کیا۔ پھر اسی کی مشاورت سے ڈرائنگ بنی۔ گھر کی تعمیر کے دنوں میں بھی وہ اکثر ادھر آ جاتا اور کہتا، آپ ادھر شفٹ ہو گئے تو پھر آپ کی سٹڈی میں ڈیرہ لگا لینا ہے، سٹڈی بھی بن گئی۔ دوسرا سامان لانے سے پہلے میں اپنی کتابوں کی پیٹیاں ادھر اُٹھا لایا۔ میری کتابیں سات سال سے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (آئی ایس پی آر) کے سٹور میں پڑی تھیں۔ وہیں سے میں ریٹائر ہوا تھا۔ خیال تھا کہ اپنا گھر مکمل ہوتے ہی انہیں اٹھا لے جاؤں گا۔ ساری کتابیں چودہ بڑے لکڑی کے صندوقوں میں بند تھیں۔ فوجی لمبے بوٹوں کی خالی کی ہوئی وہ پیٹیاں تھیں، جن میں کتابیں بھری تھیں۔ خالد بن مجید مجھے بہت ڈراتا تھا۔

کہتا، جناب اِدھر سے کتابیں کہیں اور منتقل کر دیں۔

یہ کتابوں کے لیے بابرکت جگہ نہیں ہے۔

میں ہنسنے لگتا۔

وہ سنجیدگی سے آنکھیں کھول کے سر اوپر سے نیچے ہلاتا اور کہتا، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ آئی ایس پی آر، خالد بن مجید کا میکہ ہے۔ اس نے سسرال بھی اسی کو بنالیا۔ کبھی کبھی جب یہ آئی ایس پی آر سے اپنے یہ دونوں رشتے بولتا تو میں کہتا، خالد بھائی، تمہارا احوال خالہ کے گھر بیاہی لڑکی جیسا ہے۔

کہتا، ہے تو سہی، مگر تھوڑا گھپلا ہو گیا ہے۔

پوچھتا کیا؟

کہتا، خالہ بعد میں سوتیلی ماں بن گئی۔ نہ ساس رہی نہ ماں۔

صرف سوتیلی بن گئی۔

ہم سب اس کی باتوں پہ ہنستے۔ فاروق، یوسف عالمگیرین، امجد، منصور مسخرہ اور میں۔ میں پوچھتا، مگر تو تُو اب تک اس کا سگا ہے۔

وہ بے بس سا ہو کے اک آہ بھرتا اور کہتا، میرا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ یہی جگہ ہے جہاں کم عمری میں بھیجا گیا تھا۔ اب ساری عمر یہاں گزار دی۔ کوئی اور جگہ دیکھی ہی نہیں۔ ایک لیموں کی طرح اِدھر ہی پورا نچڑ گیا۔ اپنے رس کا آخری قطرہ تک اس ادارے کو دے دیا۔ مگر اس ادارے نے بائیس سال کی عمر میں مجھے جس گریڈ میں بھرتی کیا تھا، عین اسی گریڈ میں اب ساٹھ سال کی عمر ہونے پہ ریٹائر کر رہے ہیں۔ یہ پھر اپنی پوری کتھا کھول کے بیٹھ جاتا۔ فاروق الزماں اپنے لیپ ٹاپ پر بیٹھا انگریزی لکھتا رہتا۔ فاروق انگریزی کا سینئر صحافی ہے۔ کسی زمانے میں ''دی نیشن'' کا مدیر بھی رہا۔ فوج سے محبت اسے بھی ادھر لے آئی۔ یہیں کا یہ بھی ہو گیا۔ امجد اٹھتا بیٹھتا اور مسکراتا

پھرتا رہتا۔ وہ انرجیٹک تیکھا قلم کار ہے۔ ابنِ شمسی کے نام سے صحافت کی دنیا میں اپنا نام منوا چکا ہے۔ خالد بن مجید کی طرح امجد بھی کم عمری سے ''ہلال'' سے وابستہ ہے۔ صحافت میں پوسٹ گرایجویٹ ہے۔ کالم، فیچر، رپورٹنگ ہر کام میں ماہر، خوش باش، سمارٹ، مجبتی اور محنتی۔ اسے سیوا کرنے کا چسکا ہے۔ اکثر جب ہماری باتیں لمبی ہونے لگتیں تو وہ ٹی روم کی طرف تازہ چائے اور پکوڑے منگوانے بھاگ جاتا۔ خالد بن مجید اکثر امجد کو خاموشی سے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ کئی بار اس سے پوچھا بھی۔ کیا دیکھ رہے ہو۔ کہتا، اپنی جوانی دیکھ رہا ہوں۔ اسی عمر میں، میں ادھر آیا تھا۔ ڈرتا ہوں۔ اس کا بڑھاپا میرے جیسا نہ ہو۔

منصور مسخرہ خالد بن مجید کی ہر بات کا لطیفہ بنا کے ہنس دیتا۔ دوسروں کو بھی ہنسانے کی کوشش میں لگا رہتا۔ منصور ڈرامہ، فیچر، فلم، سکرپٹ اور پروڈکشن کے فن کے علاوہ ذاتی طور پر ایسا فنکار ہے جسے یہ خود پروڈیوسر ہو کے بھی موقع نہیں دیتا۔ میں خالد کی ہر بات دھیان سے سنتا۔ اصل میں ہر دفعہ خالد اپنی پرانی کہی کہانی میں کوئی نہ کوئی نئی بات کا اضافہ کر دیتا اور اپنی بات کا رخ بدل دیتا۔ اس دن بولا، بھائی سرگودھا میں پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ بی اے پاس کیا۔ اللہ کی مار ایسی پڑی کہ شاعری اور آرٹ کا چسکا پڑ گیا۔

منصور مسخرے کی ہنسی کی پٹاری کھل گئی۔

فاروق بھی اپنے لیپ ٹاپ سے انگلیاں اٹھا کے اپنی سبز آنکھوں میں حیرانی بھر کے ہم سب کو باری باری دیکھ کے سوچنے لگا کہ مسکراؤں یا نہ۔ اس کا یہ محتاط انداز ورلڈ وار فلموں میں جرمن گستاپو جیسا ہے۔ وہ خود بھی کچھ عرصہ جرمنی میں رہا ہے۔ مگر ایک میان میں دو تلواریں کیسے سما سکتیں تھی۔ گستاپو دیس میں گنجائش صرف ایک کی تھی۔

اسے اپنے دیس آ کر گستاپو بننا پڑا۔

منصور ابھی تک ہنسے جا رہا تھا۔

نہیں، اس چسکے کو اللہ کی مار کیوں کہا، میں بظاہر سنجیدگی میں خالد بن مجید سے پوچھ کے منصور مسخرے کی آنکھ میں پھلجھڑی کے فیتے کو آگ لگا دیتا۔

مسخرہ ہنس ہنس کے دوہرا ہو جاتا۔

امجد دروازہ کھول کے باہر نکلتا نکلتا رک جاتا۔

خالد بن مجید چوکنا ہو کے سب کو باری باری دیکھتا پھر بڑی دھیرج سے کہتا۔

بھائی اور کیا کہوں؟

شاعری اور آرٹ کو اللہ کی مار کہہ دیا، کیوں؟

بھائی اور کیا کہوں، اللہ اور اس کی مار کو سمجھنے والوں سے پوچھ لو۔ سمجھ آ جائے گی۔ نظر آ جائے گی۔ وہ سب کی طرف ایسے نظریں گھماتا جیسے دیکھ رہا ہوں کدھر کدھر یہ اللہ کی مار پہنچی ہوئی ہے۔ سب جی کھول کے ہنسنے لگتے۔

میں نے پوچھا۔ خالد، ادھر آئی ایس پی آر میں کیسے گھسے؟

میں تھوڑی آیا تھا۔ پاکستان ٹائمز میں کام کرتا تھا۔ اے بی ایس جعفری ایڈیٹر تھے۔ اِدھر آئی ایس پی آر میں بریگیڈیئر تفضل حسین صدیقی ڈی.جی تھے۔ علم دوست آدمی تھے۔ جانتے تھے کونسی چیز کہاں سے لینی ہے۔ سبزی لینی ہے تو سبزی منڈی جاؤ۔ گھاس اُٹھانی ہے تو گھاس منڈی۔ بس مجھے اُٹھا لیا، گھاس منڈی سے۔

گھاس بیچتے تھے؟ میں نے سنجیدگی سے پوچھا اور مسکراہٹ چھپائے رکھی۔

بھائی، صحافت، ان دنوں گھاس کے مول ہی بکا کرتی تھی۔ یہ تو اب الیکٹرانک میڈیا نے گھاس کا مول زعفران کا لگا لیا ہے۔ کہنے کو تو یہ اب گھاس بھی نہیں رہی بھائی۔

منصور مسخرہ خالد بن مجید کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ خالد بن مجید کے انداز میں جھکا جھکا کمر پہ ہاتھ رکھ کے کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ خالد کے مخصوص انداز میں اسی کے لہجے میں اس کی باتوں کی پیروڈی بناتا۔ ہر بات پیروڈی

میں خالد کے منہ سے نکلے لفظ ''بھائی'' سے شروع کرتا۔ مسخرہ پن اس کے چہرے پہ لکھا رہتا۔ اس دن ایک دم خالد بن مجید بنا کبڑا کبڑا گھاس منڈی اور صحافت کی باتیں کرتا کرتا شرارت میں ایک دم سنجیدہ ہو کے بلند آواز سے پوچھنے لگا۔

آپ کوئی حسینہ تھے، آپ کو اُٹھا لیا؟

بھائی ان دنوں، چہرہ نہیں کام دیکھ کے صحافی اُٹھائے جاتے تھے۔

پھر چہرے اور صحافت کی باتیں ہونے لگیں۔

یہ ساری محفلیں میرے دفتر میں ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ''ہلال'' کا نگران تھا اور ''ہلال'' کی مجلس ادارت کی منڈلی کے یہ سب پھول تھے۔ خالد بن مجید سے میری ملاقات آئی ایس پی آر میں تعیناتی سے بہت پہلے کی تھی۔ منصور مسخرہ بھی ایک زمانے میں میرا پڑوسی رہا تھا، تب وہ سب مجھے ایک ادیب اور میڈیکل ڈاکٹر کے طور پر جانتے تھے۔ نہ انہیں گمان تھا کہ کبھی میں آئی ایس پی آر میں پوسٹ ہو جاؤں گا نہ مجھے اس کا شائبہ تھا۔ میرا کام تو فوجی ہسپتالوں یا میڈیکل بٹالین میں دکھی بیمار فوجیوں کو شفا دینا تھا۔ جنرل شاہد اقبال کھاریاں چھاؤنی میں میرے گیریژن کمانڈر تھے۔ پیشہ وارانہ امور میں تو کمال ماہر تھے ہی علم و ادب اور کلچرل حساسیت کے میدان میں بھی وہ یکتا تھے۔ فوجی وردی میں وہ شاید اپنے عہد کے واحد سوچ اور پرکھ کی لاج رکھنے والے دانشور جنرل تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے کچھ سال سینئر تھے۔ میری کتابیں پڑھ کے انہوں نے کور کمانڈر جنرل جاوید عالم کو پڑھا دیں۔ پھر دونوں نے جی ایچ کیو میں نجانے کس سے کیا بات کی کہ میری پوسٹنگ آئی ایس پی آر میں ہو گئی۔ میڈیکل کا بستر بند ہو گیا۔ سٹیتھوسکوپ کہیں گم گئی اور میں ادھر رائٹرز یونٹ کا سربراہ اور ''ہلال'' کا نگران بنا دیا گیا۔ ادھر آیا تو ''ہلال'' کی یہ ٹیم مجھے مل گئی۔ ایک سے بڑھ کے ایک ان میں نگینہ تھا۔

خالد بن مجید تو آئی ایس پی آر کا سب سے پرانا درخت ہے، آئی ایس پی آر کے احاطے میں کوئی سوا سو سال پرانا ایک پیپل کا درخت تھا۔ منصور کا کہنا تھا کہ یہ خالد بن مجید کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ خالد مجھے کہا کرتا، سر یہاں جس کرسی پہ آپ بیٹھے ہیں، اس پہ بتاؤں کون کون بیٹھ چکا ہے، جی ایم اثر، فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت، زیڈ اے سلہری، ابن الحسن، حفیظ جالندھری، عنایت اللہ، سید ضمیر حسین جعفری، عارف عبدالمتین، صدیق سالک۔

مسخرہ پھر ہنسنے لگتا۔

میری کرسی پہ ہاتھ مار کے کہتا۔ اُف، خدا کا خوف کرو، بابا جی۔ یہ چھ مہینے پہلے خریدی ہے۔ دیکھ، پہیوں والی گھومتی کرسی ہے۔ وہ میری کرسی کو ہاتھ سے فرش سے دھکیل کے خالد کو دکھاتا، میں کرسی پہ بیٹھا بیٹھا گرنے سے بچنے کی اداکاری کرتا۔ وہ پھر خالد بن مجید سے مخاطب ہوتا، یہ کرسی تھی پرانے بابوں کی؟

خالد بن مجید میری طرف شکایت سے دیکھتا۔ سر اسے سمجھائیں۔

یار، یہ مسخرہ ہے، مسخریاں ہی کرے گا۔ آپ بتائیں آپ کو اٹھوایا کس نے تھا؟

مسخرہ پھر کھیس کھیس ہنسنے لگتا۔

امجد ٹی روم کے ویٹر سے ہمارے سامنے پکوڑوں بھری پلیٹیں رکھوانے لگتا۔ سر بتایا نہ، یہاں بریگیڈیئر تفضل حسین صدیقی سربراہ تھے۔ پاکستان ٹائمز کے مدیر اے بی ایس جعفری سے ان کا یارانہ تھا۔ انہوں نے اسے کہا کچھ پروفیشنل صحافیوں کو کچھ دن کے لیے مستعار دے دیں۔ اس نے مجھے ادھر بھیج دیا۔ پینتیس سال ہو گئے۔ وہی مستعار ڈیوٹی چل رہی ہے۔ پرانے لوگوں کو پتہ تھا کہ یہ آئی ایس پی آر قلم کی جگہ ہے۔ قلم کے لوگ ادھر رہنے چاہیے۔ قلم والے ملتے کہاں سے ہیں۔ بس لے آئے۔ اب تو قلم والے اک اک کر کے قلم کیے جا رہے ہیں۔ کوئی جگہ ہی نہیں رہی ان کے

رہنے کی۔ یہاں بھی ایسے لوگوں کی تلاش کا دور گیا۔ اللہ جانے آپ کیسے ادھر پوسٹ ہو گئے۔ قلم دوستی یہاں سے اٹھے تو عرصہ ہو گیا۔

فکر نہ کرو، ہم بھی اٹھ جائیں گے۔

اٹھا دیں گے آپ کو، دیکھ لیجئے گا۔ بھائی اب یہاں پروفیشنل ازم نہیں ہے۔ یہاں وہ افسر پوسٹ کیا جاتا ہے جس کی جیب میں قلم نہ ہو۔ بس اسے اس شہر میں پوسٹنگ کی مجبوری ہو۔ سفارش اس کی تگڑی ہو۔ کہیں اور اس کے لیے جگہ نہیں بن پاتی تو اسے ادھر بھیج دیا جاتا ہے۔ ادھر آ کے وہ اس علمی ادارے کو انفنٹری پلٹن کی طرح ہانکنے لگتا ہے۔ ہنک رہے ہیں۔ بھائی۔

بھائی، کہہ کے منصور مسخرہ پھر طرح مصرع اٹھا لیتا اور خالد بن مجید کی طرح کبڑا کبڑا عاجزی سے چلنے کی اداکاری کرنے لگتا۔

بھائی، یہ مذاق نہیں، سنجیدگی سے سننے والی باتیں ہیں۔

خالد بن مجید ایک دم جلال میں آ جاتا۔ منصور کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں کہنے لگا۔ جانتے ہو، کونسا ادارہ ہے؟ کتنا مقدس ادارہ ہے۔ کتنا اہم ہے۔ یہ ہماری قوت اور سیکورٹی کی تصویر کشی کا ضامن ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے انگریزی فوج کا اخبار ''سولجر'' یہاں سے نکلتا تھا۔ بٹوارا ہوا۔ ہم بے وطنوں کو آزاد وطن ملا، پاکستان۔ اس وقت سے یہ آئی ایس پی آر پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا محافظ ہے۔ ادھر انڈیا والوں نے اپنے مجلّے کا نام ''سینک سماچار'' رکھ لیا۔ ہم نے شروع میں نام رکھا تھا ''مجاہد''۔ پھر بدل کے ''ہلال'' رکھ لیا۔ اس ادارے میں انگریز کے وقت کے آرکائیو تھے۔ سیکنڈ ورلڈ وار کے فلم رول تھے۔ تصویریں تھیں۔ تراشے تھے، اخبارات تھے۔ پھر جس دن سے پاکستان بنا، ایک ایک دن کا اخبار، مہینے کے بنڈل بنا کے تیار مجلد، ہمارے ملکی اور غیر ملکی اہم جرائد کی فائلیں، 65ء اور 71ء کی جنگوں کی اخباری

رپورٹیں، تصویریں، انٹرویوز، آپ کے فوجی علم پہ دنیا میں چھپی ہر کتاب، ہر انسائیکلوپیڈیا، نایاب نسخے۔ پوری ایک لائبریری تھی یہاں۔ ساتھ آڈیو، ویڈیو سنٹر۔ تم لوگوں کو پتہ کیا ہے۔ یہاں کیا کچھ تھا۔ میں کوئی ناحق دیوانہ نہیں ہوا اس کا۔ کون ہے تم میں سے جسے اپنے ملک اور فوج سے عشق نہیں۔ ہے نا۔ اسی عشق کی دیوانگی نے تو یہ حال کیا ہے بھائی۔ وہ اپنا شکستہ گریباں چاک کرنے کے انداز میں دکھانے لگتا۔ یہ ہمارے دل میں ہے، خون میں ہے۔ یہ ادارہ ہمارا اپنا ہے۔ اس ادارے میں وہ لائبریری اور آرکائیو اس ادارے کا سرمایہ تھا۔

تھا؟ کیا اب نہیں ہے۔

خالد بن مجید عجیب طرح سے ہنسا، جیسے رودیا ہو اور زیرلبی بولا، تھا، بھائی۔

پھر اس کا کیا بنا؟ کدھر گیا وہ سرمایہ؟

مجھے یاد ہے، جب پہلی بار میں نے خالد بن مجید سے یہ سوال کیا تو اس کے چہرے پہ ایسا کرب آیا، جیسے اسے اپنی ماں کی موت یاد آ گئی ہو۔ چہرے کا رنگ اترا۔ آنکھیں اندر سے اُمڈ کے آئے آنسوؤں کو روکتے روکتے گرل سی ہوگئیں۔ ماتھے پہ ایک تریڑ آئی اور وہ بے بسی میں ہاتھ پھیلا کے خاموشی سے کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کیفیت سے گزرا، پھر سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ پھر پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا مجھے۔

تمہارے ہارٹ اٹیک کا اس قومی ورثے سے کیا تعلق؟

سر، جسے آپ قومی سرمایہ مان رہے ہیں، تھا بھی وہ قومی ورثہ۔ وہ سارے کا سارا آٹھ روپے کلو کے حساب میں ردی میں بیچ دیا گیا۔ بتیس ہزار میں پوری کی پوری لائبریری اور سارا آرکائیو بک گیا۔

ردی میں بیچ دیا؟ میں کرسی سے اٹھ کی کھڑا ہوگیا۔

یہ تو قومی جرم ہے۔ کس نے کیا ایسا؟

یہی جو آپ کے سربراہ ہیں۔ اور کون کر سکتا ہے ایسا بیوپار؟

کب کی بات ہے؟

اسی مشرف دور کی بات ہے، آپ کی پوسٹنگ سے چھ مہینے پہلے کی۔ یہ جو کیفی ٹیریا اور کانفرنس روم ہے۔ جگ مگ جگ مگ بتیوں والا۔ جہاں بیٹھ کے ٹی وی انٹرویو دیے جاتے ہیں۔ یہاں پوری لائبریری اور آرکائیو تھا۔ چاروں طرف بک شیلف لگے تھے۔ کتابیں ہی کتابیں، رسالے، اخباروں کے بنڈل تھے۔ خالد بن مجید کے چہرے پر دکھ کا بم پھٹ گیا۔ چہرہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ آنکھوں سے دو تین بوندیں ٹپکیں اور وہ پھر سے ہاتھ ملنے لگا، جیسے وہ سارا واقعہ پھر سے دیکھ رہا ہے۔ بولا، میں باہر سڑک سے اندر آیا۔ دیکھا۔ لائبریری کی کتابوں کو چار پانچ مسٹنڈے قسم کے لوگ اُٹھا اُٹھا کے دروازے سے باہر برآمدے کے ننگے فرش پہ پھینک رہے ہیں، جیسے اینٹ روڑے ہوں۔ اینٹ روڑوں کو بھی احتیاط سے پھینکا جاتا ہے کہ کہیں کوئی کنارا بھر نہ جائے۔ وہ تو ردی میں خریدا مال تھا۔ بنڈل کے بنڈل اُٹھا کے دھڑم دھڑم فرش پہ پھینکتے۔ پاکستان ٹائمز، امروز، مشرق، مساوات، نوائے وقت، جنگ، مارننگ نیوز، ڈان، چٹان، انقلاب، زمیندار سب اخباروں کے جلد کیے بنڈل، ماہ بہ ماہ کا سارا ریکارڈ۔ ملکی اور غیر ملکی جرائد، اُردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، حکایت کے بنڈل، ٹائمز، لائف، نیوز ویک، ریڈرز ڈائجسٹ، کیا کیا بتاؤں سب زمین پہ بکھرے ہوئے، کالے چمڑے میں جلد کیے ان کے بنڈل۔ 1947ء کے زمانے سے، کچھ اس سے بھی پرانے انگریزی دور کے۔ سیکنڈ ورلڈ وار کی خبروں سے بھرے۔ باہر برآمدے میں کھڑا ردی خریدنے والا ٹھیکیدار ان مجلد اخباروں کے ایک ایک بنڈل کو اٹھا کے ایک گتے پہ پاؤں رکھ کے اس کی جلد ہاتھ میں پکڑ کے زور سے کھینچتا، جیسے ذبح کیے بکرے کی کھال اتاری جاتی ہے۔ ایک پاؤں مار کے وہ جلد کے گتے ایک طرف کرتا،

دوسرے پاؤں سے اندر سے نکلے اخباروں کی تہہ کو۔ پھر کتابیں برآمدے میں پھینکی جانے لگیں۔ جو مجلد تھیں ان کی چمڑی بھی ویسے ہی اتری، جو غیر مجلد تھیں انہیں پیروں کی ٹھوکروں سے ایک طرف لڑھکا دیا گیا۔ کون سی کتاب کس موضوع، کس زبان میں ہے، ردی کے بیوپاری کا اس سے کیا تعلق۔ عجیب منظر تھا، سر آپ کو کیا بتاؤں۔ اس نے پھر بائیں ہاتھ سے دل کی جگہ سے سینہ پکڑ لیا۔ بولا، میرا تو دل کٹ گیا۔ میں لپک کے گیا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کر رہے ہو؟ یہ پوری قوم کا سرمایہ ہے۔ آنے والی نسلوں کو دکھایا جانے والا ہمارا گزرا کل ہے یہ۔ خدا کا خوف کرو۔ کون ہو تم لوگ؟

ہمارا مال ہے یہ اب، تم کون ہو؟

میں بے بسی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں تو بے وردی ملازم ہوں۔ آپ جیسے وردی میں ملبوس ہمارے افسر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کسی کے چہرے پہ کوئی تردد نہیں تھا۔ کسی کو احساس نہیں تھا کہ گھر اجڑ رہا ہے۔ ماں کا جہیز بک رہا ہے۔ میں کس سے کہتا۔ ساتھ ہی جنرل صاحب کا دفتر تھا۔ ان کے دروازے پہ میری رسائی نہیں تھی۔ جن کی تھی وہ آ جا رہے تھے۔ جو ادھر جاتا پہلے اپنی وردی کی سلوٹیں سیدھی کرتا۔ ٹوپی کھینچ کے ترچھی کرتا۔ چمکتے جوتوں کی چمک دیکھ کے پتلوں کی کریز سیدھی کرتا۔ بیلٹ کھینچ کے باندھتا۔ بڑھا پیٹ سانس اندر کھینچ کے گم کرتا۔ پھر سر سے پاؤں تک اپنے جسم کے چوکھٹے میں ایک اعلیٰ جی حضوری کی تصویر بنا کے اس کے دروازے کو درگاہ سمجھ کے ہاتھ لگاتا۔ دفتر کا دروازہ شیشے کا تھا، کالے شیشے کا۔ اندر سے باہر کا سارا منظر جنرل دیکھتا رہتا۔ باہر سے اندر کا کسی کو بھید نہ ملتا۔ کسے کہتا۔ وہ سب کچھ عین افسر اعلیٰ کے دفتر کے برابر میں ہو رہا تھا۔ میں فریاد لے کر کدھر جاتا۔ وہیں سینہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ سینے میں درد کی برچھی کھب گئی۔ ہڈیوں میں برف جم گئی۔ دل میں جیسے برف توڑنے والا سوا آر پار ہو گیا۔ درد کی پچکاری نکلی، ماتھے پہ تریلیاں آ گئیں، آنکھوں کے سامنے

اندھیرا ہو گیا، جیسے دن دیہاڑے سورج چوری ہو گیا ہو۔ شام ہو گئی ہو۔ اندھیرا ہو گیا۔ میں وہیں قتل ہوتی کتابوں کے مقتل میں گر گیا۔ یہ امجد، یوسف عالمگیرین اور بشیر احمد تینوں میرے سویلین ملازم ساتھی بھاگے آئے۔ مجھے کھینچ کھانچ کے وہاں سے ہسپتال لے گئے۔ تین مہینے میں ہسپتال میں رہا۔ دل کا عارضہ ختم ہوا تو ڈیپریشن ہو گیا۔ انہوں نے پاگل خانے میں بھرتی کرا دیا۔ بھائی کیا کیا سنو گے؟ سنایا نہیں جاتا۔ پھر ہسپتال بھجوانا ہے؟

اب تو ہسپتال ادھر آ گیا ہے، یہ کرنل بیلا ڈاکٹر بھی ہیں۔

مسخرہ سنجیدگی میں پھر مزاح کی پیوندکاری کی کوشش کرتا۔

خالد بن مجید ابھی تک اسی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ کہتا، وہ انہیں ڈاکٹری کے لیے اِدھر نہیں لائے۔ ہلال کے نگران ہیں۔ رائٹر ہیں سکہ بند۔ خالد بن مجید منصور پہ حملہ آور ہو جاتا۔

منصور پھر حیران حیران سا چہرہ بنا کے مسخری میں جھکنے لگا، اچھا، مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔

او مسخرے، چپ، اتنا بڑا سانحہ ہو گیا، تمہیں مسخریاں سوجھی ہیں۔ یونہی مسخرے پن میں تم مزاح والوں نے کیا کیا اجاڑ دیا۔ بڑے سے بڑے المیے کو بھی لطیفہ بنا دیا۔ اس سے بھی بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ اب دکھ کی بات پہ دکھی بھی نہیں ہونے دیتے۔ خاموش رہو۔ میں نے میجر منصور کو ڈانٹ دیا۔

سر اللہ کی قسم میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔ منصور حلفیہ بیان لکھوانے لگا۔ تمہیں کون الزام دیتا ہے۔ میں حیران ہوں، بتیس ہزار جنرل شوکت سلطان جیسے شان و شوکت والے افسر کے لیے کیا اہمیت رکھتے تھے۔ اتنا تو وہ ایک دن مہمانوں کی تواضع پہ خرچ کر دیتے تھے۔ پھر وہ قومی سرمایہ کیوں بیچا؟

انہیں وہ کمرہ چاہیے تھا، سر۔ خالد بن مجید آہستگی سے بولا۔

جرنیل راؤنڈ پہ چھڑی لے کر نکلے۔ یہ کیا ہے؟ وہ کیوں ہے؟ ادھر کب سے ہے؟ کیا ضرورت ہے اس کی؟ فضول ٹریش کیوں جمع ہے؟ کتنی معقول جگہ ہے۔ کھلا کمرہ ہے۔ یہاں پریس کانفرنس روم بناؤ۔ ساتھ کیفے ٹیریا، فائیو سٹار سروس، اٹالین پیزا، یورپین نگٹ، میکڈونلڈ سٹائل ڈچ چیز برگر، کے ایف سی والے سپائسی روسٹڈ ونگز، سموک ڈرائی سائمن فش، انڈرسٹینڈ۔ ساتھ چلے آئے پرچی قلم لے کر باادب سٹاف افسروں نے ہر کہی بات جوں کی توں نوٹ کی۔ حکم لکھنے کے بعد وفاداروں کی ایک ہی آواز آئی، یس سر، ساتھ ہی ساتھ وہ ادب سے دہرے ہوئے اپنے اپنے چہروں پہ ایسی فدویانہ خوشامدی مسکراہٹ لاتے جیسے اقوال سقراط لکھ رہے ہوں۔ بس یہ ساڑھے پندرہ سیکنڈ کا جنرل صاحب کا راؤنڈ تھا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ تین چار ٹھیکیدار بلوائے گئے۔ ایک نے بولی جیت لی۔ پون صدی کی لفظ بالفظ تاریخ، ہر دن کا اخبار، سال ہا سال کے جرائد، فوٹو البم، سب کچھ بک گیا۔ قائداعظم کی افواج کے ساتھ تصویروں کا نایاب خزانہ تھا، وہ بھی اسی بھاؤ تل گیا۔ بک گیا، کچھ تصویریں میں نے ٹھیکیدار کے پیروں کے پاس بنی ڈھیری سے اُٹھالیں۔ ایک بار تو ٹھیکیدار نے میرے ہاتھ میں پکڑی قائد کی کچھ تصویروں کو میرے ہاتھ سے لے کر ہاتھ ہی ہاتھ میں تولا۔ جب اسے اندازہ ہوا آدھے کلو سے کم ہیں تو شاید اس نے حساب لگا کے سوچا کہ چار پانچ روپے کے مال پہ اس بوڑھے سے کیوں الجھوں، الٹا ہاتھ مار کے اس نے گویا وہ خیرات مجھے دے دی۔ ان تصویروں کو میں نے لکڑی کے بلاک پہ لگوایا۔ ایک یہ جو آپ نے اپنے پیچھے لگائی ہے، قائداعظمؒ ایک پاکستانی میجر جنرل کے ساتھ بیٹھے ہیں، کہیں اور دیکھی؟

نہ۔

یہ میجر جنرل نذیر ہیں۔ نیم پلیٹ سے پڑھا جا رہا ہے۔

ہاں سر، ایک بار ان کے گاؤں کا ایک آدمی ملا تھا۔ اس نے یہ تصویر مانگی تھی۔ میں نے نہیں دی۔

یار اتنا بڑا خزانہ ضائع ہو گیا۔

ہو گیا سر، سب اجڑ گیا۔

جگہ چاہیے تھی تو یہ اخباروں کے بنڈل، جرائد، کتابیں کسی دوسری لائبریری کو دے دیتے۔ کسی یونیورسٹی کو ہدیہ کر دیتے۔ ردی والے کو کیوں دیں؟

اس ملک میں پکوڑے نہیں بیچنے؟

ان میں پکوڑے بکے؟

اللہ ہی جانے، ٹھیکیدار خود بار بار بول رہا تھا، آٹھ روپے کلو زیادہ قیمت لگا دی۔ پیلے بدرنگ نرم ہوئے خستہ کاغذ ہیں، ان میں تو پکوڑے بھی نہیں بکنے۔

خالد بن مجید کی باتیں سن کے میں خود کئی دن اداس رہا۔ آئی ایس پی آر سے ریٹائر ہوا تو میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا ڈائریکٹر جنرل بن کے چلا گیا۔ میری کتابوں کے چودہ لکڑی کے صندوق آئی ایس پی آر کے سٹور میں پڑے رہے۔ امجد نے کئی بار مجھے کہا، سر اجازت دیں تو میں یہ اپنے گھر لے جاؤں۔ سنبھال کے رکھوں گا۔ یہاں خطرہ ہے۔ دیمک کھا جائے گی، آپ کی کتابوں کو۔

تم سے بڑی دیمک کون ہے، کتاب چاٹ۔ میں اسے ٹال دیتا۔ چار سال بعد میرا گھر مکمل ہوا تو میں ٹرک لے کر کتابیں اٹھانے چلا گیا۔ اس دن اپنی کتابوں کی پیٹیاں دیکھ کے میرا بھی وہی حال ہوا جو خالد بن مجید کا لائبریری اور آرکائیو ردی میں بکتے دیکھ کے ہوا تھا۔ میری کتابوں کے چودہ کے چودہ لکڑی کے صندوقوں کے باہر دیمک گھروندوں کی مٹی کے ڈھیر چڑھے تھے۔ میں لرز گیا۔ کھڑا کھڑا جیسے گرنے لگا۔

میرے دل میں بھی درد کی لہر اُٹھی۔ میں ڈوبتے دل کو پکڑ کے وہیں بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ کھڑے امجد کا رنگ بھی اڑ گیا۔ اس کا چہرہ پیلا ہو گیا۔ ہم دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور تڑپ کے رہ گئے۔ سمجھ نہ آئے کیا کریں۔ دل سے دعائیں اٹھ رہی تھیں۔ اللہ بچا لینا میری کتابیں۔ جی چاہتا تھا کوئی تسلی دے دے۔ گھر جا کے پیٹیاں کھولنی ہی تھی، کوئی معجزہ ہو جائے۔ اپنے پرانے دفتر گیا ادھر فاروق بیٹھا تھا۔ ساتھ یوسف عالمگیرین۔ انہیں کتابوں کی پیٹیوں کی ہیئت بیان کی۔ دونوں دکھی ہو گئے۔ سب چپ، میں کہوں دعا کرو اللہ میری کتابیں بچالے۔ فوجی جوتوں کی پیٹیاں تو دیمک نے کھالیں، اندر کی کتابیں خدا بچالے۔ یوسف عالمگیرین ہے تو درد دل والا، مگر دکھی ماحول میں بھی اپنی شخصیت کی شگفتگی بچائے رکھتا ہے۔ دکھی دل کو بہلانے کے لیے بولا، سر، اللہ نے ساری مخلوقات پالنی ہیں، دیمک سمیت۔

تو اللہ کو کہہ، ان پیٹیوں میں میری میڈیکل کی کتابیں بھی ہیں، وہ کھلا دے دیمک کو۔

یوسف عالمگیرین ابھی تک مزاح نگار بنا ہوا تھا۔ بولا، جناب یہ تو دیمک کی چوائس پہ ہے اسے کیا پڑھنا ہے۔

تو دیمک کا طرف دار ہے یا میری کتابوں کا؟ میں نے پوچھا۔

سر، ہم شاعر لوگ دیمک کے قبیلے سے ہیں۔ اسی کی طرف داری کریں گے۔ آپ ناول نگار ہیں۔ آپ دیمک پہ ناول لکھ دیں۔ موٹی کتاب کا دیمک سے بڑا شوقین کوئی نہیں۔

نہ۔ دیمک اللہ کے حکم سے باہر تھوڑی ہے۔ وہ تو اندھی ہوتی ہے۔ اسے اللہ ہانکتا ہے۔ جس کتاب کو تلف کرنا ہو اس کی طرف۔ جسے محفوظ رکھنا ہو، دیمک کو خدا اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ تم مسخرے شاعر دیمک کو مخول نہ کرو خدا کی وہ سپاہ ہے

جیسے ہلاکو خان کی تھی۔ خدا ہر غیر نافع لکھے لفظوں بھرے کاغذوں پہ دیمک چڑھا دیتا ہے۔ سمجھے۔

یوسف مسکراتا مسکراتا، خاموش ہو گیا۔ بولا، سر یہ تو آپ پیٹیاں کھول کے ہی دیکھ پائیں گے۔ مجھے بھی پیٹیاں کھولنے کی جلدی تھی اور خوف بھی۔ امجد میرے ساتھ تھا۔ ٹرک پہ دیمک بھری مٹی چڑھی کتابوں کی پیٹیاں لاد کے میں اپنے نئے گھر کے مین گیٹ کے باہر سڑک پہ پیٹیاں اترانے لگا۔ چودہ پیٹیوں میں سے تین پیٹیوں کی کتابوں کو دیمک نے چھوا تک نہیں۔ ساری سلامت، باقی جو پیٹی کھولتا اندر کتابوں کا قبرستان بنا ملتا، کتابوں کی قبریں، قطار در قطار۔ میں نے سال ہا سال کی محنت سے زیادہ تر کتابوں پہ پلاسٹک کور چڑھائے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کور نے اندر کتاب پوری کی پوری مٹی ہوئی تھی، قبر بنی ہوئی اوپر پلاسٹک کور کے نیچے موٹی رنگین سرورق جیسے قبر کا کتبہ۔ پورے کا پورا صندوق کتابوں کی قبروں سے بھرا ہوتا۔ اس دکھ بھرے ماحول میں کچھ عجیب انہونیاں دیکھی۔ مٹی مٹی ہوئی کتابوں کے ڈھیر میں سے کچھ کتابیں بالکل سالم بچی پڑی تھیں۔ دیمک ان کے کسی ایک کونے سے بغیر کاغذ کھرچے قطار بنا کر گزری نظر آتی۔ ذرا سی مٹی ٹائٹل پہ ہوتی جو کپڑا ملنے سے اتر جاتی اندر پوری کی پوری کتاب سالم۔ کتاب کی ایک سطر بھی دیمک نے نہ چھوئی ہوتی۔ سارے کاغذ سلامت۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں کی کتابیں پوری کی پوری مٹی۔ میں بے سرت ہوا یہ عجیب مشاہدہ کر رہا تھا۔ امجد کتابوں کی پیٹیاں کھول کھول کے کتابوں کی قبروں سے زندہ کتابوں کا الگ ڈھیر بنا رہا تھا۔ مجھے ایک دم خالد بن مجید یاد آ گیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی انہونا لمحہ ہے جسے خالد بن مجید کا دیکھنا ضروری ہے۔ میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور جا خالد بن مجید کے گھر گھنٹی بجائی۔ وقت شام کا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ خالد بن مجید پیروں میں ہاتھ روم چپل پہنے باہر آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ

پکڑ کے گاڑی میں بٹھایا اور بولا، چلو۔

بولا، سر کپڑے بدل لوں۔ کدھر؟

کچھ نہ پوچھو۔ ایک منظر تم نے دیکھنا ہے۔ اسے دیکھنے سے پہلے کچھ نہ پوچھنا۔

گاڑی میں ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ نہ اس نے کچھ پوچھا، نہ میں نے کچھ کہا۔ میرے چہرے کی سنجیدگی اور سر سے پاؤں تک دکھ کی دھمک سے وہ سہا ہوا تھا، چپ بیٹھا رہا۔ گاڑی میرے گھر کی سڑک پہ مڑی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹیں جل رہی تھیں۔ گاڑی میرے گھر کا موڑ مڑی تو گاڑی کی روشنی میں گھر کے گیٹ باہر لکڑی کی بے ترتیب، ٹوٹی، بکھری پٹیاں اور کتابوں کے مٹی مٹی ہوئے ڈھیروں پہ روشنی پڑی۔ مجھ سے گاڑی اور آگے نہ لے جائی گئی۔ گاڑی بند کی، اس کی ہیڈ لائٹ جلنے دی۔ جیسے پروانہ لپک کے شعلے کی طرف جاتا ہے، اسی طرح خالد بن مجید لپک کے کتابوں کے ڈھیر کی طرف دوڑا۔

خاموش۔

کتابوں کے پاس آتے ہی، اس نے صرف قرآنِ پاک کا ایک جملہ کہا۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

اور مری ہوئی کتابوں کے ڈھیر پہ آ کے ایسے بیٹھ گیا، جیسے اپنے کسی پیارے کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے بیٹھا ہو۔

سب چپ۔ امجد سے بھی کچھ کہا نہ جائے۔ ساتھ بیٹھا فہد بھی خاموش۔

فہد آئی ایس پی آر کا بندہ نہیں۔ امجد کا ہم عمر ہے اور میرا یار۔

بہاولپور سے آ کر یہاں ایک گوروں کی ٹیلی کام کمپنی میں کام کرتا ہے۔ کتاب اور صاحب کتاب کی عزت کرنے والا۔ دونوں کتابوں کو چھانٹ چھانٹ کے تین قسم کے ڈھیر بنا رہے تھے۔ پہلا سولہ آنے ٹھیک کتابیں دوسرا نیم دیمک زدہ مگر قابل

استعمال۔ تیسرا ڈھیر مٹی مٹی ہوئی کتابوں کی قبریں۔ خالد بن مجید تیسرے ڈھیر کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بھی مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ دیمک جیسے اس کی لہو شریانوں میں سرکتی اس کی روح چاٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا اس کا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ سردیوں کے دن تھے، رات پڑ گئی۔ ہم نے بچی کھچی کتابوں کے ڈھیر کو گیراج میں پڑی چارپائیوں پہ ڈال دیا۔ مٹی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کو گھر کے باہر ہی سامنے والی ایک خالی جگہ پہ سرکا دیا۔

خالد بن مجید نے وہاں صرف ایک بات کی۔ بولا، سر، اس دیمک زردہ ڈھیر کو جلا دینا۔ مگر اسے آگ خود لگائیے گا۔ انہیں جلتا ہوا بھی دیکھئے گا۔ جب تک یہ سارا ڈھیر جل نہ جائے، وہاں سے جائیے گا نہیں۔ پھر جو بھی درد سینے میں جمع ہو، اسے اس خزانے کے لٹ جانے کا نعم البدل سمجھئے گا۔ وہ شاید اس لمحے شاہ تبریز بنا مجھے رومی سمجھ کے حکم دے رہا تھا۔ میرا ذہن انسانی موت اور کتاب کی موت کی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔ میرے سامنے عجیب مشاہدے تھے۔ میں خالد، فہد، امجد تینوں سے مخاطب ہوا۔

تم دیکھ رہے ہو، عجیب راز آج کھل رہے ہیں۔

ایک ہی لکڑی کے صندوق میں اوپر نیچے پڑی کتابوں کے ڈھیر میں کونسی کتاب مر گئی کونسی زندہ بچی، یہ دیکھ رہے ہو۔

تینوں کتابوں کو چھانتے چھانتے ہاتھ روک کے مجھے تکنے لگے۔

یہ دیکھو۔ خدا کن کتابوں کو محفوظ کر رہا ہے، کن کو تلف۔

کن کتابوں نے رہنا ہے، کن کتابوں نے نہیں۔

یہ دیکھو، ''شہاب نامہ'' بچ گیا۔

ساتھ پڑی ''علی پور کا ایلی'' آدھی ختم ہو گئی۔

''سفر در سفر'' کو کچھ نہیں ہوا۔

یہ اوپر نیچے پڑی شاعری ساری دیمک چٹ کر گئی۔

ممتاز مفتی کی ''الکھ نگری'' بچ گئی۔ ''لبیک'' کو تو دیمک نے چھوا تک نہیں۔

''یہ سو بڑے بادشاہ''، ''سو بڑے شہر'' یہ بادشاہوں کی ساری تاریخ کتابیں، یہ شعر و سخن، نقد و نظر، تبصرے اور فتوے۔ میں، میں کرتی آپ بیتیاں، تو تو سے لتھڑے مباحث، یہ حاشیے، تشریحیں سب دیمک کھا گئی۔ دیکھو کلیاتِ اقبال کی جلد تک کو خراش نہیں آئی۔ دیوانِ غالب محفوظ رہا۔ فیض احمد فیض کا سارا کلام سالم پڑا ہے۔ فراز کی شاعری کا ایک نقطہ نہیں ہلا۔ حالاتِ حاضرہ قسم کی سیاسی ڈھونگ کتاب ایک بھی نہیں بچی۔

وہ تینوں، تینوں ڈھیروں میں پڑی کتابیں دیکھ دیکھ کے سر ہلانے لگے۔ امجد نے میرے کندھے پکڑ کے خوشخبری سنانے کے انداز میں کچھ کہنا چاہا۔ مجھے سمجھ نہ آئے۔ ایسے اداس لمحے میں کوئی اچھی خبر بھی ہو سکتی ہے۔

بولا۔ سر، آپ نے غور کیا؟

کیا؟

آپ کی اپنی لکھی کتابیں بھی انہی پیٹیوں سے نکلی ہیں۔ اوپر نیچے مٹی مٹی ہوئی کتابوں کے ڈھیر میں بھی آپ کی اپنی لکھی کسی کتاب کو دیمک نے نہیں کھایا۔ وہ ساری بچ گئیں۔ کوئی ایک بھی نہیں مری۔ یہ دیکھیں۔ اس نے ایک ایک کر کے میری کتابیں صحیح و سالم اُٹھا اُٹھا کے مجھے دکھانا شروع کر دیں۔ یہ انہونیاں، کن فلاور، رنگ پچکاری، زیرلبی، مفتی جی، لب بستہ، عرضی، بوندا باندی اور پاکستان کہانی پر بنے سبز ہلالی پرچم کو تو جیسے دور سے ہی دیمک سلامی دیتی گزری ہے۔ ایک نشان تک نہیں اس کا۔ میرا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' تو ان میں سے کسی پیٹی میں تھا ہی نہیں۔ وہ کیسے دیمک کی زد میں آتا۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ دیکھی کہ سیرت پاک ﷺ کی کسی

کتاب کو بھی چھونے کی دیمک نے جسارت نہ کی۔ کچھ کتابوں میں کمال ہنرمندی سے دیمک نے ڈیزائننگ کی تھی۔ ایک طرف سے ترچھی آدھی کتاب دیمک چٹ کر گئی۔ اوپر کے حصے کو چھوا تک نہیں۔ ایک جلد کے اندر جلی لفظوں میں رسول آخر ﷺ کا نام نامی لکھا تھا۔ دیمک اس نام کے نیچے نیچے سے سر جھکا کے ادب سے گزر گئی۔ نیچے کی پوری کتاب کھالی۔ اوپر کا حصہ نام مصطفیٰ ﷺ کے صدقے سالم چھوڑ دیا۔

میرے گھر میں اس وقت تک گھر کا کوئی دوسرا سامان نہ آیا تھا۔ بیسمنٹ میں بنی میری سٹڈی میں صرف کتابیں تھیں۔ ہم گیراج میں کتابوں کے چودہ صندوق ٹھکانے لگا کے نیچے بیسمنٹ میں بنی سٹڈی میں آ گئے۔ ہیٹر جلایا، کھانے پینے کو کچھ منگوایا۔ خالد بن مجید سٹڈی میں آتے ہی خوش ہو گیا۔ سٹڈی میں سارے شیلف باہر گیراج میں پڑی زندہ مردہ کتابوں کے بغیر ہی بھرے ہوئے تھے۔ بولا، یہ کونسی کتابیں ہیں؟

یار، ان سات سالوں میں جو اکٹھی کرتا رہا۔ کچھ وہ ہیں۔ کچھ وہ جو کھاریاں سے آئی ایس پی آر پوسٹنگ کے سمے میں نے صندوقوں میں بند نہ کیں، اپنی گاڑی میں لاد کے لاتا رہا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جنہیں ان دنوں پڑھتا تھا، نوٹس لیتا تھا۔ یوں ان میں میرے گھر میں موجود چار پانچ سو سیرتِ پاک ﷺ کی کتابیں اس طرح آ گئیں۔ سیرت کی کوئی کتاب خدا نے پیٹی میں رکھنے ہی نہیں دی۔ اکا دکا، جو کسی صندوق میں تھی بھی وہ پوری سالم بچ گئیں۔

قصیدہ بردہ شریف کی ایک جیبی جلد ایک مٹی بنی پیٹی میں تھی۔ دیمک کے پیروں کی خراش تک نہ اسے آئی۔ وہ مٹی مٹی ہوئی ڈھیری میں پڑی نگینے کی طرح چمک رہی تھی۔ جیسے دیمک اسے چوم چوم کے گزری ہو۔ اکا دکا تفسیر کی کتابیں بھی ان پیٹیوں میں تھیں۔ انہیں دیمک نے نہ چھوڑا۔ لگتا تھا مفسروں کی شرح سے یا محدثوں کے بیان سے دیمک متفق نہ تھی۔ مگر جہاں خالص عربی لحن میں قرآن پاک تھا، وہ سارا صحیح و

سالم۔ میں نے خالد کو جھنجھوڑا، سنو، دیکھو، مجھے تو علم نہیں تھا، کب کتابوں کے صندوق کھلیں گے۔ کب اپنا گھر تیار ہوگا۔ کب ان پیٹیوں کو اُٹھا کے ادھر لاؤں گا۔ بول۔ ہے نا؟

بالکل ٹھیک۔

ان پیٹیوں میں کتابیں رکھتے ہوئے بھی یہی خیال تھا کہ ایک دو ہفتوں بعد انہیں کھول لوں گا۔ سرکاری گھر جو ملا اس میں کمرے زیادہ نہ تھے۔ بیگم نے کہا ادھر تمہاری کتابیں نہیں آ سکتی۔ خبردار نہ لاؤ۔ پیٹیاں نہ اُٹھائیں۔ جو کچھ بھی ہوا، اللہ کو تو پتہ تھا۔ عین اس لمحے کا۔ کب، کہاں کیسے کون ان پیٹیوں کو کھولے گا۔ پتہ تھا نا؟

پتہ تھا۔

دیمک پہ حکم کس کا چلتا ہے؟

اللہ کا۔

دیکھ کس کتاب کو محفوظ رکھنا ہے، کس کو نہیں، اس نے فیصلہ دے دیا۔ میں نے خالد کو کندھوں سے پکڑ کے اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا۔

خالد بابا جانتے ہو۔ انسانوں کی قبروں میں یہی معاملہ ہے۔ جیسے کچھ کتابیں محفوظ کر لی جاتیں ہیں، ایسے ہی کچھ جسم بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں، وہ جن کی روح میں محبت رسول ﷺ ہو، جو انسان دوست حلال رزق سے پلا ہوا جسم ہو، خدا اسے کبھی دیمک کے حوالے نہیں کرتا۔

دیکھو۔

کتابوں کو محفوظ کرنے کا راز اور خدا کی حکمت ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ کوئی شک رہا؟ بندوں کے معاملے میں بھی خدا اپنے بھید اپنے بندوں کو دکھاتا رہتا ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ کی قبر کو تین سو سال بعد کھولا گیا۔ سیلاب آیا تھا۔ قبر کی

جگہ بدلنی تھی۔ حکم بھی سلطانؒ نے خود خواب میں آ کر اپنے کسی عقیدت مند کو دیا۔ اس زمانے میں موسمی اثرات جانچنے کا کوئی محکمہ نہ تھا۔ سیلاب آناً فاناً سر پہ چڑھ جاتا تو پتہ لگتا۔ مگر جس سمے چناب کے پانیوں کو ہزاروں میل دور ہمالیہ سے اترنے کا حکم ملا تو سلطانؒ کو اجازت مل گئی کہ بتا دے، اپنے کسی پیار کرنے والے کو۔ کہ وہ مجھ سے پیار کرنے والی روح کے جسم کو سیلاب کی نذر نہ ہونے دے۔ پھر وہ سمے آ گیا۔ جب ہزار ہا لوگوں کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے ایک خدا سے پیار کرنے والی ہستی کا تین سو سال سے دفن ہوا جسم زمین سے جب نکلا تو ایسا تر و تازہ جیسے ابھی دفنایا جا رہا ہو۔ سفید کفن جس پہ مٹی کیا ایک فالتو شکن تک نہ تھی۔ تین سو سال کی مٹی، مٹی میں دیمک۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی اس جسم پاک کو چھو پائے۔ خوشبو تک محفوظ۔ پھول پتیاں بھی اسی رنگ کی تازہ۔ خدا نے سب کو دکھایا۔ جو ماننے والے تھے، جو نہ مانتے تھے۔ سب نے دیکھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر کے سامنے یہ سب ہوا۔ اسی کے ہاتھ سے تفصیل لکھوائی۔

اور سنو۔

مدینہ منورہ میں جنت البقیع ہے۔ جانتے ہو؟

وہاں میرا ایک خالہ زاد بھائی عبداللطیف دفن ہے۔ وہ چالیس سال مدینہ منورہ میں اپنے کنبے کے ساتھ رہ کے فوت ہوا تو وہیں اسے دفنا دیا گیا۔ سعودی عرب میں جب میرا کئی سال کا قیام رہا تو ان کے گھر میرا اکثر جانا ہوتا۔ ان کے بیٹے مجھے چچا ہی کہتے تھے۔ پچھلے دنوں میں پھر ادھر گیا۔ مسجد نبوی میں اعتکاف کیا۔ عید کے دن میرے بھتیجے مجھے جنت البقیع لے گئے۔ میں نے پوچھا کچھ ان کی قبر کا اندازہ ہے؟ کدھر ہے۔

بولے چچا! یہاں عجیب معاملہ ہے۔

کیا۔

کہنے لگے، جگہ محدود ہے۔ چودہ پندرہ سو سال سے ہر مسلمان یہیں دفن ہونے کا آرزو مند۔

پھر

یہاں والوں نے اس کا پورا نقشہ بنایا ہوا ہے۔ ایک ایک انچ جگہ کا۔

تو

وہ قبر میں کسی کو دفن کرتے ہیں اپنے نقشے میں میت کا نام، پتہ لکھنے کے علاوہ دفن کرنے کی تاریخ بھی لکھ لیتے ہیں۔

پھر

پھر چھ مہینوں بعد سرکاری کارندے آتے ہیں۔ چپکے سے قبر کھولتے ہیں۔ اندر پڑی ہڈیوں کو احترام سے اُٹھا کے الگ پیک کرتے ہیں اور وہ جگہ اپنے نقشے میں کسی نئی میت کے لیے ''اویل ایبل'' ٹِک کر دیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھار عجیب واقعہ ہو جاتا ہے، کونسا واقعہ؟

وہ قبر کھولتے ہیں، اندر چھ مہینے پہلے کی دفن ہوئی میت اسی طرح تر و تازہ پڑی ہوتی ہے، جیسے ابھی دفنائی جا رہی ہو۔ ان پہ لرزا طاری ہو جاتا ہے۔ کافور کی مہک آ رہی ہوتی ہے۔ چہرے سے کفن ہٹا کے دیکھیں تو چہرہ جیسے سویا ہوا زندہ۔ وہ احترام سے ایک دم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ قبر کو سلام کر کے بند کرتے ہیں۔ مٹی پھیلا کے اوپر ڈھیری پہ پڑے بے ترتیب پتھروں کو کسی ترتیب میں دائرہ یا تکون کی باقاعدہ شکل دے دیتے ہیں اور اپنے نقشے میں وہ جگہ ہمیشہ کے لیے ''ناٹ اویل ایبل'' مارک کر دیتے ہیں۔

وہاں خدا نہیں اپنی آنکھوں سے دکھا رہا ہے، خدا کن کن کو محفوظ کر رہا ہے۔ کن کن کو نہیں۔ اب سمجھ آئی۔ معاملہ کتاب کا ہو یا انسان کے جسم کا، جسے محفوظ رکھنا ہے، صرف اسے خدا محفوظ رکھتا ہے۔ کہنے کو کتنی آسمانی کتابیں آئیں، مگر اللہ نے صرف

قرآنِ مجید کو عین اصل صورت میں محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا اور نبھایا۔ قیامت تک نبھائے گا۔ صرف جسے بچاتا ہوا سے دیمک سے دور رکھتا ہے۔

خالد بن مجید نے انگلی اُٹھائی۔

بولا، ایک وضاحت ضروری ہے۔

بھائی، دیمک کے معاملے اور ردی فروش کے حوالے میں ایک فرق ہے۔ یہ فرق سمجھنے والا ہے۔ ردی میں کتابیں بیچنے والا دیمک زدہ مردہ ہے اور ردی خریدنے والا محض اندھی دیمک۔

میں نے خالد سے کہا، نہ سوچ ردی میں بکی اور دیمک کے ہاتھوں تباہ ہوئی کتابوں کو۔ پھر سینہ پکڑ کے بیٹھ جائے گا۔

وہ تو پہلے ہی پکڑا ہوا ہے۔

اور جو آپ نے دکھایا، اسے دیکھ کے پھر بستر سے جالگوں گا۔

یار، یوں نہ ڈراؤ۔

دیکھ لینا۔ آج تو کمر دوہری ہوگئی۔

وہی ہوا۔

تھوڑے دنوں بعد پتہ چلا اس کی کمر میں ٹیومر ہے۔

خالد بن مجید آرٹ اور علم کا حسین امتزاج ہے۔ دادا اس کے روہتک کے قریب بہادر گڑھ کالج کے معروف نقشہ نویس تھے۔ انگریز کی حکمرانی تھی، انگلستان کی ایک کمپنی کو یمن کے شہر عدن میں آرکیٹیکٹ ڈیزائننگ کا ٹھیکہ ملا۔ گورے کسب کے جوہری ہیں۔ جگہ جگہ سے ہیرے ڈھونڈتے ہیں، اس کے دادا انہیں پسند آگئے۔ بہادر گڑھ سے وہ عدن پہنچ گئے۔ سات سال ادھر رہے۔ ان دنوں جوان تھے۔ اللہ جانے انگریز کے علاوہ یمن میں اور کس کس گھرانے کو ڈرائنگ دکھائی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا ایک یمنی عرب خاتون

کا ان کے دادا عبدالحق پہ دل آ گیا۔ شادی کا پیغام بھجوا دیا۔ انہوں نے قبول کر لیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد اسی خاتون کی طرف سے ایک اور پیغام ملا۔ اس نے کہلوایا ہماری ایک سہیلی ہے۔ وہ ہمیں بہت پیاری ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ جس سے میری شادی ہو اس کی وہ بھی بیوی بنے گی۔ مجھے اپنی سہیلی کی خواہش کا بخوشی احترام ہے۔

دونوں شادیاں ایک ہی دن ہوئیں۔

دو سہیلیاں اٹھکیلیاں کرتی خالد بن مجید کے دادا کے گھر آ کے رہنے لگیں۔ دادا پیچھے بہادر گڑھ میں بھی خالہ کی ایک دادی چھوڑ گئے تھے۔ سات سال بعد لوٹے تو ساتھ دو یمنی بیویاں، پہلے والی خالد کی دیسی دادی غصے سے گھر چھوڑ گئی۔ خالد کے ابا مجید دیسی دادی کے بطن سے تھے۔ انہیں دونوں یمنی ماؤں نے پالا۔ ان کے اپنے بھی بچے ہوئے۔ دادا کے کوئی گیارہ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ صرف ان کے ابا ایک دیسی ماں سے تھے باقی ساری یمنی ماؤں سے۔ دادا اور دادایاں تقسیم ہند سے پہلے فوت ہو گئیں۔ پاکستان بنا تو خالد کے ابا مجید ایک سال دہلی میں لال قلعہ میں مسلمان مہاجر کیمپوں میں خدمت کر کے ادھر آ گئے۔ کچھ دن کراچی میں رہے پھر سرگودھا میں آباد ہوئے۔ انہیں لوگوں سے میل جول کا چسکا تھا۔ ایک بس سروس شروع کی۔ بس سے زیادہ وہ اس سے اخبار کا کام لیتے۔ ہر سواری ایک خبر ہوتی، سرگودھا سے بھلوال، اس شہر میں یکم جولائی 1953ء کو خالد بن مجید پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے ابا اپنی ہی بس کے حادثے میں فوت ہو گئے۔ گاڑی کا ٹائی راڈ کھل گیا۔ کسی مسافر کو خراش تک نہ آئی۔ وہ گزر گئے۔ دادا کی طرف سے جہاں خالد کو آرٹ اور ڈیزائن کے جینز ملے وہیں ننھیال سے کتاب دوستی، شاعری اور ادب کا چسکا پڑ گیا۔ نانا ان کے مولوی محمد ظفر ایم اے، عربی اور ایل ایل بی علی گڑھ تھے۔ چالیس کتابوں کے مولف۔ روح القرآن نام سے انہوں نے قرآن پاک پہ بہت کام کیا۔ خالد کی نانی کے ابا

حیدرآباد دکن کے معروف حکیم یوسف نیرؔ تھے۔ نظام دکن کی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ شاعر تھے۔ جن دنوں خالد سرگودھا میں پڑھ رہا تھا، وہاں شاعروں نے بھگدڑ مچائی ہوئی تھی۔ شاعر اور ادیبوں کے ڈاکوؤں کی طرح جتھے بنے ہوئے تھے۔ جیسے بھتہ خور شہروں میں قربانی کی کھالوں کے لیے کھینچا تانی کرتے ہیں، ایسا ہی شوق و ذوق وہ نئے شاعروں اور ادیبوں کے لیے دکھاتے تھے۔ یہ شاعر تو بن گئے سرعام اس کا اظہار کرنے سے بدک گئے۔

کوئی کہتا، یہاں غزل چھپوائیے۔

یہ کہے، نہیں۔

کوئی کھینچتا، مشاعرے میں چلیے۔

یہ کہتے، نہیں۔

امبالہ مسلم کالج سرگودھا میں انہیں اعظم گڑھ کے پروفیسر انیس احمد اعظمی سے سیکھنے کا موقع ملا۔ درویشی اور فقیری کی پیوندکاری انیس احمد اعظمی ہی کی بدولت ملی۔ اعظمی صاحب کے بچے انڈیا رہ گئے تھے۔ اکیلے تھے۔ ساری تنخواہ غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ آدھی روٹی پہ زندہ تھے۔ ایک دو کپڑے رکھے تھے۔ انہی کی شبیہہ با تصویر خالد کی روح میں اتر گئی۔ ملاقات تو ان کی وقت کے سبھی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے رہی، مگر کسی ٹولے کا فرد نہ بنے۔

تلاش روزگار کے دن آئے تو خالد بن مجید کے اندر تین طرح کے ڈھول بجنے لگے۔ ایک طرف دادا سے ملا آرٹسٹ ڈیزائنر شور مچائے، ساتھ دو دو کمنی دادیاں تالیاں بجائیں، ادھر آ، ادھر آ۔ دوسرا نانا کی طرف سے دربار کا شاعر ہاتھ اٹھا اٹھا کے آداب عرض کرے۔ تیسرا ابا سے سیکھا ہوا لوگوں سے یارانے والا پی آر ہارن بجاتا دوڑے آئے۔ ان تینوں سُروں سے خالد نے یوں سمجھوتا کیا کہ صحافت میں آ گیا۔

چوری چھپے شاعری بھی کرتا رہا۔ سرعام ڈیزائن بنانے سے بھی نہ ہٹا۔ پاکستان ٹائمز میں پیر پسارنے لگا تو انہوں نے اسے آئی ایس پی آر کے حوالے کر دیا۔ 40 سال اس نے ''ہلال'' کے سرورق بنائے، لے آؤٹ سجائے، افواج پاکستان کے کیلنڈر تیار کیے، افواج کے میڈلز اور شیلڈز کے ڈیزائن بنائے، مگر کسی پہ اپنے دستخط نہ کیے۔ اس کے بنے بنائے کاموں پہ بے شمار لوگوں نے تمغے لیے۔ ترقیاں پائیں۔ مگر یہ جس رینک میں آیا تھا چالیس سال تک اُسی پہ رہا۔ اس کی انگلی پکڑ کے قدم قدم چلنا سیکھنے والے لیفٹین ایک نہ ایک دن کرنیل اور جرنیل بن کے اس سے یوں کترانے لگتے، جیسے اپنے گاؤں سے آئے غریب باپ یا باپ کے کنبے کے لوگوں سے دور بھاگتے ہیں۔ پرانے ریلوے اسٹیشن پہ کسی گرد آلود لیمپ پوسٹ کھمبے کی طرح خالد بن مجید جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کی روشنی میں راہ ڈھونڈنے والے سب ایکسپریس ٹرینوں پہ چڑھ کے اس پہ دھول گراتے گزر گئے۔ اس نے بھی تمام تر حقیقتوں کا ادراک کرنے کے باوجود اپنے جسم کی آخری قوت بھی آئی ایس پی آر کو دے دی۔

نظریاتی طور پر بھی خالد بن مجید ایک علامتی صوفی ہے۔ اسے دکھ سے پیار اور مسکینی سے یارانہ ہے۔ روز میلوں پیدل چل کے تین چار ویگنوں پہ دھکے کھاتا یہ جھکا جھکا دھیرے دھیرے چلتا دفتر آتا۔ شام تک دفتر میں کام میں جتا رہتا۔ جوانی میں شاید یہ قد آور ہو بڑھاپے میں درمیانے قد کا رہ گیا تھا۔ سر کے بال کھچڑی تھے۔ داڑھی سفید ہو گئی تھی۔ آنکھیں اسی طرح بچوں جیسی پاکیزگی لیے حیرت بھری موٹی موٹی سی تھیں۔ بس ان میں ایک اداسی آ کے ٹھہر گئی تھی، جیسے یہ اس بچے کی آنکھیں ہوں جس کے سارے کھلونے کسی نے توڑ دیے ہوں۔ اکہتر کے سانحے کے بعد کسی نے اس کی آنکھوں کو مسکراتے نہ دیکھا تھا، ہر مارشل لاء پہ اس کی آنکھوں سے چپکے کوئی آنسو پھسل کے گر پڑتا اور یہ سوچتا رہتا میں افواج پاکستان کے سوہنے چہرے پہ

یہ زخم کیسے مٹاؤں۔ جو بات کسی سے نہ کرنے والی ہوتی وہ ایک ڈائری میں شاعری کی صورت میں لکھتا رہتا۔ اس کی شاعری کے موضوعات بندے اور خدا کے درمیان راز و نیاز ہے۔ ایک گم شدہ فقیر کی گدڑی کی طرح اس میں فریاد میں کیسے سارے نگینے ہیں۔ دنیا کے ہر فرعون سے جو جو دھکے ملے اس نے شاعری میں پرو دیے۔ خیر اور شر کی صدیوں پرانی بحث، موت اور بعد از موت کی گتھیاں بھی اس کی اسی شاعری کی زنبیل میں ہیں۔ چونکہ ساری شاعری ہی اس نے اپنی ذات کی تلاش اور ہر ریا کے رد کے لیے کی ہے تو جب بھی کوئی اسے شاعری کی کتاب شائع کرنے کا کہتا تو زور سے ایک ہی لفظ کہتا، نہیں۔ یہی اب اس کی کتاب کا نام ہے۔

ابھی پرسوں جب اس نے اپنی نحیف آواز میں مجھے فون پہ بلایا اور کہا، مل جاؤ، ٹکٹ آ گیا ہے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ شروع ہوگئی ہے تو میں بھاگا گیا۔

یہ اپنے کمرے میں ایک کروٹ میں لیٹا ہوا تھا۔

پاؤں سوجھے ہوئے تھے۔

میرے جاتے ہی اس پہ جیسے خوشیوں کا پہاڑ چڑھ آیا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بولا، سر معافی چاہتا ہوں۔ مڑ نہیں سکتا۔ میں جوتے اتار کے اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ سہلائے، چہرہ سہلایا۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ خالد ایک معصوم بچہ بنا مجھے زندگی بھر کے کھیلے ہوئے کھلونوں کی بے حقیقتی بتا رہا تھا۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے "بدھا" کو نروان مل گیا ہو۔ اس نے وہ روشنی دیکھ لی ہو جو انسان کی روح کا اصل ہے۔ اس نے پچھلے چند دنوں میں دیکھے ہوئے اپنے حیرت انگیز مشاہدے بتائے۔ کہنے لگا، ان کچھ دنوں میں عجیب سے تجربوں سے گزرا ہوں۔ اسی لیے آپ کو بلانے کی جسارت کی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ میرا یہ گھر بیتالیس سال پرانے سرگودھے کے گھر سے بدل گیا۔ وہاں میری امی، میرے ابا سب موجود تھے۔

سب زندہ، باتیں کرتے ہوئے۔ باتیں گزرے زمانے کی نہیں تھیں۔ اب کی تھیں۔ یہاں گھر کے میرے بچے بھی ادھر، بیوی بھی ادھر۔ ان سب کے درمیان میں کھاتا پیتا تھا، باتیں سنتا تھا، کمرہ یہی تھا، پرانے گھر میں جالگا تھا، وہی پرانے نقش و نگار، پرانی دیواریں، پرانی چوکھٹ، پرانی دستک، جسم بھی میرا ایسا ہی بوسیدہ بیمار پرانا۔ سر ایک بات بتائیں، یہ وقت کیسے آگے پیچھے ہوگیا؟

کیا میں وقت سے نکلنے والا ہوں؟

میں محبت سے اسے چپک گیا اور کہا، خالد بھائی! وقت پہ کمان اللہ کی ہے جب چاہے نئے وقت میں پرانا بھر دے۔ پرانے میں نئے وقت کی پیوندکاری کر دے۔ اس کے پاس ساری طاقت ہے اور کیا کیا دیکھا؟

بولا، ایک دن مجھ سے یہ بڑھاپا بھی اتر گیا۔ میں نے خود اپنے اندر چھپے اس بچے کو دیکھا، اس بچے کو جیا جو برسوں سے گم ہوا ہوا ہے۔ مرا نہیں ہے۔ میرے اس بوڑھے شریر میں کہیں چھپ گیا ہے۔ ایک پورے دن کے لیے مجھ سے میرا وہ بچہ الگ ہوا۔ میں نے اسے جیا۔ پوری معصومیت کے ساتھ۔ کیا وہ بچہ اندر کا کہیں اس طرح صحیح سالم ہوتا ہے؟ سر یہ بتائیں؟

یار! تم نے اپنے اندر کے معصوم بچے کو کبھی مارا ہی نہیں تو وہ کیوں نہ زندہ ہو اور کیا مشاہدہ ہوا۔

بہت عجیب مشاہدوں سے گزرا ہوں۔ آپ تو دیکھ رہے ہیں۔ میں بستر پہ بھی ہل نہیں سکتا۔ خود کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ آنکھیں زندہ ہیں، دماغ کام کرتا ہے، پیاس بھی لگتی ہے، ایک رات، آدھی رات کا سے ہوگا۔ بتی جل رہی تھی۔ مجھے پیاس لگی۔ وہ دور دیکھ رہے ہیں۔ بیڈ کے دوسری طرف تپائی پہ پانی سے بھرا جگ اور گلاس پڑا ہے۔ ہے نا؟ ہے۔ بس اسی طرح پڑا تھا۔ میں نے کسی کو آواز نہ دی۔ لیٹے لیٹے

حیدرآباد دکن کے معروف حکیم یوسف نیرؔ تھے۔ نظام دکن کی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ شاعر تھے۔ جن دنوں خالد سرگودھا میں پڑھ رہا تھا، وہاں شاعروں نے بھگدڑ مچائی ہوئی تھی۔ شاعر اور ادیبوں کے ڈاکوؤں کی طرح جتھے بنے ہوئے تھے۔ جیسے بھتہ خور شہروں میں قربانی کی کھالوں کے لیے کھینچا تانی کرتے ہیں، ایسا ہی شوق و ذوق وہ نئے شاعروں اور ادیبوں کے لیے دکھاتے تھے۔ یہ شاعر تو بن گئے سرِعام اس کا اظہار کرنے سے بدک گئے۔

کوئی کہتا، یہاں غزل چھپوایئے۔

یہ کہے، نہیں۔

کوئی کھینچتا، مشاعرے میں چلیے۔

یہ کہتے، نہیں۔

امبالہ مسلم کالج سرگودھا میں انہیں اعظم گڑھ کے پروفیسر انیس احمد اعظمی سے سیکھنے کا موقع ملا۔ درویشی اور فقیری کی پیوند کاری انیس احمد اعظمی ہی کی بدولت ملی۔ اعظمی صاحب کے بچے انڈیا رہ گئے تھے۔ اکیلے تھے۔ ساری تنخواہ غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ آدھی روٹی پہ زندہ تھے۔ ایک دو کپڑے رکھے تھے۔ انہی کی شبیہہ با تصویر خالد کی روح میں اتر گئی۔ ملاقات تو ان کی وقت کے بھی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے رہی، مگر کسی ٹولے کا فرد نہ بنے۔

تلاش روزگار کے دن آئے تو خالد بن مجید کے اندر تین طرح کے ڈھول بجنے لگے۔ ایک طرف دادا سے ملا آرٹسٹ ڈیزائنر شور مچائے، ساتھ دو دو یمنی دادیاں تالیاں بجائیں، ادھر آ، ادھر آ۔ دوسرا انا نا کی طرف سے دربار کا شاعر ہاتھ اٹھا اٹھا کے آداب عرض کرے۔ تیسرا ابا سے سیکھا ہوا لوگوں سے یارانے والا پی آر ہارن بجاتا دوڑے آئے۔ ان تینوں سُروں سے خالد نے یوں سمجھوتا کیا کہ صحافت میں آ گیا۔

آنے والی دنیا کے لیے خوش نصیبی ہو۔ خوش نصیب اتنے کہ اللہ اپنے راز تمہیں دکھارہا ہے۔ اور کیا کیا دیکھا۔

بولا، ہمارے کانوں کی سماعت کا ایک لیول ہے۔

ہاں۔

دور کی چیزیں ہم کم سنتے ہیں یا بہت مدھم۔

ٹھیک۔

مگر سر، کل رات عجیب بات ہوئی۔

کیا؟

وہ ادھر سامنے کی دیوار پہ ایک چھوٹی سی گھڑی پڑی ہے، اس کی آواز آپ کو آتی ہے۔ میں نے کچھ دیر کان لگا کے سنا، اور بولا نہیں۔

کہنے لگا۔ وہ ساری آواز۔ اس گھڑی کے اندر موجود بے شمار گراریوں کی آوازیں، پوری تفصیل کے ساتھ جیسے کوئی میگا فون لگا کے مجھے سنا تا رہا۔ میں جس چیز پہ دھیان کرتا اس سے وابستہ آوازیں مجھے آتیں۔ وہ دیوار پہ لگی تصویر پہ ایک مکھی بیٹھی اپنے پر ہلا رہی تھی۔ اس کے پروں کی آواز میں ادھر سنتا رہا۔ آپ کو کیا کیا بتاؤں۔ جس کا خیال آتا۔ اس کے اندر کی آوازیں مجھے سنائی دینے لگتیں۔ توبہ، انسان کے اندر بھی آوازوں کا شور ہے۔ سانس کی آوازیں جیسے طوفان گزر رہے ہوں۔ شریانوں میں خون کا رینگنا ایک ایک خلیے کا کھلنا بند ہونا۔ سر وہ سب کیا تھا؟

دیکھ خالد، جو اس کا ہو گیا پھر وہ اس کے کان ہو گیا، آنکھ ہو گیا، زبان ہو گیا، ہاتھ ہو گیا، پاؤں ہو گیا۔ تجھے تو اس نے سب کچھ ڈیمونسٹریٹ کرا کے دکھا دیا۔ تم کتنے خوش نصیب ہو۔ میں اس سے محبت سے چپک گیا۔

وہ زار و قطار رونے لگا۔

یہ زخم کیسے مٹاؤں۔ جو بات کسی سے نہ کرنے والی ہوتی وہ ایک ڈائری میں شاعری کی صورت میں لکھتا رہتا۔ اس کی شاعری کے موضوعات بندے اور خدا کے درمیان راز و نیاز ہے۔ ایک گم شدہ فقیر کی گدڑی کی طرح اس میں فریاد میں کیسے سارے نگینے ہیں۔ دنیا کے ہر فرعون سے جو جو دھکے ملے اس نے شاعری میں پرو دیے۔ خیر اور شر کی صدیوں پرانی بحث، موت اور بعد از موت کی گتھیاں بھی اس کی اسی شاعری کی زنبیل میں ہیں۔ چونکہ ساری شاعری ہی اس نے اپنی ذات کی تلاش اور ہر ریا کے رد کے لیے کی ہے تو جب بھی کوئی اسے شاعری کی کتاب شائع کرنے کا کہتا تو زور سے ایک ہی لفظ کہتا، نہیں۔ یہی اب اس کی کتاب کا نام ہے۔

ابھی پرسوں جب اس نے اپنی نحیف آواز میں مجھے فون پہ بلایا اور کہا، مل جاؤ، ٹکٹ آ گیا ہے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ شروع ہوگئی ہے تو میں بھاگا گیا۔

یہ اپنے کمرے میں ایک کروٹ میں لیٹا ہوا تھا۔

پاؤں سوجھے ہوئے تھے۔

میرے جاتے ہی اس پہ جیسے خوشیوں کا پہاڑ چڑھ آیا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بولا، سر معافی چاہتا ہوں۔ مڑ نہیں سکتا۔ میں جوتے اتار کے اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ سہلائے، چہرہ سہلایا۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ خالد ایک معصوم بچہ بنا مجھے زندگی بھر کے کھیلے ہوئے کھلونوں کی بے حقیقتی بتا رہا تھا۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے ''بدھا'' کو نروان مل گیا ہو۔ اس نے وہ روشنی دیکھ لی ہو جو انسان کی روح کا اصل ہے۔ اس نے پچھلے چند دنوں میں دیکھے ہوئے اپنے حیرت انگیز مشاہدے بتائے۔ کہنے لگا، ان کچھ دنوں میں عجیب سے تجربوں سے گزرا ہوں۔ اسی لیے آپ کو بلانے کی جسارت کی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ میرا یہ گھر پینتالیس سال پرانے سرگودھے کے گھر سے بدل گیا۔ وہاں میری امی، میرے ابا سب موجود تھے۔

ہاتھ بڑھایا۔ بازو لمبا کیا۔ فاصلہ تو سات ہاتھ کا ہے۔ حیرت ہے، میرا ہاتھ جگ پہ پہنچ گیا۔ میں نے گلاس بھرا اور پانی پی لیا۔ سر یہ کیسے ہوا۔ ہاتھ کی دسترس کیسے بڑھ گئی؟ فاصلہ کیسے مٹ گیا؟

دسترس اس کی کس چیز پہ نہیں ہے؟ فاصلے سارے تو یار اس وقت تک ہیں جب تک ہم اس جسم میں قید ہیں۔

تو کیا، میرا جسم سے نکلنے کا سمے آ گیا ہے؟ وہ مجھے عجیب طرح سے تکنے لگا۔

اس کے راز ہیں یار، وہی جانتا ہے۔ یہ دیکھو۔ تم نے ساری عمر اس سے یاری نبھائی اب وہ اپنی دوستی کی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ یہ تو خوش نصیبی ہے۔ تم اداس کیوں ہوتے ہو۔

نہیں سر۔ اداس نہیں ہو رہا۔ ساری عمر آرٹ کی دنیا میں رہا۔

جانتا ہوں سوچنے کی یہ ساری دنیا تھری ڈائی مینشن والی ہے۔ ہے نا۔ مگر ہم جو تصویریں بناتے ہیں یا کیمرے سے کھینچتے ہیں وہ ایک سطح پہ ہوتی ہیں۔ سنگل ڈائی مینشن والی۔ ہے نا۔ ہاں۔ مگر کیا کہنا چاہتے ہو۔ بولا۔ عجیب ایک مشاہدہ ہوا۔ پورے تین دن میرے ارد گرد کی دنیا کی تین ڈائی مینشنوں سے دو نکل گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے کی ساری چیزیں ایک سطح پہ آ گئیں۔ یہ اوپر دیکھیں۔ پنکھا ہے چھت کا۔ ہے نا۔ ہے۔ سردیوں میں کھڑا ہے۔ ہاں۔ ایک رات میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ میرے ہاتھ اس پنکھے پہ تھے۔ وہ سامنے کی دیوار میں لیٹا لیٹا چھو لیتا۔ جدھر جو نظر آتا وہاں تک میرے ہاتھ پہنچ جاتے۔ چھوتا، اُٹھاتا، پھر رکھ دیتا۔ سر بتائیں؟ آپ تو ڈاکٹر بھی ہیں، اللہ کے کاموں کے بھی بھیدی۔ کیا ہمارے اندر کوئی ایسی کل لگی ہے جو کوئی مروڑے تو ہمارے سامنے کی تھری ڈائی مینشن دنیا سے دو ڈائی مینشن منہا ہونے لگتی ہیں۔

یار۔ اب سائنس یہ راز بھی ڈھونڈ لے گی۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ ہو سکتا ہے۔ تم

آنے والی دنیا کے لیے خوش نصیبی ہو۔ خوش نصیب اتنے کہ اللہ اپنے راز تمہیں دکھا رہا ہے۔ اور کیا کیا دیکھا۔

بولا، ہمارے کانوں کی سماعت کا ایک لیول ہے۔

ہاں۔

دور کی چیزیں ہم کم سنتے ہیں یا بہت مدھم۔

ٹھیک۔

مگر سر، کل رات عجیب بات ہوئی۔

کیا؟

وہ ادھر سامنے کی دیوار پہ ایک چھوٹی سی گھڑی پڑی ہے، اس کی آواز آپ کو آتی ہے۔ میں نے کچھ دیر کان لگا کے سنا، اور بولا نہیں۔

کہنے لگا۔ وہ ساری آواز۔ اس گھڑی کے اندر موجود بے شمار گراریوں کی آوازیں، پوری تفصیل کے ساتھ جیسے کوئی میگافون لگا کے مجھے سنا تا رہا۔ میں جس چیز پہ دھیان کرتا اس سے وابستہ آوازیں مجھے آتیں۔ وہ دیوار پہ لگی تصویر پہ ایک مکھی بیٹھی اپنے پر ہلا رہی تھی۔ اس کے پروں کی آواز میں ادھر سنتا رہا۔ آپ کو کیا کیا بتاؤں۔ جس کا خیال آتا۔ اس کے اندر کی آوازیں مجھے سنائی دینے لگتیں۔ تو بہ، انسان کے اندر بھی آوازوں کا شور ہے۔ سانس کی آوازیں جیسے طوفان گزر رہے ہوں۔ شریانوں میں خون کا رینگنا ایک ایک خلیے کا کھلنا بند ہونا۔ سر وہ سب کیا تھا؟

دیکھ خالد، جو اس کا ہو گیا پھر وہ اس کے کان ہو گیا، آنکھ ہو گیا، زبان ہو گیا، ہاتھ ہو گیا، پاؤں ہو گیا۔ تجھے تو اس نے سب کچھ ڈیمونسٹریٹ کرا کے دکھا دیا۔ تم کتنے خوش نصیب ہو۔ میں اس سے محبت سے چپک گیا۔

وہ زار و قطار رونے لگا۔

اس کا جسم روتے روتے عجیب طرح سے لرزنے لگا۔

روتے روتے بولا، ایک بات بتانا تو بھول گیا۔

کیا؟

کوئی بار بار میرے کانوں میں، میرے دل میں کہہ رہا ہے۔

او احمق! ساری عمر تو یہ لوہا لکڑ اکٹھا کرنے میں لگا رہا۔ ساری عمر بے کار برباد کر دی۔ زندگی کے لیے جو ضروری تھا، جو تجھے بعد میں بھی زندہ رکھتا، وہ کام تم نے کیا ہی نہیں۔ جنہیں زندگی میں بھی موت ہے۔ موت کے بعد بھی موت، وہ سب سمیٹتا رہا۔ رہا نہ خسارے میں۔ وہ رونے لگا۔

میں نے پھر اسے گلے لگایا۔ کہا خالد، یہ بہت تھوڑی دنیا ہے جو دنیا سے تم نے لی۔ اصل تو اس کا پیار ہے جو تو جیتا رہا۔ دکھاتا رہا۔ ہے نا۔

وہ روتے روتے مسکرانے لگا۔

اس کا کھلا چہرہ دیکھ کے میں نے اس کے من میں ایک امید کا دیپ جلانے کی بات کی۔ کہا۔ خالد، اپنی شاعری کی کتاب اب لے آؤ۔ کہنے لگا۔ امجد نے بہت ہی پیار سے اپنی نگرانی میں اس کی کمپوزنگ کرادی ہے۔ ٹائٹل بھی اس کا بن گیا ہے۔ بس میری ایک شرط ہے۔ وہ پوری ہو جائے تو اسے چھپنے کے لیے دے دیں۔

کیا شرط ہے خالد، بتاؤ۔ میرے بس میں ہوا تو پوری کر دوں گا۔ ان شاء اللہ ہے ہی آپ کے بس میں۔

کیا؟

جب تک اس کا دیباچہ آپ نہ لکھیں گے وہ نہیں چھپ سکتی۔ بسم اللہ کے بعد آپ کی تحریر سے وہ شروع ہوگی۔ ڈن، میرا وعدہ ہے۔ جتنی بھی جلدی ہوا وہ مضمون میں لے کر آؤں گا۔ تمہیں سناؤں گا۔ تم سو نہ جانا۔ شاید آج رات ہی وہ لکھا جائے۔ بولا، سر

مجھے نیند سے پہلے نیند کدھر آئی ہے۔ میں اس سے اجازت لے کر اپنے گھر آیا۔ کاغذوں کا پلندہ گتے پہ لگایا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ تین گھنٹوں میں مضمون تیار ہو گیا۔ گھڑی دیکھی۔ رات کے اڑھائی بجے تھے۔ میں نے سیل فون پہ خالد کے نمبر کا بٹن دبایا۔ ادھر گھنٹی بجی اور کسی نے فون آن کیا۔ کچھ دیر تک کوئی آواز نہ آئی۔ پھر فون کے اندر سے بہت نحیف سی آواز آئی۔ سر سوئے نہیں؟ نہیں یار۔ ابھی تم پہ لکھا مضمون مکمل ہو گیا۔ اس کے مسکرانے کی سراہٹ آئی۔ بولا، تو اب مرنے کی اجازت ہے۔ خبردار میں اسے سنانے کے لیے آ رہا ہوں۔ آ سکتا ہوں۔ بولا، بسم اللہ۔ میں نے گاڑی نکالی اور بھاگم بھاگ اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کی بیگم دروازہ کھولنے آئی۔ میں نے بے وقت آنے کی معافی مانگی اور اس کے بستر پر اس کے پہلو میں بیٹھ کے اسے یہ مضمون سنانے لگا۔

وہ کبھی مسکراتا، کبھی بچوں کی طرح بلک بلک کے رونے لگتا۔

روتے روتے کبھی اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔ کبھی وہ تڑپ کے نعرے مارنے لگتا۔ اللہ اللہ اس کے عجیب مستانہ رنگ نعرے تھے۔ گونج سن کے کبھی اس کی بیگم صاحبہ، کبھی بیٹے لپک کے آتے۔ ہمیں تڑپتا روتے دیکھ کے چلے جاتے۔ عجیب منظر تھا۔ میں مضمون سناتے ہوئے رو رہا تھا۔ وہ سنتے ہوئے ہچکیاں لے رہا تھا۔

رات کے ساڑھے تین بج گئے۔

مضمون سارا میں نے سنا دیا۔

سردیوں کی رات تھی اور لمبی تھی۔ اسے ایک ہی کروٹ لیٹے روتے ہوئے کو لیٹ کے گلے لگایا۔ پیار کیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ ہاتھ چومے اور س ن کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے سوجھے ہوئے پیروں کو محبت سے ہاتھ لگایا۔ وہ تڑپ کے اٹھ ... میں چیخ پڑا۔

سر یہ کیا کر رہے ہیں؟

میں تو بل نہیں سکتا۔ پاؤں سمیٹ بھی نہیں سکتا۔

ایسا نہ کریں۔

میں نے پھر اس کے پیروں کو چھوا اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اسے سلام کر کے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ فجر کی نماز پڑھ کے سویا تو دن ڈھلے تک سویا رہا۔ دوپہر گزر گئی۔ دن چڑھے میں نے اپنا موبائل اُٹھایا۔ کئی مِس کالز اور بہت سے ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ایک ایس ایم ایس پہ ریڈ کا بٹن دبایا۔ لکھا تھا۔ صبح فجر کی نماز وقت خالد بن مجید وفات پا گئے ہیں۔ ان کی نمازِ جنازہ آج بعد نماز ظہر ادا کی جائے گی۔ میرے ہاتھ سے میرا فون گر گیا۔ دماغ ماؤف ہو گیا۔ دل کٹ گیا۔ میں نے گھڑی پہ نظر ڈالی۔ ظہر کا وقت نکل چکا تھا۔ مسجد سے عصر کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ خالد میرے دوست، میرے درویش تم نے اپنے پیر سمیٹ لیے نا۔ مجھ جیسے میلے بندے کو انہیں چھونے کی ایک بار اور اجازت بھی نہ دی۔ یار یاد رکھنا میرے درویش، تم دیمک زدہ قبرستان عہد کی وہ اُجلی اور پاکیزہ کتاب ہو جس کی طرف کبھی کوئی دیمک نہیں آئے گی۔ چھ مہینے کیا چھ ہزار سال بعد بھی تمہارا اُجلا براق پہناوا یونہی اُجلا رہے گا۔ کوئی تمہاری قبر پہ پڑے پتھروں کی ترتیب بدلے نہ بدلے۔ تمہاری اُجلی روح کو لیے پھرتا تمہارا جسم بھی تمہاری پاکیزہ روح کی برکت سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ کسی کو شک ہو تو بے شک جب چاہے کھول کے دیکھ لے۔ زندگی میں کسی عاشقِ رسول ﷺ کا سینہ یا مرنے کے بعد اُس کی لحد کی ڈھیری۔ جو بھی دیکھے گا، یہی کہے گا۔

''محمد ﷺ کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا''

O

بوتل کا جن...... بابا محمد یحییٰ خان

بابا محمد یحییٰ خان...... بندے کے رُوپ میں کسی عہدِ عمیق کا کوئی جن ہے۔ خدا جانے اسے بوتل سے کس نے نکالا ہے۔ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے، اس نے سہمی ہوئی دُکھی دھندلائی منزلوں کی انسان بستی میں اَمن کا بڑا سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ خدا اور بندے کے رشتے کو اِک نئے رنگ سے متعارف کرا دیا ہے۔ بندے کو اُٹھا کر خدا کے سامنے ننگا کھڑا کر دیا ہے کہ لو، جو تیرا خالق ہے تو اُسے دیکھ اور وہ تجھے دیکھے۔

''پیار رنگ کالا'' کتاب ہی انوکھی نہیں، اس کا مصنف بھی وکھرا ہے۔ اپنی کتاب لے کر وہ عکسی مفتی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''اِس کتاب پر ممتاز مفتی سے کچھ سطریں لکھوا دیں۔'' عکسی مفتی، بابا محمد یحییٰ خان کی بات سن کر مسکراتا مسکراتا رک گیا۔ حیرت سے آنکھیں پھیلائے بابا محمد یحییٰ خان کو دیکھتے ہوئے زیرِ لبی بولا۔ بابا محمد یحییٰ خان، ممتاز مفتی کو گئے تو بارہ سال ہو گئے ہیں، تم اب اُن سے کچھ لکھوانے آئے ہو!

بابا محمد یحییٰ خان، عکسی مفتی کی حیرت زدہ آنکھوں میں اپنی بے نیازی کی پچکاری

مارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ عکسی جی! یہاں جسموں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں ممتاز مفتی کے قلم سے کچھ لکھوانے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں بندے کا جسم مرتا ہے، اس کا قلم نہیں۔ خدا سے عطا ہوئے قلم کو موت نہیں آتی۔ وہ زندہ اور قائم رہتا ہے۔ اِس لیے کہ اس قلم نے خدا کی عظمت اور اُس کے رسول کی بڑائی بیان کی ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے قلم سے اپنی ''مَیں'' میں ہوا نہیں بھری ہوتی۔ اپنی ''مَیں'' کے غبارے میں سوئیاں بھری ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ چُڑمُڑ ہوا، چھیچھڑا بنا، بے ہَوا کا غبارہ ہوتا ہے مگر ہوتا وہی قائم اور زمین سے بندھا ہوا ہے۔ اِسے اندر یا باہر کی کوئی بھی آندھی بے وزن بنا کر اُڑا نہیں سکتی۔ آپ مجھے ان کے بارہ سال پہلے چلے جانے کی خبر نہ سنائیں۔ اِس کا پتہ بتائیں جس کے ہاتھ میں وہ اپنا قلم دے کر گئے ہیں۔

عکسی مفتی کچھ دیر کھڑا بابا محمد یحییٰ خان کو ایسے دیکھتا رہا، جیسے اس کے سامنے بندہ نہیں کوئی جن کھڑا ہو۔ عکسی مفتی سمجھ گیا جو اس کے روبرو کھڑا ہے، اُسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ اُس نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور مجھے ڈائل کر کے کہنے لگا۔

ابدال! تیرے بابے کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک بابا آیا ہے۔ اسے آتے آتے کچھ دیر ہوگئی ہے۔ بارہ سال بعد آ کے اُس نے ادھر دستک دی ہے۔ اَب تو دروازہ کھول۔ ''پیا رنگ کالا'' تجھے بھیج رہا ہوں، تو اسے اپنے بابے کو پڑھا اور اُن سے کچھ سطریں لکھوا کے مجھے فیکس کر دے۔

میرا فیوز اُڑ گیا۔ یہ کون میرے بابے کو نیند سے جھنجھوڑنے آ گیا ہے۔ بارہ سال بعد اُن کی وفات کے اُنہیں اپنی کتاب پڑھانے، اُن کے تاثرات لکھوانے کی ضد پال لی ہے۔

کتاب مجھے مل گئی۔ مَیں اپنے بابے کو اوڑھ کے اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ چند صفحے پڑھے ہوں گے کہ مَیں زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق ہو گیا۔ اپنے بابے ممتاز

مفتی سے کہنے لگا۔ شکر کریں آپ رُخصت ہو چکے ہیں...... ورنہ آج رُخصتی ہو گئی ہوتی۔ اُدھر میرے ساتھ زمین پر بیٹھے ہوتے تو میری طرح ہَوا میں ناچتے۔

وہ مسکرا کر بولے۔ "کملے! یہ کتاب لکھے جانے کا مقصد سمجھ۔ یہ لکھی گئی پر بانٹنے کے لیے ہے اور پَر تو صرف بے وزن، لطیف روحوں کے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ رُوحیں اپنے جسم کے اندر ہوں یا باہر۔ روح کہانی ہر زندہ روح کے پڑھنے کی چیز ہے۔" دیکھ! اِس کی داستان طرازی، کہانی کے اندر رکھی کہانیاں۔ سفر پہ نکلے مسافر کی مسافتوں کے سارے سفر۔ وہ سفر بھی جو ابھی طے نہ ہوئے ہوں۔ وہ مسافتیں بھی جن پہ ابھی نکلنا ہو۔ زندگی کی کھٹی میٹھی ست رنگی اَن کہیاں، انوکھے قصے، بیتیوں کی بپتا، کچھ آپ بیتیاں، کچھ جگ کی، پُر اسرار دُنیا، تصوف کے بھید، طلسمات، مکاشفات کرامات کی نان سٹاپ چاند ماری۔ طلسم ہوش رُبا کا دَرویش ایڈیشن......!

یہ بابا محمد یحییٰ خان، بڑا کھچرا ہے۔

سمندر کے کنارے کھڑا ہو کے یہ مچھلیاں نہیں پکڑتا۔ یہ بیچ سمندر لنگر ڈال کے جال پھینکتا ہے۔ پکڑتا بھی وہ مچھلی ہے جس کے پیٹ میں لعل و گوہر ہوں۔ انہی آبدار موتیوں کے یہ ہار بناتا ہے۔ مگر اِسے کہہ...... نو لکھے موتیوں کی مالائیں یہ دو دو دَمڑی میں پھیری لگا کے نہ بیچے۔ ہیرے، نیلم، لعل اور زُمرد میں جڑی ہوئی انگوٹھیاں بندہ بندہ پَرکھ کے دی جاتی ہیں۔ ان نگینوں کے چمکتے رنگ روپ تو سب کو ہی بھاتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کے اثرات سب پہ ایک جیسے ہوں۔ پھر یہ دیکھ یہ محمد یحییٰ خان کسی کو نہیں بخشتا۔ دیکھ کدھر سے مجھے کھینچ کے اپنی کتاب پڑھانے پہنچ گیا ہے۔ یہ بندہ نہیں، جن ہے۔

میں نے قلم ان کے ہاتھ میں دیا اور ہاتھ جوڑ کے کہا۔ سرکار! اس جن لکھاری پہ کچھ لکھنا بندے کے بس کی بات نہیں، آپ ہی کر پا کریں۔"

بولے، لکھ...... اصل فساد کی جڑ وہ ہے جس نے اِس جن کو بوتل سے نکالا ہے۔
یہ شرارت اِس کے پڑوسی چاچا گگو کی دوسری بیوی روشن رُوح والی چاچی کی ہے، اوپر سے سیالکوٹ کے پیر مرادیا سمیت پرانے قلعے کے سب زور آور باباؤں نے اپنے بے پناہ پیار اور محبت کے تمبو ڈال کے اِس کے اندر قلعہ بندی کی ہوئی ہے۔
اصل میں اِس جن کو نکلنا ہی تھا۔ اِس لیے کہ ایسے جنات کے نکلنے کا اَب سمے آ گیا ہے۔ انوکھی بیتیاں بیتوا کے انہیں بیتوانے کا وقت آ گیا ہے۔ بہت سی اَنہونیاں، اب ہونے والی ہیں۔ ہزارہا ایسے بھید جسے لوگ مغربی سائنس کی ٹکٹکی پر چڑھا کے اپنے اَدھورے علم کے ہنٹر مار مار کر دبائے رکھتے ہیں، اَب وہ راز اَفشاں ہونے والے ہیں۔ بڑے بڑے بھید، رازوں کے راز کھلنے والے ہیں۔ غور سے دیکھ، آسمان کی مقدس روشنی اور کائنات کے نور کا بادلوں کے ریلے میں گِھرا ''دَروازہ کھلتا ہے''
انسانیت کے خستہ حال بَنیرے پہ اَب کاگ کی کائیں کائیں سننے کا وقت ہو گیا ہے۔ جانتے ہو، دیوار پہ بیٹھ کے کوا بولنے لگے تو کون آتا ہے؟ ہاں، مہمان! کسی مہان مہمان کے آنے کا اعلان ہونے والا ہے۔
تو چھوڑ تبصرے۔ آنے والے مہمان کے سواگت کی تیاری کر۔ یہ بابا محمد یحییٰ خان جس مقصد کے لیے بوتل سے نکالا گیا ہے، اِسے سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ جو لکھ رہا ہے، اسے پڑھتا جا۔ بس اس سے ایک بنتی کر، اسے کہہ یہ اپنی تحریر کے موج دَر موج سمندر میں کبھی کبھار کوئی ٹاپو، کوئی ساحل بھی لے آیا کرے۔ ریگزاروں کے لامتناہی سفر میں کوئی پڑاوٗ تو رکھے۔ کہیں تو انگلی چھوڑے...... کہیں تو قاری کو رُک کے سانس لینے دے۔ کہہ اسے، کائنات سفر کی اپنی آپ بیتی کو جلد بازی میں یوں بے کنار نہ کرے۔ اپنی تحریر میں ذیلی عنوان دے۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑے بہت اَبواب میں تو کتاب کو تقسیم کرے۔ اسے بول، تقسیم کرنے کی دیگ پر بیٹھ کر اِسے

خود کو بھی بانٹنا ہے۔

بول! جن جی۔ تمہاری کتابوں کو جنوں کے علاوہ انسانوں نے بھی پڑھنا ہے۔ انسان کی آسانی کا خیال رکھنا ہر ذی رُوح پر لازم ہے۔ انسان کی سب سے بڑی آسانی، آسائش اور آرائش اِس کی لنگوٹی ہوتی ہے۔ اِسے کہہ لوگوں کی سرِ عام لنگوٹیاں نہ اُتارے۔ نہ اپنی نہ دوسروں کی۔ اسے سمجھا کہ علی بابا، چالیس چوروں میں بھی بڑا زور ہوتا ہے۔ بندھی گٹھڑیاں بیچ چوراہے میں بیٹھ کر نہیں کھولتے۔ ''کھل جا سم سم'' سے بڑا اِسم ''بند ہو جا سم سم'' ہے۔ یہ اِسم جو بھول جائے وہ پکڑا جاتا ہے۔

o

کھوجی...... پروفیسر انعام الحق کوثر

پتہ نہیں ابھی تک کسی نے کسی کھوجی کا کھوج لگایا ہے کہ نہیں۔ کھوجی ہے کھوج لگانے والی چیز، کہتے ہیں کھوجی کسی تربیت سے نہیں بنتا۔ اپنے اندر کی کسی انوکھی ترکیب سے بنا ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر وہ کسی تلاش میں ہوتا ہے۔ ڈھونڈ اور تلاش اس کی کیمسٹری میں اتری ہوتی ہے۔ جستجو اس کے خون میں چلتی ہے۔ اس کے خون کی اک اک بوند، اس کے کسی ایسے خوشبو بھرے سانس کا پیچھا کرتی ہے جسے اس نے منزل پہ پہنچ کے لینا ہے۔ منزل کھوجی کی کوئی کھوج نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ ایک منزل پر پہنچ کے کسی دوسرے سفر پر چل پڑتا ہے۔ مسلسل سفر میں رہنا ہی ایک واحد اس کی پہچان ہے۔

پروفیسر انعام الحق کوثر بھی ایک کھوجی ہے۔

کھوجی وہ تھوڑی ہوتا ہے جو گارے مٹی پہ جمے رکے ٹھہرے قدموں کے نشاں پہ اپنی سوٹی رکھتا رکھتا چار قدم چل کے گاؤں کی نکڑ سے چوری ہوئی بھینس کھولنے والے

چور کو جا پکڑے۔ کھوجی تو حقیقت میں خود چور ہے، چور ایسا کہ اڑتی ریت کے سندیس لیے آئے طوفاں کے بیچ مٹے اڑے ہوئے قدموں کے نشاں کی خوشبو سے اس کا رخ چرا لے۔ مہک کدھر سے آ کر کدھر گئی؟ یہ کھوجی کی کھوج ہوتی ہے۔ آگے پیچھے کی ساری کہانی اس کے سامنے آ کر ریشمی تھان کی طرح دھڑ دھڑ کھلنے لگتی ہے۔ وہ کہانی نہیں کہتا، کہانی اس سے باتیں کرتی ہے۔

میں آپ کو ایک کھوجی کی کہانی سناتا ہوں۔

کوئی اکیس سال کم ایک صدی کی بات ہے۔ مشرقی پنجاب کے ایک ایسے زرخیز علاقے کا قصہ ہے جہاں اونچی ٹاہلیاں، گھنی کیکریں، چوڑا دریا، گہرے کنویں اور بڑے لوگ پیدا ہوتے آئے ہیں۔ جالندھر شہر کی بات کر رہا ہوں۔ جس کے ایک قصبے نکودر کے قریب دریا کنارے کنیاں کلاں گاؤں میں یکم اپریل ۱۹۳۱ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ گورا چٹا بچہ جو دیکھتا لپک کے اٹھا لیتا۔ اس زمانے کے دوسرے بچوں کی طرح وہ گاؤں کی کچی گلیوں اور سبز کھیتوں میں گھومتے پھرتے بڑا ہونے لگا۔ جو اس عہد کے بچے کھیل کھیلتے وہ بھی کھیل لیتا۔ پاؤں میں اس کے کبھی جوتا ہوتا کبھی نہ ہوتا۔ تن پر بھی قمیض پہنی ہوتی کبھی نہ ہوتی۔ ایک کچھا، نیکر یا پاجاما۔ انہی رنگوں سے اس کی پہچان تھی۔ مگر کوئی غور کرتا تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں کوئی اور تحریر تھی۔ کسی دور انجانے سفر کی کہانی تھی اور کسی ڈھونڈ کو پالینے کا عزم تھا۔ بچہ بڑا ہوتا گیا۔ پہلی دوسری جماعت سے ہوتا ہوتا وہ کوئی سات گاؤں دور کسی بھلے آدمی کے کھلے سے گھر کے ایک حصے میں بنے سکول میں جا پہنچا۔ ہائی سکول تھا وہ۔ گاؤں کا نام تھا ننگل۔ ساتویں آٹھویں جماعت کی بات ہے کہ اس کی آنکھوں میں لکھی کھوج اس کے استاد نے پڑھ لی۔ وہ پکڑا گیا۔

ہوا یوں کہ ان کے سکول میں شعر و ادب سے شغف والے کچھ استاد آ گئے۔ بزمِ

ادب بنائی انہوں نے۔ سکول کے سبق کیکروں کی چھاؤں میں پڑھائے جاتے تھے۔ بچوں نے کیکروں کے پیلے پھولوں پر نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ اب کیکر میں صرف پیلے پھول ہی تو نہیں ہوتے، کانٹے بھی ہوتے ہیں جو الجھتے ہیں، الجھاتے ہیں۔ اللہ جانے یہ کیوں ہوتا ہے مگر جہاں تخلیق کی خوشبو بھرے رنگ ہوتے ہیں وہیں ان میں انا کے کانٹے بھی اُگ آتے ہیں۔ ہوا یوں کہ سکول کے ہیڈ ماسٹر اور بزمِ ادب کے انچارج استاد میں ان بن ہو گئی۔ غصہ اندر ہی اندر دونوں طرف پلنے لگا۔ اتنے میں کیا ہوا، بزم ادب کی سکول والی ٹیم نے کوئی چار صفحوں کا قلمی رسالہ نکال دیا۔ رسالے میں اسی سکول کے کسی بچے کی کوئی غزل تھی۔ اس غزل کے ایک شعر پر ہیڈ ماسٹر آپے سے باہر ہو گیا۔ سرِ عام اس نے اعلان کر دیا کہ یہ بزم ادب کے انچارج استاد نے اس کی توہین کے لیے خود لکھی ہے اور اخلاقی جرأت نہ ہونے کے باعث ایک طالب علم کے نام سے چھاپ دی ہے۔ غزل کے جس شعر سے سارا فساد اٹھا تھا، اس میں ایک مصرع کچھ یوں تھا۔

میں کسی نااہل کو سر پر بٹھاؤں یہ ہو نہیں سکتا

ہیڈ ماسٹر نے طوفان کھڑا کر دیا۔ مجھے نااہل کہا گیا ہے۔ مجھے سر پر نہ اٹھانے کا اعلان کیا ہے۔ میرے خلاف بغاوت ہے۔ شور اٹھ گیا۔ بابا کار مچ گئی۔۔

وہ کھوجی بچہ اس سارے منظر کا تماش بین تھا۔ اس سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے تماشہ نہ دیکھا گیا۔ اس کے اندر کا کھوجی خون ابلنے لگا، یہ لڑکا جس کے نام سے غزل چھپی تھی، شاعر دکھتا نہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا جس استاد پر اس توہین کا الزام ہے وہ تو اندر سے بچوں کی طرح معصوم ہے۔ ہیڈ ماسٹر بنا ثبوت کے بات نہیں سنتا۔ پھر مسئلہ کیسے حل ہو؟ وہ ٹوہ میں لگ گیا۔ ڈھونڈ پال لی۔ راستہ اسے خود بخود ملنے لگا۔ ایک دن اتفاق سے قریب گاؤں کے سکول گیا۔ وہاں سکول کی لائبریری میں جا کے بیٹھ گیا۔ گنتی

کی چند کتابیں اور رسالے ہوتے تھے ان دنوں سکول لائبریری میں۔ ایک رسالہ اٹھایا، بہت پرانا، کئی سال پہلے کا چھپا ہوا، اس کی گرد جھاڑی۔ ورق گردانی شروع کی، تو ایک دم سے راہ کٹ گئی۔ منزل مل گئی۔ رسالے میں وہی غزل کئی سال پہلے کی چھپی ہوئی تھی۔ شاعر کا نام کچھ اور تھا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ جس لڑکے کی وجہ سے دو استادوں میں فساد ہوا ہے وہ کہیں ادھر آیا اور اس رسالے سے غزل چوری کر کے لے گیا اور اپنے سکول کے بزم ادب کے پرچے میں اپنے نام سے چھپوا دی۔ کھوجی کو تو سلیمان کا خزانہ مل گیا۔ رسالہ ادھار مانگا اور جا کے ہیڈ ماسٹر کے سامنے رکھ دیا۔ ہیڈ ماسٹر نے بزم ادب کے استاد کو بھی بلا لیا۔ اس سے معافی مانگ لی اور پھر اسی کھوجی بچے کا ماتھا چوم کے سکول کے تمام استادوں کو مخاطب کر کے کہا، میری بات لکھ لو، یہ بچہ بڑا ہو کے بہت بڑا محقق بنے گا۔

پتہ نہیں وہ سمے کے بندھن کی بات تھی۔ یا بندھن کا سمے تھا۔ بات سچ ہو گئی۔ وہی بچہ آج پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر ہے۔ بیسیوں تحقیقی کتابوں کا مصنف اور مؤلف۔ چاروں طرف جس کے تحقیقی مقالوں کا سکہ چلتا ہے۔ کون سا موضوع ایسا ہے جس پر اس نے عرق ریزی نہیں کی۔ تاریخ، ادب، زبان سب کو فتح کر لیا۔ مگر دو موضوع ایسے ہیں جن کے سامنے اس نے گھٹنے ٹیک دیے اور ہاتھ جوڑ کے ایسے بیٹھ گیا۔ جیسے مورتی کے آگے پجاری بیٹھتے ہیں۔ پہلا موضوع ہے بلوچستان اور دوسرا ہے رسول پاک ﷺ۔ ان دو موضوعات پر پروفیسر صاحب نے محقق ڈاکٹروں والی ڈاکٹری نہیں کی ایک مجنوں کی طرح عشق کیا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ سے عشق کی تو سمجھ آتی ہے۔ بلوچستان سے عشق کی روداد سمجھنے والی ہے۔

ہوا یوں کہ پروفیسر انعام الحق کوثر کے بڑے بھائی کو تاریخ کی چاٹ پڑ گئی۔ تاریخ کی دنیا میں اس شخص نے ایسے ایسے بت توڑے کہ تاریخ کا خود حصہ بن گیا۔

پروفیسر انور رومان کی بات کر رہا ہوں۔ عمر میں وہ انعام الحق سے چھ سال بڑا ہے۔ ایم اے تاریخ کیا تو انگریز نے جالندھر کے خوبرو نوجوان کو نوکری سنڈے مین سیکنڈری سکول کوئٹہ میں دی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب پورے بلوچستان میں ایک بھی کالج نہ تھا، یہی سنڈے مین سکول پاکستان بننے کے بعد بلوچستان کا پہلا کالج بنا اور انور رومان لیکچرار بن گیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ پروفیسر انور رومان تاریخ کا استاد تھا، وہ سنڈے مین اور انگریز دونوں کی تاریخ سے واقف تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ قدرت اسے ڈیڑھ ہزار میل دور نوکری نہیں دے رہی، ڈیڑھ ہزار میل جغرافیے کی تاریخ کا کوئی ورق پلٹ رہی ہے۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے بغیر چلا آیا۔ سال سوا سال بعد پاکستان بن گیا۔ کچھ سالوں بعد انعام الحق کوثر نے بھی ماسٹر کی ڈگری لے لی۔ لاہور دیال سنگھ کالج سے، بڑے بھائی کی تاریخ بینی کے حدود اربعہ کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فارسی میں ایم اے کیا۔ امتحان پاس کر کے بھائی کو چٹھی لکھ دی۔ بڑے بھائی نے سنڈے ین کالج سے چٹھی کے جواب میں تعیناتی کا خط بھیج دیا۔ جغرافیہ پھر تاریخ کے ہاتھوں پٹ گیا۔

تاریخ کا ایک اور ورق پلٹا اور انعام الحق کوثر بھی کوئٹہ آ گیا۔ اسی دوران اس نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے پر بھی کام جاری رکھا، مقالے کا موضوع بھی وہ چنا جس طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ "بابا فغانی شیرازی اور اس کے عہد کے شاعر۔" چھٹی لے کر پنجاب یونیورسٹی جا بیٹھا۔ لاہور کی ساری لائبریریاں کھنگال دیں۔ تہران یونیورسٹی سے خط و کتابت کی۔ برٹش میوزیم تک رسائی حاصل کر لی۔ انہوں نے مائیکرو فلمیں بھیج دیں۔ اب ان دونوں کوئٹہ میں مائیکرو فلم پڑھنے کے آلات تو تھے نہیں مگر اس کھوجی نے ہمت نہ ہاری۔ کسی دوست ساتھی کی لیبارٹری سے خوردبیں مستعار لے آیا۔ مائیکروسکوپ کے جس جبڑے میں میلے خون کے دھبوں میں ملیریا اور ٹائیفائڈ کے جرثومے رکھ کے دیکھے جاتے تھے۔ ادھر یہ بابا فغانی شیرازی اور اس کے

عہد کے شاعروں کا کلام رکھ رکھ کے پڑھنے لگا۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پروفیسر صاحب کی پی ایچ ڈی ہوگئی مستند محقق بن گئے۔ ہوتا تو یہ آیا ہے کہ ایک بار سند مل گئی تو تحقیق کو خدا حافظ کہہ دیا۔ ادھر الٹا ہوا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ تحقیق کے میدان میں اب داخلے کا سرٹیفکیٹ ملا ہے۔ پھر کیا تھا۔ کھوجی کی آنکھ ماتھے پر سجالی اور ہر بند گلی کی ڈیوڑھی کے دروازے پر دستک دی۔ سارے میدان فتح کر لیے مگر جب بلوچستان اور رسول پاک ﷺ کے صحراؤں میں قدم رکھا تو قدم چھوڑ دیے۔ پلکوں کے ساتھ چلنے لگا۔ سرکار دو عالم ﷺ سے عشق کی تو سمجھ آتی ہے۔ اس لیے کوئی اس عشق کے جنوں کی بات نہیں کرتا۔ بلوچستان سے عشق پر شاید کس کو تاؤ چڑھے۔ بات یہ بھی سمجھنے کی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا تھا۔

میری نوکری کا وہ پہلا سال تھا۔ پہلے سال ہی کشمیر کے ایک پہاڑ پہ جا بیٹھا۔ پہاڑ پر ہسپتال تھا۔ میں ہسپتال میں آنے والے مریضوں کی نبض پر انگلیاں رکھے شریانوں میں چلتے خون کی کہانیاں بھوجنے لگا۔ ایک دن کیا ہوا میرے ایک کشمیری کولیگ کی نانی فوت ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ فاتحہ پڑھنے اس کے گھر چلا گیا۔ ان کے گھر والوں نے اپنے سامنے دو ڈاکٹر بیٹھے دیکھے تو مرحومہ کی بیماری کی تفصیل سنادی۔ کس طرح بیٹھے بٹھائے بخار چڑھ گیا۔ پیٹ میں درد ابلا۔ نوے سال سے اوپر کا سن تھا۔ بوڑھی عورت کیسے درد سے تڑپتی رہی۔ راستے دشوار تھے۔ پہاڑوں پر چڑھنا اترنا، راہ میں ندیاں، نالے۔ کون اسے اٹھا کے لاتا۔ وہ بیچاری درد سے کراہتی مرگئی۔ اس کی کہانی سنتے سنتے میں آبدیدہ ہوگیا۔ ٹپ ٹپ میرے آنسو میرے گالوں سے نیچے گرنے لگے۔ آنسوؤں کو دیکھ کے میرے دوست کے ماموں اور ماسیوں کے ضبط کے بندھ ٹوٹ گئے۔ وہ اور دل جمعی سے مجھے مرحومہ کی باتیں سنانے لگے۔ کدھر گھر میں وہ بوڑھی عورت چارپائی پر بیٹھا کرتی تھی۔ وہ سلیٹی رنگ کی چادر بچھائے

رکھتی تھی۔ بستر پر۔ ادھر اس کے سلیپر پڑے ہوتے تھے۔ یہ اس کی سوئی ہے۔ اس گلاس سے وہ پانی پیتی تھی۔ اس چھابے میں رکھ کے اماں نے زندگی کے آخری دو نوالے کھائے تھے اس پیڑھی پہ بیٹھ کے، پیڑھی ابھی تک اٹھائی نہیں۔ ادھر ہی پڑی ہے۔ لگتا ہے اماں اوپر بیٹھی ہے۔ وہ سب آبدیدہ ہو گئے۔ میرے دوست کے عزیز و اقارب سارے مجھ سے مخاطب تھے۔ میرے دوست کی طرف ان کا دھیان ہی نہ تھا۔ کسی کی نظر اس کی طرف اٹھ بھی جاتی تو اس کی خشک بے توجہگی سے بھری آنکھوں کو دیکھ کے دیکھنے والوں کی مٹھیاں کھلنے بند بند ہونے لگتیں۔ میرا دوست ذہین تھا۔ اس نے گھر والوں کی بدن بولی پڑھ لی اور بہانے سے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھالیا۔ واپس ہسپتال آتے آتے وہ راہ میں میرے سامنے تن کے کھڑا ہو گیا۔ تو اتنا خطرناک ہے، مجھے تو اندازہ نہیں تھا۔ میں تجھے معاف نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی غصے میں آنکھیں نکال نکال مجھے تکتا، کبھی حلق کے اندر اندر ہنسنے لگتا آخر اس نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور بولا، میری توبہ اگر میں تجھے آئندہ اپنے کسی عزیز کی خوشی غمی میں ساتھ لاؤں۔ ظالم، تو نے میرے مامے مجھ سے توڑ دیے۔ وہ تیرے آنسو دیکھ کے مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں ان کا کچھ نہیں لگتا تو سگا ہے۔ میں نے کہا، یار تجھے کس نے رونے سے منع کیا تھا۔ رو لیتا۔ بولا۔ آنکھیں تو پہاڑی ندی کی طرح ہوتی ہیں، پیچھے پہاڑ پر بارش نہ ہو تو ندی میں پانی کدھر سے آئے۔ سچ کہتا تھا۔

پروفیسر صاحب سے بھی بعض لوگوں کو یہی شکایت ہو سکتی ہے۔

مگر پروفیسر صاحب کا عشق بہرہ ہے۔ اندھا تو کبھی کا ہوتا ہے۔ شدت جنوں سے یہ سننے سے بھی عاری ہے۔ انہیں عشق خدا جانے جالندھر کی کس کیکر کی چھاؤں سے ملا ہے۔ ایسا ملا ہے کہ سر چڑھ کے بولتا ہے۔ کوئی اور جانے نہ یا نہ جانے، تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ کہ مٹی اور ماں کی عادت ایک جیسی ہوتی ہے۔ گو دان کی کبھی

بچوں کے لیے ہوتی ہے مگر دونوں اپنے صرف اسی بیٹے کا ماتھا چومتی ہیں جس نے اس کے دودھ کا پالن کیا ہو اور آنے والے عہد کو اسی خوشبو کے رنگ میں رنگا ہو۔ پروفیسر صاحب نے اپنی ساری عمر کا چڑھاوا بلوچستان کے قدموں کی نذر کر دیا۔ انہیں اس سے کیا ملا۔ یہ بات نہیں سوچنے کی، سوچنے کی یہ بات ہے کہ اور سو سال بعد جب بلوچستان سے پیار کرنے والوں کی کبھی فہرست بنی تو جو تھوڑے بہت نام لکھے جائیں گے۔ ان کے کوائف انہی کی تحریروں سے ملیں گے۔ ان کی تحریروں سے بڑے بڑے انکشاف ہوتے ہیں۔ ہوتے رہیں گے۔ اچنبھے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے بلوچستان میں بیٹھ کے مرزا غالب کا عشق بھی پالا ہوا ہے۔ مرزا غالب یقیناً ہر اس شخص کے عشق کے مستحق ہیں جو رمز کلام کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ مرزا غالب کوئی چھوٹی موٹی ہستی نہیں ہیں۔

امام شہر کلام ہیں۔

پتہ چلا ہے پروفیسر صاحب کے سکول کے دنوں میں گاؤں کا جو استاد اردو پڑھاتا تھا جالندھر میں کیکر کی چھاؤں کے نیچے دھوتی باندھ کے، وہ غالب کے عشق میں مبتلا تھا۔ وہ اپنے روز کے سبق کی بسم اللہ مرزا غالب کے کسی شعر سے کرتا۔ اور چھٹی کی گھنٹی سن کے ایک نہ ایک مرزا کا مقطع سنا دیتا۔ پتہ نہیں پروفیسر انعام الحق کوثر نے انہی دنوں تختی پر وہ مقطعے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ یا بعد میں انہیں مرتب کیا۔ بہرحال ان کے ایک مقالہ کا نام "غالب کے مقطعے" ہے۔ غالب پر یہی نہیں اور بھی انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ توضیحی کتابیات کے حوالے سے غالب کی تمام کتابوں کے بارے میں تفصیل جمع کی۔ کون سی کتاب غالب نے کب لکھی، کب کب چھپی، کیسے چھپی۔ کس نے چھاپی۔ کیا قیمت کتاب پر لکھی گئی۔ دیوان غالب کہاں کہاں کیسے کیسے چھپتا آیا۔ سب معلومات اکٹھی کر لیں۔

پروفیسر صاحب کا غالب سے عشق یہیں ختم نہیں ہوا، انہوں نے غالب کے کلام میں ہم عصر شاعروں اور دانشوروں کے میلان کے میدان میں قدم رکھا تو گوئٹے تک کو جا پکڑا ادھر فغانی کے کلام کی اثر انگیزی تو لتے تو لتے اسی پر پی ایچ ڈی کر لی۔ ناطق مکرانی اور غالب کی سانجھی خوشبوؤں کو کشید کر لیا۔

میں نے ایک دن ان کے غالب کے حوالے سے لکھے ہوئے کچھ ایسے مضامین دیکھے جو بین الاقوامی تناظر میں تحقیق اور جستجو کی نئی راہوں کو پکارنے لگے تو میں نے پروفیسر صاحب سے کہہ دیا۔ کہ آپ انہیں یکجا کر کے کیوں نہیں چھاپ دیتے۔

شکر ہے انہوں نے میری بات مان لی۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ مگر تمہیں بھی میری ایک بات ماننا ہوگی۔

میں گھبرا گیا۔ بات سنے بنا ہاں کہنے سے پہلے گھبراہٹ تو ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے جو بات کہی۔ گھبراہٹ اس کے بعد اور بڑھ گئی، بولے تم وعدہ کرو کہ غالب کے حوالے سے یہ جو میری کتاب ہوگی، اس کا دیباچہ خود تم لکھو گے۔

پروفیسر صاحب کی کتابوں پر کچھ لکھنا خوشی و انبساط کی بات ہے۔ مگر مرزا غالب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بات کانپ جاتی ہے۔ ان پر کچھ لکھتے ہوئے قلم کو رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ توبہ توبہ، ایسا بھاری پتھر۔ میں تو اس پہاڑ کو چوم کر ادب سے دوزانو ہو کے بیٹھ سکتا ہوں۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ قدم قدم اٹھ کے اس پر چڑھوں، چلوں۔ استغفار میں تو ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوں۔ خاموش اس کو آپ دیباچہ کہہ لیں امام شہر کلام، مرزا غالب کے حضور میرا ہدیہ تبریک۔ سچی بات ہے مجھ میں اس سے بڑھ کر۔ بات کرنے کا نہ حوصلہ ہے نہ ظرف۔

پروفیسر انعام الحق کوثر کے حوصلے، علم و بیان اور وارفتگی کی میں داد دیتا ہوں جو مرزا غالب کی اقوام عام پر خیال انگیزی کی خوشبو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دور تک

نکل گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ یہ مرزا غالب کو بین الاقوامی سطح پر سمجھنے میں کی جانے والی کوششوں کی بارش کا پہلا قطرہ ہے۔

میں چشم تصور سے اسی موسم کی کسی نہ کسی رت میں برستی برسات دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میں اور کچھ جانو یا نہ جانو، اتنا جانتا ہوں کہ ہماری برصغیر کی تاریخ میں، ہمارے پورے کے پورے جغرافیے کی بارگاہ کلام کا کوئی سرچنج ہے تو صرف مرزا غالب ہے۔ شہر کلام کی یہ وہ امامت ہے جو ابد تک کے لیے غالب کو مل چکی ہے اور انہی کے طفیل اس خزینے کی بوند بوند مانگنے والوں کو ملتی رہے گی۔ میری تو بس یہ دعا ہے کہ جہاں جہاں تک دنیا میں دل کو تڑپنا آتا ہے، وہاں وہاں تک خدا غالب کے کلام کی خوشبو اور اس کا فہم دے دے اور جس برسات کے بادل غالب پکڑ کے بیٹھا ہے اس کی بوندوں سے مجھے سرتاپاؤں سیراب کردے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

o

ہیرا......نعمان منظور

ہالینڈ کا شہر ایمسٹرڈیم ہیروں کا شہر ہے۔ ہمارے شہروں میں اتنی کانچ کی دوکانیں نہیں، جتنی وہاں ہیروں کی منڈیاں ہیں۔ شہر میں سڑکوں کی جگہ نہریں ہیں، کاروں کا کام وہ کشتیوں سے لیتے ہیں، بیچتے خریدتے وہ سب کچھ ہیں مگر اس چمکتے شہر کی پہچان ہیرے ہیں۔ میں ایمسٹرڈم گیا تو اس شہر باسیوں کو مجھ پہ عجیب سا مغالطہ ہوگیا۔ وہ سمجھے میں ہیروں کا بیوپاری ہوں، ہیرے خریدنے آیا ہوں،

میں تو بکا ہوا بندہ ہوں، میں نے کیا خریدنا تھا۔

لوگوں کی آنکھ کا مغالطہ میرے پیروں سے الجھ گیا۔ میں ہیروں کی ایک دوکان میں گیا، الماریوں میں صحرا کے آسماں کی کہکشائیں سجی ہوئی تھیں۔ اس انوکھی دوکان کی ہر گزرگاہ کوئی ملکی ویزتھی۔ چہار اطراف رکھی الماریوں میں تاروں بھرے آسماں ہچکولے لے رہے تھے۔ میری آنکھیں پتھرانے لگیں دوکان کا مالک تاڑ گیا، وہ جو دنیا بھر کے پتھروں سے ہیرے کھرچ کے لایا تھا، وہ دھوکا کھا گیا۔ اس نے مجھے مشروب

پلائے پھر عجز و احترام سے مجھے ایک ہال کمرے میں لے گیا۔ سامنے پروجیکٹر سے کوئی فلم چلنے لگی، فلم کا موضوع تھا۔

''ہیرے کی پہچان۔''

سلائیڈیں چلنے لگیں سکرین کے پاس ہیروں کی دوکان کا مالک کھڑا بتا رہا تھا کیسے صدیوں کے بوجھ کی گٹھڑیوں کو اٹھائے کالے تن کا من، اجلا ہونے لگتا ہے۔ کیسے کاربن سے ہیرا بنتا ہے۔ قدرت اجالے کی پیوند کاری کرنے کی خاطر ظاہری صورت بدلنے سے پہلے اندر کی گرہیں کھولتی ہے۔ فزکس کی کتاب کا صفحہ پلٹنے سے پہلے کیسے اندر کی کیمسٹری بدلتی ہے۔ جنم ہا جنم کے جبر کے بعد کہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں کوئی ہیرا جنم لیتا ہے۔ اس کے جنم لینے سے کہانی ختم نہیں ہوتی، شروع ہوتی ہے۔ کیسے کان کنی کرتے لوگ ہیرے کو لپیٹے پتھر کی بازیافت کرتے ہیں۔ کیسے ہیرے کے سوا فالتو پتھر توڑا جاتا ہے۔ ہیرا ننگا ہو کے سامنے آ جاتا ہے، سر سے پاؤں تک ہیرا، کاٹ میں، ارتکاز میں، دکھنے میں، دکھانے میں، محاسن میں، کثافت میں، خالص ہیرا۔ مگر اس حالت میں کوئی اسے انگوٹھی میں نہیں سجاتا۔ گلوبند میں نہیں لٹکاتا۔ جھمکوں میں نہیں جھلکاتا، اس لیے کہ ابھی اسے تراشے جانے کے مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر ہیروں کا بیوپاری مجھے ہیروں کو کاٹنے کے طریقے بتانے لگا، بے شمار طریقے تھے، مقصد سب کا ایک تھا کیسے اندر کے اجلے ہیرے پہ پڑی روشنی کی ایک کرن کو بے کنار کرنا ہے۔ کیسے اپنے اندر خود ہی ایسی دیواریں کھڑی کرنی ہیں، ان کے زاویے متعین کرنے ہیں کہ باہر سے آئی ایک بوند روشنی ست ربڑ کی گیند بن جائے، اچھل اچھل کے اچھلے اور دیکھتی آنکھوں کے دلوں پہ دیر تک نور کی بوندا باندی ہوتی رہے۔

ہیرے کو کاٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے، ہیرے کی پہچان کا پہلا سبق ہی یہی تھا کہ ہیرا صرف ہیرے سے کٹتا ہے، وہ بھی اپنے سے بہتر اور مہنگے ہیرے سے۔

ہیروں کی پہچان کے وہ سارے سبق پڑھتے ہوئے میں نے نوٹس تو بہتیرے لیے، ہیرا کوئی نہ لیا، مجھے اس وقت نہیں پتہ تھا کہ ہیرا مجھے لاہور سے ملنا ہے۔ واپس آ کے ساری روداد اپنے گرو ممتاز مفتی کو سنادی۔

وہ پوری کہانی سن کے بولے، وہ ہیروں کا بیوپاری تو کوئی اللہ والا بندہ تھا۔ تجھے بندوں کے ہجوم میں اجلی روحوں کی پہچان سکھا گیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ سرکار وہ صرف ہیروں کی بات کر رہا تھا۔ مفتی جی مسکرائے، بولے، میں بھی صرف ہیروں کی بات کر رہا ہوں۔ تو یہ کیوں سمجھے بیٹھا ہے کہ ہیرے صرف پتھروں کی مخلوق میں ہوتے ہیں۔ میرے چن، ہیرے ہر مخلوق کا اجلا ترین حصہ ہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنے سال پہلے کی رکی ہوئی ان کی باتوں کا رخ نعمان منظور کی طرف ہے۔ وہ تو جب نعمان منظور میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا تو ایمسٹر ڈیم میں سیکھی ہوئی ہیروں کی پرکھ کا ہر پہلو نعمان منظور پہ پورا اتر گیا۔ میں ڈر گیا مجھے مفتی جی کی کہی بات یاد آ گئی۔ وہ مجھے مسکراتے دیکھ کے بولے تھے۔ کانوں کو ہاتھ لگا، توبہ کر، ہیرا بننا بڑا مشکل کام ہے۔ جس کوئلے کے لیے ہیرے کا نصیب لکھ دیا جاتا ہے، اس سے بڑا دھواں اٹھتا ہے، بڑا سیک نکلتا ہے۔ درد کی پنڈ اس کے پنڈے کو مدتوں دبا کے رکھتی ہے۔ پھر کہیں اُس تن سے من کا میل اترتا ہے۔ ہیرا بنتا ہے۔ قدرت اس ہیرے کو سانس نہیں لینے دیتی۔ اس کا اصول ہے کہ وہ ہر کندھے پہ اتنا بوجھ رکھتا ہے جو وہ اٹھا سکے۔ چونکہ اٹھائے جانے والے بوجھ سے پہلے کندھوں کا چناؤ ہو جاتا ہے اس لیے، ہیرا بننا جس کے لیے لکھا گیا ہو۔ وزن کے معاملے میں اس سے کوئی رعایت نہیں ہوتی۔ ادھر ہیرے کی کوئی کنی چمکی، ادھر کئی چاقو بردار استاد اس پہ نامزد کر دیے گئے۔ اس تراش خراش سے کہنے کو ہیرے کی چمک بڑھتی ہے مگر میرے چن تو ہیرا بن کے سوچ، جب تیرے بدن پہ آرے چلیں۔ بول! تیری کیسی چیخیں نکلیں گی؟ کہنے لگے، جب بھی کسی ہیرے سے

ملو تو استغفار پڑھنا اور سمجھ لینا وہ تین طوفانوں سے گزرا ہے۔ صبر، درد اور ٹوٹ پھوٹ کے درد سے مہان تخلیقی شکتی کے علاوہ کوئی لڑا ہوا مہاید ھ نہیں۔ نعمان منظور ان تینوں گزرگاہوں سے گزر آیا ہے۔ اسی لیے آج خوش رنگ نولکھا ہار بنا ہے۔ اس کی شخصیت کی زنبیل کھول کے دیکھو تو اندر خزانے بھرے ہیں۔ یاقوت، نیلم، عقیق، زمرد، لاجونتی اور پکھراج۔ یہ چلتا پھرتا ایمسٹرڈیم کی ہیروں بھری دوکان ہے۔ شاعر ہے، کہانیاں لکھتا ہے، شخصیت نگاری کرتا ہے، ادبی مجلے کا مدیر ہے۔

سوچنے والی بات ہے اسے یہ خزانہ ملا کیسے؟ اس کی شخصیت میں مٹھاس جس گڑ کی بیلی سے آیا ہے وہ شخصیت اس کے والد باؤ منظور کی تھی۔ باؤ منظور ریلوے کے افسر تھے اور راوی دریا سے مچھلیاں پکڑنے کی رسیا۔

ریل گاڑی سے بڑا کہانی کار کوئی نہیں ہوتا۔

کہانیاں ریل پہ چڑھ کے سفر کرتی ہیں۔

نعمان منظور کو ریل کے پہیے اور ریل گاڑی کا نصیب ورثے میں ملا ہے۔ ٹھہرے رہنا، رکے رہنا اس کے نصیب میں نہیں، چلتا یہ بھی اپنے مخصوص محبتی ٹریک پہ ہے۔ اس کے سفر کی منزل میں سفر ہی ہے۔ ہر سفر میں جبر ہوتا ہے۔ سفر میں جبر سہنے کا نام صبر ہے۔ صبر کرنا اس نے بہت پہلے اپنے ابا کے ساتھ راوی کنارے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سیکھ لیا تھا۔

مچھلی کی ڈور سے اچھی صبر سکھانے والی کوئی استانی نہیں۔

جس نے کبھی مچھلی کی ڈور گرا کے مچھلی کا انتظار نہیں کیا وہ ساری عمر بے صبرا ہی رہتا ہے۔ درد کی تربیت اسے اس کی والدہ نے دی۔ یہ انہی کے حکم سے سعودی عرب گیا تھا، آخری بار اس کی اپنی والدہ سے ملاقات ہو رہی تھی اور اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ پھر ملاقات نہیں ہوگی۔ والدہ کہنے لگیں، نعمان تو اب واپس آ جا۔ بس ماں، ایک مہینہ

دے دے۔ بارہ سال سے ادھر سامان بکھرا ہوا ہے۔ سمیٹ لوں تو آیا،

یہ کھلا ہے، بکھرا سامان زندگی کا، کبھی کسی سے وقت پہ سمٹا ہے؟

اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا اس کی ماں کے پاس پورا مہینہ بھی نہیں ہے، پندرہ دن ہی ادھر گزرے تھے کہ فون آ گیا۔ ماں چلی گئیں، سولہ گھنٹے یہ دمام ایئرپورٹ کی سولی پہ لٹکا رہا، اسے جہاز نہ ملا، بیس گھنٹوں کے انتظار کے بعد ماں کی آنکھیں نعمان کی راہ دیکھتے دیکھتے اس کے دیکھے بغیر ہی دفنا دی گئیں۔ درد کا نعمان کی روح میں وہ بڑا گہرا گھاؤ تھا، ہیرے کی پختگی کا یہ معیار بھی یہ پاس کر گیا۔ تب تراش خراش کے لیے چاقو بردار چنے گئے۔ نعمان منظور کے جملہ محاسن کی تکمیل کے لیے یوں تو بہت سے اساتذہ کے نام ہیں مگر اس کے سکول کے سارے ماسٹروں کا ہیڈ ماسٹر ایک ہی ہے۔ ہیرے کو جس شکنجے میں جکڑ کے ہیرے کی کنی والا چاقو چلایا جاتا ہے اس شکنجے ہیرا چاقو کا نام ہے خالد احمد۔

خالد احمد وہ کمال ماہرِ تعمیرِ بشر ہے جو بڑی مشکل سے کسی کو اپنے سکول میں داخلہ دیتا ہے، بڑی چھان پھٹک کے بعد یہ گندھی مٹی کو اپنے چاک پہ چڑھاتا ہے۔ مگر جو خوش بخت ایک بار خالد احمد کے چاک پہ چڑھ گیا وہ کبھی پھر پھسلتے ہوئے نہیں دیکھا، جس پہ خالد احمد نے توجہ دے دی اس کا رخ بدل گیا، وہ پیالے سے صراحی بن گیا۔ پینے والے ہونٹ سکڑ گئے، پلانے والا ظرف بڑھ گیا۔

خالد احمد نعمان منظور کا بڑا بہنوئی ہے۔ اس لیے اسے اپنالیا، سالا بنالیا، ورنہ خالد احمد کسی سالے کو بھی سالا نہیں بناتا، خالد احمد اندر سے صوفی ہے، باہر سے شاعر، شاعر بھی ایمپائر سٹیٹ جتنا اونچا۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا اصلی وارث، وہ اسے قاسمی جی کے دفتر لے جا کے ایک کونے میں بٹھا دیتا۔ تربیت کا باقی کام قاسمی صاحب کی موجودگی کرتی رہتی۔ جیسے سنار کی دوکان سے سنہرا پن بٹتا ہے۔ نعمان منظور بھی سال ہا

سال کی ان ملاقاتوں سے سنہرا ہوگیا۔ وہیں نعمان کو خالد احمد کے سارے دوستوں کی توجہ بھی ملی۔ امجد اسلام امجد سے والہانہ خوش رنگ رس، خلوص اور تخلیقی زعفران عطاء الحق قاسمی سے عطا یافتہ کہنے کا مسحور کن فن اور ناتراشیدہ سماعتوں کو سننے کا صبر آفریں سلیقہ۔ عطاء الحق قاسمی سے ہی اس نے لفظ کی گیند کو سپن کرنا سیکھا، ورنہ خالد احمد اورا س کے دوسرے دوست اسے صرف فاسٹ باؤلنگ کے ٹریک پہ ہی دوڑاتے رہے۔

کہنے کو اس ہیرے کی تراش خراش میں بڑے نامی گرامی ناموں کے نام آتے ہیں۔ مگر اس نگینے کی اصل تراش خراش جس شخص نے کی ہے اس شخص کا نام یہ خود آج بھولے بیٹھا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسے سعودی عرب میں رہتے ہوئے آٹھواں سال تھا۔ کسی پاکستانی ہوٹل میں اسے ایک دُکھی پاکستانی اجنبی نظر آیا۔ تین دن یہ اسے اس ہوٹل میں کسمپرسی سے بنا سالن لیے روکھی روٹی کھاتے دیکھتا رہا۔ چوتھے دن اس سے رہا نہ گیا پوچھنے گیا، کیا پریشانی ہے، اجنبی رونے لگا۔ بولا نوکری تھی چلی گئی، پردیسی ہوں، کوئی جاننے والا نہیں، کون مری ضمانت دے نوکری دلوانے میں، نعمان نے ہاتھ میں اٹھایا لقمہ رکھ دیا۔ اجنبی کو ہاتھ سے پکڑا اور اپنے ایک جاننے والے عرب سیٹھ کے پاس لے گیا، اس سیٹھ کی وہاں ہیروں کی دوکان تھی، وہ سیٹھ بھی شاید ایمسٹرڈیم کے ہیروں کے تاجروں سے ہیروں کی پہچان کے سارے سبق سیکھ کے نعمان کو ہیرا مان چکا تھا۔ نعمان نے اجنبی کی شخصی ضمانت دے دی۔ سیٹھ نے اس اجنبی کو ہیروں کی چوکیداری پہ رکھ لیا۔ نعمان کو کیا پتہ تھا کہ یہ دودھ پہ بلی کو بٹھوا کے آیا ہے۔ ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ واردات ہوگئی، پتہ چلا وہ جس پہ ترس کھا کے نعمان نے ضمانت دی تھی وہ کوئی پیشہ ور مجرم تھا۔ موقع کی تلاش میں تھا جونہی موقع ملا وہ ڈیڑھ لاکھ سعودی ریال اور دو مٹھیاں ہیروں کی لے کر چلتا بنا۔ بات پولیس تک پہنچ گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جتنا بھی نقصان سیٹھ کا ہوا ہے، وہ سب ضمانتی ادا کرے۔ نعمان پورا کرے۔

نعمان نے وہ نقصان پورا کیا۔ پرانے وقتوں کی سنی دیومالائی کہانیوں سے بھی بڑی انہونی ہوگئی۔ پرانی کہانیوں میں تو مڑ کے دیکھنے والا شہزادہ پتھر کا ہو جاتا تھا۔ یہاں مڑے بغیر گرے کو اٹھانے والے شہزادے کے نصیب میں پتھر ہونا لکھ دیا گیا۔ نعمان نے آٹھ سال میں جو کمایا تھا وہ سیٹھ کے حوالے کیا، مگر نقصان ابھی باقی تھا اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے اسے چار اور سال پردیس میں اپنے پیٹ پر پتھر رکھنا پڑے۔ انہی پتھروں کی سلوں کے وزن کے بوجھ ہی سے تو ہیرے کی نمو ہوتی ہے۔ میں نے ایمسٹرڈیم کے سیٹھ سے ہیروں کی پرکھ سیکھی ہوئی ہے۔ میں باہوش و حواس یہ تصدیق کرتا ہوں کہ نعمان منظور وہ سوہنا تخلیق کار ہے جس کے من کا میل اترا ہوا ہے، جو اجالے بانٹتا ہے۔ ایک بوند روشنی کی لے کر کمال محبت سے تخلیقی ادب میں خیر کی تخلیق کرتا ہے۔ نعمان منظور ہم پتھروں کی بستی کا کوئی خالی خولی پتھر نہیں ہے، یہ ہیرا ہے۔

o

خیر پوریا...... مسعودالحسن ضیاء

خیراور شر میں سے اگر کوئی شے زیادہ پرکشش اور دھونس والی ہے، تو وہ شر ہے۔ مگران تینوں کے ہوتے ہوئے، اگر کوئی، خیر کے شیرے میں لت پت ہوا، سوچ وفکر کی کنالی میں گندھے اُجلے میدے کی جلیبیاں پورنے لگے تو وہ میرے خیال میں خیر پوریا ہے۔

مسعودالحسن ضیاء کو میں اسی لیے خیر پوریا کہتا ہوں کیونکہ اُسے خیر پورنے والوں سے کچھ نسبت ہے۔اس کے محلے والے بھی اسے خیر پوریا کہتے ہیں۔ان کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ابا مرحوم کا تعلق خیر پور ٹامیوالی سے تھا۔ یہ چار سال کا ابھی قدم قدم چلتا حیران بچہ تھا کہ اس کے والد محترم فوت ہو گئے۔ خیر پور ٹامیوالی میں اس وقت اس کے علاوہ اس کی بڑی بہن اور والدہ تھیں۔ وہ دونوں اتنے گہرے غم کے کھوہ میں ڈوب کے ساری عمر اُبھر نہ پائیں مگر مسعود کو انہوں نے اُس کھوہ کی منڈیر سے گرنے نہ دیا۔ یہ بھی غم اور دکھ کے کنوئیں کو گھر میں کُھدا دیکھ کے اس کی منڈیر پر بیٹھا

جوان ہو گیا۔

اُس نے ماں کے مقدس چہرے پر ساری عمر اپنے باپ کا سفید کورے لٹھے کا کفن اوڑھا دیکھا اور باپ اور ماں دونوں رشتوں کی پہچان اپنی ماں کو بنا لیا۔ 32 سال بعد، کچھ سال ہوئے جب اس کی ماں نے بھی اس کے باپ سے لیا کفن کا گھونگھٹ اپنے پیروں تک پھیلا لیا تو اس نے اسی کورے لٹھے کی بے داغ سفیدی کے اُجلے پن کو اپنے من میں اُتار کے، زمین پہ اُترتی، اُجلی براق کرنوں کا آسمان تک سراغ لگانے کا ارادہ کر لیا۔ اس مہم جوئی میں اسے کئی گرو مل گئے۔ کسی نے اس کی انگلی پکڑ لی۔ کوئی اسے کندھوں سے پکڑے گلیوں میں لیے پھرتا رہا اور کوئی اِسے کندھوں پہ بٹھا کے دور سڑک تک لے آیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سڑکیں ساری اسے ایسی ملیں جو اِسے شہر اقبالؒ تک لے آئیں۔

شہر اقبال سے میری مراد، وہ شہر نہیں جہاں اقبالؒ پیدا ہوا، یا رہا، بلکہ اقبالؒ کی فکر کا بسایا ہوا وہ شہر، وہ بستی جہاں اقبال ہمیں بسانے کا آرزومند ہے۔ چونکہ فکر اقبالؒ میں کلیدی حوالہ شاہین ہے۔ جس کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ ایسا آبرومند، بلند پرواز، نگاہ بلند شہباز ہے جو اپنے رہنے کے لیے گھر نہیں بناتا۔ اپنے آپ کو مکانی آلودگی سے آلودہ نہیں کرتا۔ نہ اپنی پہچان کے لیے کسی شہر یا محلے کا پتہ دیتا ہے۔ اس لیے شہر اقبالؒ کو میں اس کے شاہین کی پرواز کا وہ آفاقی راستہ خیال کرتا ہوں، جس بلندی پہ کوئی کرگس کبھی پر مارتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ورنہ ذاتی طور پر مجھے شہر اقبالؒ کی اپنی کہی، اس کسوٹی سے زد پہنچتی ہے۔ کیونکہ میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں پلا بڑھا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا ہوں۔ جرمنی پڑھنے گیا۔ مگر مجھے پتہ ہے، اتنی تھوڑی سی اتفاقی سہولت سے کسی کو شہر اقبالؒ کا ڈومیسائل نہیں مل سکتا۔

اس میں داخلے کی پہلی شرط، فکر اقبالؒ کی اڑان کی رفعتوں کا شعور پا کے، اس کی

دیکھی ہوئی گلیوں اور دکھائے گئے راستوں پہ نہیں، کسی منزل کو، اپنے دل میں گھر کر لینا ہے۔ مسعود اس کسوٹی پہ پورا اترتا ہے۔ اقبالؒ کو سوچتا ہے۔ اقبالؒ جیتا ہے۔ اقبالؒ پہ چھپی دنیا کی ہر کتاب اس کے گھر میں موجود ہے۔ اقبالیات کا خانہ اس نے اپنے مرحوم پڑدادا، جو اپنے زمانے میں حکیم اور دانا تھے، ان کے قلمی نسخوں بیاضوں اور مخطوطوں سے اوپر رکھا ہے۔ اقبالیات کے شیلف میں اگر اس نے کوئی کتابی گھپلا کیا ہے تو صرف اتنا کہ مفتی جی کو اس میں گڈمڈ کیا ہوا ہے۔ میں نے ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے یہ اقبالیا بھی ہے اور مفتیا بھی۔ کہنے کو اس کے شہر کا نام بہاول پور ہے محلے کا نام ماڈل ٹاؤن ہے مگر یہ جہاں مرضی رہے، پھرے، یہ اقبالؒ کو جیتا ہے جیسے اقبالؒ نے کمسنی میں اس کے دیکھے باپ کے کفن اور جوانی میں گزری اس کے ماں کے کفنائے چہرے پہ رُکی اُجلی سفیدی کی کرنوں کے تعلق کو آسمان سے جوڑ دیا ہو۔ اسے آسمان سے اُترتی بچی بے داغ بشارتوں کا کوئی سراغ بتا دیا ہو۔ یہ قرآن اور حدیث کے بعد جس کتاب کو باوضو ہو کر پڑھتا ہے وہ کلیات اقبالؒ ہے۔ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے اگر ہمارے ملک میں قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ کسی اور علم کی آگاہی کے لیے کوئی مدرسہ کھلا تو وہ بہاولپور میں قائم ہو گا اور وہاں اقبالیات پڑھائی جائے گی۔ اس مدرسے کا ہیڈ ماسٹر مسعود الحسن ضیاء ہو گا۔ مسعود کا یہ دعویٰ ہے کہ اقبالیات میں ساری جگ مگ علم قرآن اور حدیث مبارکہ سے ہے۔ یوں اگر ایسا کوئی مدرسہ کھلا تو یہ کوئی بدعت نہ ہو گی بلکہ قرآنی آفاقی روشنی کو پا لینے کا شارٹ کٹ ہو گا۔

شارٹ کٹ کی تلاش میں یہ ممتاز مفتی تک پہنچ گیا۔ برسوں پہلے اس نے اپنی منگیتر کو تحفہ دینے کے لیے بہاولپور کے ایک کتب فروش سے جلدی میں پڑھے بغیر صرف ٹائٹل پہ بنے سادہ سے مسکین صورت آدمی کی تصویر دیکھ کے ایک کتاب خرید لی۔ رام دین۔ کہنا اپنی منگیتر کو یہ چاہتا تھا کہ دیکھو شادی کے بعد جب تم مجھے پڑھو گی تو

میں اندر سے ایسا بے وقوف نہیں دِکھوں گا جیسی گتے پر تصویر ہے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے کتاب دینے سے پہلے پڑھنی شروع کر دی۔ کتاب ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ ممتاز مفتی سے ناآشنا تھا۔ اس نے صرف علی پور کے ایلی اور اس کے دو چار کرداروں کی شوخ رنگی رنگائی شہرت سن رکھی تھی اور ممتاز مفتی کی کتاب سے یہ اپنی ان دیکھی منگیتر کو یہ پیغام بھی دینا چاہتا تھا کہ مجھے بھی ایلی ہی سمجھ لینا اور تم شہزاد نہ بھی ہوئی تو سادی ضرور ہو گی۔ مگر جب خود کتاب پڑھنے بیٹھا تو شہزاد اور سادی کی طلب سے بیگانہ ہو گیا۔ میں اور میرے اللہ میاں پڑھتا پڑھتا ایک ہی جست میں لبیک تک جا پہنچا منگیتر کو تو بہشتی زیور کی جلد دے کر ٹرخا دیا۔ خود سر سے پیر تک مفتی زیور سے لد گیا۔ مفتی جی کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ہی اسے مفتی جی کی کھوج لگ گئی۔

سائیں اللہ بخش سے مفتی جی کا پتہ پوچھ کے اس نے جا اسلام آباد میں اُن کے دروازے پر گھنٹی بجائی۔ انہوں نے اندر بلا کر اسے کرسی پر بٹھا لیا اور خود سامنے چٹائی پر بیٹھ کے اس سے پوچھنے لگے مسعود تو نے بہاول پور میں رہتے رہتے کیسے اقبالؔ ڈھونڈ لیا۔ صحرا میں رہنے والے ریت چبھن آنکھوں میں بسا کر اپنے ہی آسمان کے تارے گنتے رہتے ہیں۔ تو نے ریگزاروں پہ چڑھتا پورن ماشی کا پورا چاند کیسے اوڑھ لیا۔ اور خود اس کے چاند بچھونے پہ اُچک کے چاک پہ بیٹھ کر اپنے وجود کی مٹھی بھر مٹی، کو اقبالؔ کی سوچ کے ہاتھ میں کیسے دے دیا؟

تجھے ڈر نہیں لگا۔

تیرا خون خشک نہیں ہوا۔

یہ جانتے ہوئے کہ اقبالؔ تیری عمر کے کھلنڈروں کو ورغلا لیتا ہے۔ بازاروں اور گلیوں کی دکانوں پہ ولایتی روغنی چابی بھرے گڈے گڈیاں لے کر اُن میں اپنی چابی بھر دیتا ہے پھر وہ ان لاڈلوں کا دھیان ان ظاہری رنگ و روغن سے ایسا پلٹتا ہے کہ وہ

کھیلنے کو گڈے گڈیاں نہیں مانگتے جو زمین پہ رینگتے پھرتے ہیں۔ وہ آسمان کا چاند مانگتے ہیں۔ نگاہ اوپر رکھ کے چلنے کی انہیں ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ ہماری ان ساری گلیوں میں پھر وہ ٹھڈے کھاتے پھرتے ہیں۔

تو اپنا بھلا سوچ

کمائی کر۔

اچھا کھا۔

مہنگا پہن۔

تو نے جغرافیہ میں ایم۔اے کیا ہے پھر تیرا دنیا کے چلن کا جغرافیہ اتنا کمزور کیوں ہے۔ تو دوائیوں کی کمپنی میں توانٹی بائیوٹک ٹیکوں کے پرچار کی تنخواہ لیتا ہے پھر بھی سچ سے بھرے اخلاقی کیپسول سے اس سماج میں پیدا ہونے والے سائیڈ افیکٹ سے بے خبر ہے۔

حیرت ہے تو سوا چھ فٹ کے موچھیں مروڑتے جثے کی اوٹ میں کیا سوچوں ماری کچی روغنی ہنڈیا لیے چولہے پر بیٹھنے آ گیا ہے۔

پتہ نہیں تجھے چولہے میں جلتی لکڑیوں کا سیک کیسا ہوتا ہے۔

تیری مت ماری گئی ہے۔

جا موج کر، تیری عمر موج میلا کرنے کی ہے۔

مسعود کوئی ٹلنے والا تھا، نہ ٹلا،

ان سے خط و کتابت کرنے بیٹھ گیا۔

وہ لکھتے کیوں اپنا وقت ایک بوڑھے پر برباد کر رہا ہے۔

تیری عمر تو لو لیٹر لکھنے کی ہے اُدھر ہاتھ مار کہ تجھے قلم کی کاغذ پہ حکمرانی کا ڈھنگ آئے۔

یہ کہتا ہے مجھے لولیٹر لکھنے نہیں آتے۔

مفتی جی نے لکھا تو ابدال بیلا کے پاس جا، اس سے سیکھ۔

یہ کہہ کے مفتی جی چلے گئے۔

کئی سال یہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔

ایک دن ملتان میں مجھے ایک ٹیلیفون آیا۔

میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک شیرے میں لتھڑی چپ چپی میٹھی اجنبی آواز آئی۔

آواز نے اپنا نام پتہ بتانے سے پہلے ممتاز مفتی کا نام لے لیا۔

میں ایک دم سے سارے تحفظات اور تکلفات چھوڑ کے بول پڑا۔

یار چھڈ فیر تعارفی باتاں۔

آ جا بیٹھ کے باتیں کریں گے۔

مسعود آ گیا۔

اُس دن سے یہ میرے کنبے کا فرد ہو گیا۔

مفتی جی کا کنبہ بہت بڑا ہے، شاید ہی کوئی شہر کوئی بستی ایسی بسی ہو جہاں مفتی جی کا کوئی لاڈلا یا لاڈلی نہ بستی ہو۔ اُن میں سے کسی کے گھر چلے جاؤ اپنا گھر لگے گا ڈرائنگ روم میں جہاں ان کے باپ دادا کی تصویریں لگی ہوں گی اُن سے اوپر انہوں نے ممتاز مفتی کی تصویر لگائی ہوگی۔ کتابوں کی الماری میں سب سے پہلے اوپر والے خانے میں مفتی جی کی کتابیں سجائی ہوئی ہوں گی۔ ان گھروں میں پہروں بیٹھے رہیے۔ ایک بار ممتاز مفتی کی گفتگو شروع ہو گئی تو اور کوئی موضوع درمیان میں نہ ہوگا۔

بس مفتی جی کو جیتے جاؤ، کہے جاؤ، سنے جاؤ سنائے جاؤ۔

ایسے گھروں کو میں مفتی نگر کے گھر کہتا ہوں۔

بہاولپور میں تین خیر گھروں کا سراغ ملتا ہے۔ جہاں مسعود نے خیر کی طرف جاتی راہ دریافت کی ہے۔ اسے خیر کی پُڑی دینے والے پہلے بابا سید فضل حسین شاہ ہیں۔ قد کاٹھ اور جسمانی ہیئت میں وہ ممتاز مفتی ہیں۔ وہی پانچ فٹ چار انچ کا قد۔ پتلا منحنی سا بوڑھا نحیف جسم۔ کچھ دن کی بڑھی ہوئی شیو۔ کھلا ہوا ملگجا سا شلوار قمیض۔ آنکھوں میں بھی ان کے مفتی جی کی آنکھوں سے ملتی جلتی موم بتیاں ہیں۔ جو سیدھی دل میں جا کے قمقمے جلانے لگتی ہیں۔ یہ بولنے لگیں تو پتہ چلتا ہے یہ ممتاز مفتی نہیں کوئی اور ہیں۔ الور کے رہنے والے ہیں اردو میں بڑی شائستگی اور دھیمے پن سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر ذرا سی دیر آپ ان کی رکھ رکھاؤ بھری مجلسی اردو سے نگاہ اُٹھا کے دیکھیں اور باتوں کی خوشبو اور رخ دیکھیں تو وہی مفتی جی جیسی گفتگو۔ وہی سیال۔ وہی شربت۔ میٹھا اور رنگ رس بھرا۔ جس کے ہر گھونٹ سے اللہ کے قرب کی مٹھاس۔ اللہ کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے کمسنی میں لنگوٹیے سے گلی کی محبوبہ کا احوال کہہ رہے ہوں۔ مجھے تو یہ مفتی جی کا نکھرا ہوا اردو معلیٰ والا ایڈیشن لگتے ہیں۔ مفتی جی پنجابی میں بے تکلف اللہ سے جپھی ڈالے بیٹھے پینگ چڑھاتے رہتے تھے۔ شاہ جی بھی اسی طرح ترنگ میں اللہ کی گود میں بیٹھے اس کے ذکر پاک کی چوسنی لیے مسکراتے رہتے ہیں۔ اللہ کے ناموں سے انہیں ایسا عشق ہے جیسا ہیر کو رانجھن سے تھا۔ جوانی میں کہیں انہیں فقیر محمد عیسیٰؒ کا قرب مل گیا۔

فقیر محمد عیسیٰ بہار ہائیکورٹ کے ایک جسٹس تھے۔ طوفان نوح جیسے گرادب نصیب دنوں میں جب اپنی شناخت کے شعور اور قائم رہنے والی کشتی پہ چڑھنے کا عزم ہوا تو وہ اپنی عدالت کی چار دیواری سے عدل کی گٹھڑی سوٹی سے باندھ کے ننگے پیر مسلمان قافلوں کے ساتھ ملتان آ گئے۔ ادھر آ کے انہوں نے عدل کو لوگوں کی گٹھڑیوں میں بندھا دیکھا تو اپنی گٹھڑی سوٹی سے اتار کے تکوار سے باندھ لی۔ جدھر

دودھ میں پانی ملا دیکھتے دو ہاتھ گھما کے مارتے۔ ہاتھ شل ہو گئے تو جو ہاتھ جوڑ کے بنتی کرتا اس کے ہاتھ میں اپنی تلوار کا دستہ پکڑا دیتے۔ یہاں کے لوگوں نے انہیں تلوار شاہ کا نام دے دیا۔ کہتے ہیں ایک بڑا زیرک عوام دوست لیڈر لوگوں سے پہلا جلسہ کرنے سے پہلے ان کے استھان پہ سر جھکا کر آ بیٹھا۔ انہوں نے اسے تلوار دے دی۔ اس نے اسے اپنا انتخابی نشان بنا لیا۔ اسی نشان سے وہ ایسا جیتا کہ جیت کا نشہ اس کے سر پہ چڑھ کے بولنے لگا۔ دوسری بار شاید انہوں نے خود اسے طلب کیا وہ مصروفیت کا مارا نہ آ سکا۔ تلوار شاہ نے جلال میں آ کر اپنی تلوار کے مٹھے پہ رسی گھما کے باندھ دی۔ ابھی تک ان کے جلال کا یہ عالم ہے کہ ان کے درگاہ کی راہ نہیں بنی۔ شاہ رکن عالمؒ کے باغ بیچ ان کا مدفن ہے۔ یہ فضل حسین اسی تلوار شاہ کی ایک چھپی ہوئی میان اندر تلوار ہیں۔

ایک شام کی بات ہے، میں ملتان سے اپنی جیب میں اسماء اللہ کی ایک چھوٹی سی خوشنما پاکٹ سائز کتاب لے کر بہاولپور ان سے ملنے گیا۔ ارادہ تھا کہ پوری رات وہ کتاب سامنے رکھ کے اللہ کے ایک ایک نام پہ صبح تک شاہ جی سے باتیں سنوں گا۔ سلام دعا اور معانقہ کے بعد بیٹھتے ہی میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے اسمائے اللہ کی کتاب نکالتے ہوئے کہا شاہ جی، آج رات صبح تک میں جو آپ سے سننے آیا ہوں وہ پیش کرتا ہوں۔ شاہ جی نے بھی اسی دوران اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈال لیا اور بولے آپ کے لیے ہم نے بھی ایک تحفہ لے رکھا ہے۔ پہلے وہ قبول کریں۔ دونوں ہاتھ ایک ساتھ ہی جیبوں سے نکلے اور ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ مٹھیاں کھلیں تو میں ششدر رہ گیا۔ شاہ جی کی کھلی مٹھی میں بھی اسمائے اللہ کی وہی جلد تھی جو میں جیب میں رکھ کے ان کے لیے لایا تھا۔ پاس بیٹھا ہوا مسعود بھی حیرت سے اُچھل پڑا۔ میں نے شاہ جی کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی جلد چوم کے اُٹھا لی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب شاہ جی کو پیش کر دی۔ وہ ساری رات صبح تک ہم خدا کے ناموں کو سوچتے

اور بولتے رہے۔ خیال تھا کہ صبح کی اذان تک ننانوے نام پورے کہہ سن لیں گے۔ ہوا یہ کہ ایک الرحمٰن پر گفتگو کرتے کرتے رات بیت گئی۔ رات کی بے ثباتی کا اس رات سے زیادہ کبھی احساس نہ ہو سکا۔ بعد کی کئی ملاقاتوں میں شاہ جی سے اسمائے حسنٰی پر گفتگو ہوتی رہی۔

ارادہ میرا تھا کہ اللہ کے نام پر اپنی محبت کی زبان میں کچھ لکھوں۔ چونکہ مجھے احساس ہے کہ مجھے ایک کہانی کار کی معمولی زبان ملی ہے تو اندیشہ یہی تھا کہ خدا کے حضور جتنے نام ہیں اتنی کہانیاں کہہ کے انہی کے حضور پیش کردوں تو شاید بندگی کی ب کا نقطہ بن جائے۔ مسعود اسی رات یہ پوچھ بیٹھا کہ اجازت ہو تو میں ان پر قلم اٹھاؤں۔ میرے بولنے سے پہلے شاہ جی بول اٹھے۔

حد کرتے ہو جس کا نام لے کر قلم نے لکھنا سیکھا ہے،ا

اس کے ناموں کو لکھتے ہوئے کیسی اجازت طلب کرتے ہو۔

مسعود نے اسی رات قلم سنبھال لیا۔

ایک ڈائری کسی گزشتہ سال کی سامنے کھول کر رکھ لی۔

جس کے سارے سال کے شب و روز کورے تھے، ان پہ اس نے ایک ایک کر کے ننانوے نام اتارنے شروع کر دیے۔ شاہ جی کہتے جاتے، باتیں ہوتی جاتیں، وہ لکھتا رہتا۔ کچھ دنوں بعد اس نے مسودہ کمپیوٹر سے کمپوز کروا کے مجھے اس کی کاپی بھیجی اور ٹیلی فون پہ کہا کہ ان پر کچھ لکھو۔

میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

اللہ کے بندے، جس دو ٹکے کے کہانی کار کی ساری عمر کی کہانیاں اس کے ایک الف کے راز کی گرد تک نہ پہنچی ہوں، وہ کیسے اس کے ننانوے پاک ناموں کی چابیوں کے گچھے کو انگلی میں گھماتا پھر سکتا ہے۔ جس میں زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے

درمیان میں ہے، سب بند تالوں کی قسمت کا احوال محفوظ ہو۔

میں نے اس کی منت کی کہ شاہ جی سے لکھوا۔ وہ ایک نظر دیکھ کے کورے کاغذ پہ صحیفوں کے بول لکھوانے کی شکتی رکھتے ہیں۔ وہ تیرے پاس قریب کی گلی میں رہتے ہیں ان سے جا کے کہہ۔

کہنے لگا، کہہ آیا ہوں۔

وہ کہتے ہیں ابدال کو کہو۔

شاہ جی بھی مفتی جی کی طرح بندے کی گردن میں رسی ڈالنے کے ماہر ہیں۔ رسی ٹوٹتی ہے نہ گردن۔ بندہ ساری عمر سولی پہ لٹکا رہتا ہے۔ سولی بھی ایسے عشق کی جس پر ہزاروں جسم قربان۔ بس بندہ سوچے، پیدا ہوتا رہوں اور اس عشق کے پھندے میں گردن دیتا رہوں۔ اللہ سے عشق کرنے والوں کی بات نہیں کہتا۔ ان پہ تو ارض وسما کی بلندیاں روڑا روڑا ہو کے ایسی یلغار کرتی ہیں جیسے پہاڑی ندی کی گود میں پورا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کے گرتا ہے۔ کسی میں ایسا حوصلہ ہو تو وہ اس کی بات کرے۔ نہ حوصلہ ہو تو زبان دانتوں میں دابے رکھے۔ میں تو دبی زبان سے ادب کے ساتھ اس کے کسی ایک نام نامی سے تعلق پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی بات کرتا ہوں۔

شاہ جی کے منہ میں پورے دانت نہیں ہیں۔ وہ اللہ سے عشق کی بات کھل کر لیتے ہیں۔ ساری عمر انہوں نے بھی پہاڑی ندی کے شفاف پاکیزہ بہاؤ کی طرح کاٹی ہے۔ میدان میں اتر کے اپنے دریا کا پاٹ ایسا کشادہ رکھا کہ سمندر تک آتے آتے سارا پانی ہوا کو چٹا دیا۔ اپنا دریا دیکھنے میں چٹیل صحرا کر لیا۔ خود ادھر دھرتی اور آسمان کے بیچ کہیں بادل کی لطیف سی ٹکری سے اُڑتے پھرتے ہیں۔ کبھی اِدھر برس گئے۔ کبھی اُدھر برسات بہا دی۔ ساری عمر شہر کے چوک میں میلے کپڑے پہن کے ہاتھ میں رنگ سازوں کی کوچی اور سفیدی کا کنڈے والا ٹین کا ڈبہ لے کر گزار دی۔ صبح جو چوک پر

بلانے آ گیا یہ اپنی کوچی اٹھا، ڈبہ سنبھال اُس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک دن مجھ سے بولے اب بوڑھا ہو گیا ہوں، سفیدی کا برش نہیں اٹھایا جاتا۔ اپنا کسب اب ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

میں نے ہاتھ جوڑ دیے، کہا، شاہ جی کسب کمال تو اب پایا ہے آپ نے۔

کام بھی نہیں بدلا گیا آپ سے۔

وہی کوچی سفیدی کی، اب بھی آپ کے ہاتھ میں پکڑی دِکھتی ہے۔ چونے کا بڑا ڈرم بھی آپ اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو اتنا ہے پہلے آپ مکان کی دیوار پہ چونا کرتے تھے۔ اب آپ نے مکینوں کے قلب پر کوچیاں پھیرنا شروع کر دی ہیں۔ چونکہ برش چلانے میں عمر بھر کی رزق حلالی کی سند اور مہارت ہے۔ اس لیے جدھر اُجالے بھرے اُجلے پن کی مٹھی بھر کے کھولتے ہیں،

چانن کر دیتے ہیں۔

شاہ جی مانتے تھوڑی ہیں۔

مفتی جی بھی نہیں مانتے تھے۔

اقبال نے بھی اپنا راز نہیں دیا۔

یاد رکھیں کوئی بھی خیر بھرا مزدور، جب خیر بانٹنے کی مزدوری کرتا ہے تو بغیر اُجرت لیے کرتا ہے۔

اس کی اجرت خدا سے طے ہے۔

وہیں سے لیتا ہے وہ اپنا معاوضہ۔

اور وہ اُجرت کم سے کم اتنی ہے کہ خدا اُسے اور اس کے نام کو، خیر کے ساتھ اس کے بعد، دنیا میں قائم کر دیتا ہے۔

اُس پر ایک اور فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی کشٹ اٹھائے اُس پہ مان نہ

کرے۔ نہ اُسے اجازت ہوتی ہے کہ اپنے کسب کا اظہار کرے۔

کچھ بھی ہو، اسے اپنے کسب کا اقرار نہیں کرنا۔

ڈینگ نہیں مارنی۔

میں میں نہیں کرنی۔

دل و جان سے یہ تسلیم کرنا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس کے اپنے ہاتھ میں اس کی ذاتی ملکیت صفر ہے۔

حقیقت بھی یہی ہوتی ہے، یہی سچ ہوتا اور اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔

حکم بھی یہی ملا ہوتا ہے اُسے۔

اور وہ بھی پورے صدق اور یقین کے ساتھ عجز میں ڈوب کے پوری ایمان داری سے یہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی کمال نہیں اُسے کوئی ذاتی مہارت حاصل نہیں۔

سچ کہتا ہے وہ۔

قلب کے اندر کی دیواروں پہ کسی جن و بشر کی رسائی نہیں سوائے خدا کے۔ یہ اب خدا کی مرضی ہے کہ وہ کس کی نگاہ میں بیٹھ کے کس کے من میں اُتر جائے۔

ساری کائنات اس نے انسان کی سواری کے لیے بنائی ہے۔

اور اپنی سواری کے لیے انسان منتخب کیا ہے۔

جدھر اس کا رُخ ہو گیا وہ پُن ہو گیا۔

جس پہ وہ سوار ہو گیا وہی شاہین ہو گیا۔

اُس کا اقبال بلند ہو گیا۔

وہ اقبال کا بال جبریل ہو گیا۔

جسے آنکھ بھر کے دیکھ لیا اسے شکار کر لیا۔

اس پر ممتاز مفتی نے ''لبیک'' کہہ دی۔

وہی اُن کی ''تلاش'' ہو گیا۔

اسی کے اذن سے

''دروازہ کھلتا ہے''

وہ ہر بینا آنکھ کا سرمہ ہو گیا۔

دل کی میلی چار دیواری پہ پھر چاہے کوہ طور جتنا سرمہ ملا ہوا ہو، ایکا ایکی میں ایسی چکا چوند ہو جاتی ہے کہ روح پوری اس کے نور سے نہائی جاتی ہے۔

رہنے والی چیز تو روح ہے۔

نور کا غسل اِسی کے نصیب میں آتا ہے۔ جسے اپنا میلا پن نظر آجائے، جو غسل نور کی دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دے اور اپنے جسم میں رہتے ہوئے، اپنے چوبارے سے اُتر کے روح کے حجرے میں آبیٹھے۔

مکین تو یہ ہے۔

مکان تھوڑی باقی رہتے ہیں۔

یہ ہاتھ، پاؤں، کمر، کولہے، بازو، ٹانگیں، اکڑی گردن اور اس کے اوپر اُٹھا سر کب تک سلامت رہتا ہے۔

قیام تو روح کو ہے۔

جب وہ نہائی گئی، اسے ہی غسل مل گیا تو میلا پن کدھر رہا۔

میلے پن کا تعلق سارا دنیا کی چاہتوں سے بھرے میلے ٹھیلے سے ہے۔

وہ تھوڑی یہ کہتا ہے اس دنیا کا میلہ نہ دیکھ۔

دیکھ مگر اپنا آپ میلا نہ کر۔

بھرے دودھ کا کٹورا ہتھیلی پہ رکھ کے اس دنیا کے سارے پنڈال میں گھوم۔

پھر۔

مگر دیکھ ہتھیلی پہ پڑے پیالے کی ایک بوند دودھ کی نہ اچھلے۔

یہ اپنے اپنے دھیان کی بات ہے۔

جو بھرے دودھ کے کٹورے کے اُجلے پن پہ نگاہ رکھ کے سنبھل سنبھل کے اکڑے بغیر دھیرج سے قدم قدم چلتے ہیں، اس طرح کے کسی قدم سے دودھ نہ اُچھلے، ایک بوند نہ گرے، روح میں ملے اس کے نور کی، وہ راہ پالیتے ہیں۔ اُن کے اندر زمین آسمان کے نور کی کرن راستہ پالیتی ہے۔ ان کا وجود جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ وہ بندے سے بیٹھے بٹھائے ایک جلتا ہوا قمقمہ بن جاتے ہیں۔ جب اُن کے اندر روشنی پھوٹنے لگتی ہے تو انہیں دوسروں کو راہ دکھانے کی ذمہ داری مل جاتی ہے۔

اتنی سی بات ہے۔

انہیں پھر کسی اندھیرے سمندر کے ساحل پہ روشنی کے مینار کی سب سے اوپر والی منزل میں شفاف دمکتے آتش شیشوں کے خول میں بٹھا دیا جاتا ہے اور حکم ملتا ہے، اب اپنا سر ہلا ہلا کے اس طوفان بھرے پانیوں میں ڈوبتے ابھرتے آتے ہراساں جہازوں کے مستولوں کو دیکھ کے انہیں راہ دکھا۔

انہیں ساحلوں کے قرب کی طرف لاتی پانیوں میں دبی چھپی شاہرائیں بتا۔

دیکھو،

وہ ساری میری کشتیاں ہیں۔

جنہیں میں نے اپنے ایک چاہنے والے سچے پیغام بر کی کشتی میں لاد کر آج کے دن تک پہنچایا ہے۔

انہوں نے اُسی آنے والے دن تک جانا ہے۔

جب میں ساری ڈوبی ہوئی ریزہ ریزہ ہوئی کشتیوں کو تہوں سے نکال کر سالم کھڑا کردوں گا، اور اُن سے ان کے ہر سفر کا احوال دریافت کروں گا۔

پوچھوں گا اِن سے، کہ ان سب میں قطب نما لگا کے میں نے بھیجا تھا۔ پھر کیوں انہوں نے اپنے سفر کے چلن کو اس پیمانے سے درست نہ کیا۔

ان سب کو قطب نما پڑھنے کے طریقے بتاتا آیا ہوں۔

ان سب کے لیے سبق دینے والے بھیجتا رہا ہوں۔

آخری سبق دینے والا ابھی میرا کہا سبق دے کر چلا گیا۔

میرے دیے سبق بدلا نہیں کرتے۔

ہو سکے تو انہیں دہراتا جا۔

کہتا جا۔

کہ ان غرقاب پانیوں کے سفر میں اگر ہمیشہ قائم رہنے والے سلامتی کے قدم مطلوب ہیں تو میری تلاش میں نکل کے کسی اور کو آواز نہ دینا۔

تمہاری پکار کو سننے کے شکتی صرف مجھ میں ہے۔

کسی اور کو پکار کے نہ اسے شرمندہ کرنا،

نہ میرے غضب کو آواز دینا۔

دوستو یہ ہماری خوش بختی ہے کہ اُس نے اپنے غضب سے کہیں بڑھ کے اپنی رحمانیت کے مہربان بازو کھلے رکھے ہیں۔ شاہ جی کے ساتھ صبح تک صرف الرحمٰن پہ باتیں ہوتی رہیں تو مجھے خیال آیا کاش میرا نام صرف الرحمٰن کا عبد ہوتا۔ عبدالرحمٰن۔ شاہ جی بولے تو جن کی باتیں کرتا رہتا ہے سارے اُسی کے عبد بنے رہے ہیں۔

اسی ایک چابی سے انہوں نے اپنے بند تالے کھولے ہیں۔

یہاں کہنے کو جو مرضی ان کے نام ہوں وہ صرف الرحمٰن کے عبد ہیں۔ عبدالرحمٰن ہیں۔

ان کا اشارہ اقبالؒ اور ممتاز مفتی کی قبیل کے لوگوں کی طرف تھا۔

میں کن اکھیوں سے انہیں ایسے تک رہا تھا کہ وہ خود کو کیوں اس فہرست میں شامل نہیں کرتے، پھر مجھے خیال آ گیا۔

یہاں ہر اُس چونا گیر پر عاجزی کا حکم لازم ہے،

جس کے ہاتھ میں وہ اپنے نور کی بالٹی دے کر، دلوں میں روشنیوں بھری سفیدی بانٹنے کی ڈیوٹی پہ کھڑا کرتا ہے، اسے وہ اس مزدوری کے ساتھ ٹھیکے داری نہیں کرنے دیتا۔

سید فضل حسین شاہ کے علاوہ مسعود الحسن ضیاء کو دو ایک اور بھی چونا گروں کا قرب حاصل ہے۔ اس لیے تو میں نے پہلی ہی دو سطروں میں کہہ دیا تھا کہ آپ اسے جو مرضی کہہ کے بلاتے رہیں۔ میں اسے خیر پوریا کہتا ہوں۔ اسے خیر دینے والے دوسرے چونا گروں کا ذکر پھر کبھی سہی۔ خیر اور شر کی کہانی تو ابھی شروع سے پھر سنانی ہے۔ سن لینا جب سنانے کی اجازت ملی۔ اتنا طے ہے کہ خیر کی سب چابیاں اسمائے حسنیٰ ہیں۔ انہی سے خیر کے سب دروازے کھلتے ہیں اور یہ دروازے ہیں اسمائے الرسول اللہ ﷺ۔ یہی اسمائے خیر کی کل کہانی ہے۔

O

چھوٹے بھائی جان......افضال بیلا

اس کائنات کا رنگا رنگی اور اسے دیکھنے والی آنکھ میں عجیب سا رشتہ ہے۔ آنکھ کہتی ہے قریب ہو کے دیکھ، رنگا رنگی کہتی ہے، فاصلے پہ رہ۔ اتنا قریب نہ ہو کہ بے رنگ لگوں۔ معاملہ ہے بھی کچھ ایسا کہ زیادہ دور سے دیکھو تو منظر دھندلا۔ بہت قریب ہو جاؤ تو پھر وہی دھندلا پن۔ وہ تو شکر ہے خدا نے جہاں آنکھ کی ساخت میں آتشی شیشے کی مجبوری لکھی ہے وہاں اس نے انسان کو انسان کے سمجھنے کے لیے صرف اکیلی آنکھ کو بصیرت کا لائسنس نہیں دیا۔ اس کام پہ دھڑکتے دل اور اس میں پلتے احساسات کو بھی دیکھنے والی آنکھیں دی ہوئی ہیں۔ انہی آنکھوں کو کھول کے آج میں اپنے بڑے بھائی افضال بیلا پہ کچھ کہنے چلا ہوں۔ یہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، پاکستان کے ہم عمر، پاکستان کی طرف آتے قافلوں کے ایک کیمپ میں انھوں نے پہلے پہل آنکھیں کھولیں تھیں۔ ظاہر ہے دنیا میں کھلی ان کی آنکھوں نے جو پہلا پہلا منظر دیکھا وہ پاکستان کی تخلیق کا منظر تھا۔ اس قوم کا درد تھا جو پیدا ہوتے سمے زچگی کے درد سے

گزر رہی تھی، جنم لے رہی تھی۔ پتا نہیں انھوں نے اپنے شعور کا وہ پہلا پہلا منظر کیسے اب تک سنبھال کے رکھا ہوا ہے کہ اتنے سال ہا سال بعد یہ جو بھی دیکھیں، انھیں اپنی آنکھ کے منظر نامے کے کسی کونے پر جنم لیتے ہوئے معصوم پاکستان کا زخم خوردہ چہرہ ضرور دکھائی دے جاتا ہے اور یہ وہی منظر دوسروں کو دکھانے لگتے ہیں۔ پاکستان سے پیار کی خوشبو بانٹتے رہتے ہیں۔ یوں ہی سال ہا سال کی پاکستان سے ان کی محبت نے ان سے خفیہ خفیہ شاعری بھی کروادی۔ انھوں نے کتاب مرتب کر کے میرے سامنے رکھ دی اور حکم دیا کہ اس میں شخصیت کے رنگ اور شاعری کی خوشبو کو الگ الگ کر دوں۔ اب بڑے بھائی کو میں کیسے کہوں کہ یہ عہد عطر سازی کا نہیں ہے جب گلاب پتیوں سے اس کی خوشبو چرانے کے لیے خدا کسی شہد مکھی کے کان میں اذن دے۔ یہ زمانہ تو گلاب پتیوں میں گڑ ملا کے گل قند کے مزے چکھنے کا ہے کہ ظاہری صحت اچھی لگے۔

بڑے بھائی مجھ سے آٹھ نو سال بڑے ہیں۔ میرے پیدا ہونے سے پہلے ان کی عمر کے وہ برس کیسے کٹے، کس سے پوچھوں۔ ابا جی کو گئے اٹھارہ سال ہو گئے۔ امی جی کو چپ ہوئے گیارہ برس بیت گئے۔ بڑے بھائی جان اقبال بیلا سے پوچھا۔ وہ ان سے دو سال بڑے ہیں۔ دونوں اکٹھے سکول جاتے تھے، پڑھتے تھے، کھیلتے تھے۔ بھائی جان تو ہم دونوں بڑے بھائیوں کو کہتے تھے۔ مگر بھائی جان، بھائی جان کی رٹ میں کیسے پتا چلے کہ مخاطب کون ہے۔ اس لیے گھر میں طے ہوا کہ سب سے بڑے بھائی کو تو بڑے بھائی جان کہا جائے اور ان سے چھوٹے افضال کو چھوٹے بھائی جان (یوں افضال بھائی آٹھ نو سال بڑے ہوتے ہوئے بھی چھوٹے بھائی جان ہو گئے۔) ان کے بعد کچھ بہنیں پیدا ہوئیں۔ زیادہ تو فوت ہو گئیں۔ پھر کہیں جا کے میں پیدا ہوا۔ جب قدم قدم چلنے لگا تو انھوں نے انگلی سے لگا لیا، بڑے بھائی جان اقبال

بیلا کو والد محترم نے کچھ ایسے مرتبان سے شہد چٹایا تھا کہ وہ کتابوں کو چٹ کرنے میں جت گئے۔ امتحانوں میں اول آنا ان کے بچپن اور لڑکپن کا واحد مشن تھا۔ دبلے پتلے منحنی سے ہوا کرتے تھے وہ۔ اوپر سے عینک چمٹ گئی۔ بغل میں کتابوں کا بنڈل، گھر میں سب سے بڑا ہونے کے باوصف ذمہ داریاں بھی تھیں۔ اسکول میں شرارتی من چلوں کی ریشہ دوانیاں الگ۔ اتنا جھنجھٹ وہ اکیلے کیسے اٹھاتے۔ انہوں نے اپنے سے دو سال چھوٹے بھائی افضال کو اپنا پانڈی بنا لیا۔ پانڈی ہم اسے کہتے ہیں جو ہمارے حصے کا بوجھ اٹھا کے چلے۔ افضال بھائی نے بارضا و رغبت یا باعثِ مجبوری یہ ذمہ داری لے لی۔ بڑے بھائی کے بوجھ اٹھا لیے، کتابیں رکھ دیں۔ اس زمانے میں گھر داری میں بچوں کا بڑا حصہ ہوتا تھا۔ گلی میں ایک کمیٹی کا نلکا تھا اور پینتیس ڈول اور بالٹیوں کو اٹھائے ہوئے چھوٹے بڑے بچے اور بچیوں کا گلی میں ہجوم۔ بڑے بھائی جان کبھی پانی کا ڈول لے کے پانی لینے جاتے تو صبح سے شام ہو جاتی۔ ان کی باری ہی نہ آتی۔ آخر ہماری امی نے چھوٹے بھائی جان کے ہاتھ میں ڈول دے دیا۔ یہ ڈولے ہلاتے جاتے ایک کو ادھر گرایا دو کو ادھر پھینکا۔ بھاگ کے پانی بھر لاتے۔ گھر میں ہریالی آ گئی۔ گلی کے بعد بازار میں سودا سلف کی باری آئی۔ بڑے بھائی جان سودا لینے جاتے تو ساتھ بغل میں اپنی کوئی کتاب بھی لے جاتے۔ اکثر یوں ہوتا کہ سودا لیے بغیر منہ بسورے گھر آتے۔ پتا چلتا ان کے ہاتھ میں جو اٹھنی تھی وہ کہیں گر گئی یا چاندی کا روپیہ کوئی چھین کے لے گیا۔ یہاں پھر چھوٹے بھائی جان کے کندھے تھپتھپائے جاتے۔ یہ بھاگ کے بازار جاتے، ایک روپے میں سوا روپے کا سودا لے آتے۔ ہماری امی سمجھ گئی اس بیٹے کے ہاتھ میں لکشمی ہے۔ انہیں شاباشی دی اور سبزی کا تھیلا ہمیشہ کے لیے ان کے کندھے پہ ڈال دیا۔ میں تو کئی برس بعد پیدا ہوا۔ جب سودا سلف لانے کے قابل ہوا تو یہ مجھ سے آٹھ نہیں اٹھارہ سال بڑے لگتے تھے۔ اس وقت یہ

اپنے کام میں اتنے پختہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنا تھیلا اپنے کندھوں سے نہیں اتارا۔ ان دنوں پڑھائی لکھائی کے دو معیار ہوا کرتے تھے، انجینئر یا ڈاکٹر۔ بڑے بھائی جان انجینئر بن گئے۔ میں ڈاکٹر۔ افضال بھائی نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر لیا اور مدتوں کاغذوں کا پلندہ اٹھائے پھرتے رہے۔ بوجھ اٹھانے کی انہیں عادت تھی۔ کچھ انہیں لوگ بھی ایسے ملے جوان کی پیٹھ پر اپنی بوریاں رکھ کے دریا پار کرتے گئے۔ مگر انہیں مدتوں کنارا نہ ملا۔ ایک زمانہ تھا جب یہ انٹر میں پڑھتے تھے تو والد صاحب کے سر میں سودا سمایا کہ انھیں فوج میں کمیشن دلوانا ہے، روز صبح و شام ان کی دوڑ لگوائی جاتی۔ ڈنڈ پلوائے جاتے۔ یہ سر کے بل الٹے کھڑے ہو جاتے۔ چہرہ خون کی گردش سے سرخ ہو جاتا۔ قد کاٹھ کے سوہنے گھبرو تھے۔ اڑوس پڑوس میں کئی پڑوسنیں چھپ چھپ کے انہیں کسرت کرتے دیکھ دیکھ رہجھتی تھیں۔ مگر اوپر جو کہانی کار بیٹھا ہے، اس نے ان کے نصیب میں اس دور کی کوئی پڑوسن نہیں لکھی تھی۔ ظاہر ہے انسان اپنے نصیب کے اسکرپٹ سے باہر کی کوئی سطر نہیں جی سکتا۔ جب ان کے لیے یہی پرہیز طے تھا تو خدا نے ان کا ٹاکرا ایک کٹر قسم کے مولوی سے کرا دیا۔ اس مولوی نے انھیں طالب علم سے طالبان بنا دیا۔ ضیاء الحق کا دور ہوتا تو یہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی بجائے سیدھے کپتان بن جاتے، شومئی قسمت وہ ایوب خان کا زمانہ تھا، یہ ٹخنے ننگے کیے، نیفے چڑھائے شلوار قمیص پہن کے کوہاٹ پہنچے تو افسروں نے ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کچھ پوچھنے لگے مولانا، کسی نئی انگریزی فلم کی اسٹوری سناؤ۔

یہ لاحول پڑھنے لگے۔

لاحول پڑھنا ان کا تکیہ کلام سا ہو گیا تھا۔ گھر آتے تو جیسے کوئی دیو، آدم بو سونگھتا آ گیا ہو۔ ہر کوئی خوف سے اپنی جگہ دبک جاتا۔ مسکین سے ہمارے گھر میں ایک موٹی سی سبز بتی کی سوئی والا ریڈیو ہوا کرتا تھا۔ سوئی کی ڈور گھمانے سے جہاں اسٹیشن ٹیون

ہوتا وہاں سوئی کے اندر کی بتی کا پھیلاؤ کم ہو کے ایک لکیر سی رہ جاتا۔ سننے والا شاد ہو جاتا۔ ریڈیو کی آواز نکھر کے آنے لگتی۔ مگر ہمارے ان مولانا چھوٹے بھائی جان کی دہشت سے اس ریڈیو بے چارکی سوئی بھی تھرک جاتی۔ اچھا خاصا وہ کوئی گیت سنا رہا ہوتا، ادھر ڈیوڑھی میں یہ اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنکارا مارتے، ادھر بھاگم بھاگ کوئی ریڈیو کی سوئی گھما دیتا۔ ریڈیو سے خبریں یا قوالی نشر ہونے لگتی۔ ان دنوں ان کا فتویٰ تھا کہ ریڈیو سے ان دو چیزوں کے علاوہ کچھ اور سننا کفر ہے اور سننے والے کافر۔ اب گھر میں کسے اپنا ایمان پیارا نہیں تھا۔ ہر کوئی سہار رہتا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ ان کی شامت آ گئی۔ شٹل کاک برقعہ پہنو تو اسکول جاؤ ورنہ خبردار، بڑے بھائی جان پر بھی فتوے جاری ہونے لگے۔ یہ پینٹ شرٹ اور ٹائی پہن کے کھانا کھاتا ہے تو اپنے برتن الگ رکھو، کوئی ایک آفت، توبہ توبہ۔ میں تو چھوٹا تھا بچا رہا۔ وہ تو عین موقعے پہ امریکا نے مدد کر دی۔ یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے، امریکا کی بھیجی ہوئی چاند گاڑی چاند پر اتر گئی۔ ٹی وی والوں نے چاند تک کا سارا سفر براہ راست دکھا دیا۔ یہ لاکھ مولوی سہی، مگر تھے سائنس کے گریجویٹ، رات بھر چاند پر چاند گاڑی کو پھرتے دیکھتے رہے، صبح نیفے اڑس کے مسجد میں پہنچے تو ان کی جگ راتی آنکھوں نے مسجد کے مولوی صاحب کو رات بھر کی خبر دے دی۔ مولوی صاحب جلال میں آ گئے۔ گرج کے بولے تو بھی کافر ہو گیا، یہ حیران، مولوی صاحب گرجتے گئے، غضب خدا کا، ہمارے ہاتھ چومنے والا سمجھتا ہے آسماں کی بلوری چھت توڑ کر کافر چاند پہ جا اترے گا۔ استغفر اللہ نکل جا، تو مردود ہو گیا۔ تو نے ہماری مسجد پلید کر دی۔ کچھ مولوی کے چہیتے آگے بڑھ کے انہیں دھکے دینے لگے، یہ ہکا بکا، یہ ہوا کیا میرے ساتھ! مولوی صاحب یہاں بھی نہیں رکے۔ اپنے چیلوں کو حکم دیا جن جن صفوں پہ افضال کے پاؤں پڑے ہیں انھیں باہر گلی میں لے جا کے چلتے پانی سے دھوؤ، پھر بچھاؤ۔ یہ پلید اس مسجد

میں پھر کبھی نہ آئے۔ سن لیا سب نے۔ یہ مسجد سے دھکے کھا کے باہر گرتے پڑتے اٹھے اور زیرِ لب بولے، میں نے بھی سن لیا مولوی صاحب۔ اٹھ کے گھر نہیں آئے، سیدھے حمام پہ گئے اور داڑھی منڈوا دی۔ گھر آئے اور ریڈیو کی پھیلی ہوئی آزردہ سوئی کی روشنی کو گھما کے کسی من چلے گیت کو ٹیون کر کے پیر گھمانے لگے۔

گھر میں خوش گوار حیرت کا طوفان آ گیا۔

آواز ان کی شروع سے سریلی تھی۔ گیت سنتے سنتے گنگنانے لگے، پھر باقاعدہ پکے گانوں کا ریاض شروع کر دیا۔ خدا نے بھی ان کا ریڈیو کے لیے کہا ہوا فتویٰ یاد رکھا تھا۔ ان کا رزق ہی ریڈیو کے محکمے میں لکھ دیا۔ اب تو یہ گیت اور سنگیت پہ خود سند تھے ریڈیو پاکستان میں اپنے سترہ سالہ قیام کی روداد انھوں نے اپنے قلم سے لکھ دی ہے، میں کیا کہوں۔ ہاں ریڈیو پاکستان کو چھوڑنے کی کہانی میں سرکار بابا فرید گنج شکرؒ کا ذکر کرنا چوک گئے ہیں۔ وہ کہہ دیتا ہوں۔ ہوا یوں کہ یہ پروڈیوسر سے سینئر پروڈیوسر بھی بن گئے مگر ان کے کندھوں سے آؤٹ ڈور ریکارڈنگ کرنے والا ریڈیو کا تھیلا نہ اترا۔ جہاں کہیں نیکی بدی، دھوم دھڑکا، یا لوگوں کا اکٹھ ہوتا یہ اسے ریکارڈ کرنے اپنا تھیلا لے کر پہنچ جاتے۔ شہر میں پھرنا پھرانا ہوتا تو ایک پرانا پینسٹھ ماڈل اسکوٹر ہوتا، شہر سے باہر جاتے تو بسوں ویگنوں کی دھکم پیل سے گزرنا پڑتا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا، بابا فرید گنج شکرؒ کا پاکپتن میں عرس آ گیا۔ بہشتی دروازہ کھل گیا۔ یہ اپنا ریڈیو بستہ کندھے سے لٹکائے دھکم ریلے میں باباؒ کی پراندی جا پہنچے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے لگے تو کندھے سے ریڈیو کے تھیلے کا فیتہ کھسک کے ان کی کلائی پہ آ گیا۔ یہ روہانسے ہو کے بولے۔

بابا، سترہ سال ہو گئے ہیں۔ اس تھیلے سے جان نہیں چھوٹی۔ اللہ سے کہہ کے میری اس سے جان چھڑائیں۔

بابا کی پراندی یہ بات ہوئی تھی۔ ان کے کان میں کیسے نہ پڑتی، پھر جن سے

انھوں نے آگے بات کرنی تھی، اس کے خزانوں میں کون سی کمی کا خدشہ تھا، بس ان کی کہی سنی گئی، ریڈیو پاکستان کو چھوڑ کے یہ لیبر منسٹری میں ڈائریکٹر بن گئے۔ گاڑی بنگلہ مل گیا۔ مگر میں سوچتا ہوں، ریڈیو پاکستان میں تھوڑے دن تھیلا اور اٹھا لیتے تو شاید اب وہ سارا محکمہ اٹھائے پھرتے۔ ان کی یہی عادت رہی ہے کہ ہل جوتنے میں سب سے آگے۔ وزن اٹھانے میں شیر۔ جب زمین پہ لگائے بیجوں سے پکے پھل پھول چکھنے کا موسم آیا تو تھیلا اٹھا کے اگلی کھیتی کی طرف چل دیے۔ ریڈیو پاکستان میں بھی شاید پہلے اٹھارہ بیس سالوں کی سختی کے بعد آسانیوں کی صبح ہونے لگتی ہے۔ بہر حال انھوں نے جس ڈبے سے جان چھڑانے کی دعا کی تھی وہ قبول ہو گئی۔

یہ لاہور سے کراچی چلے گئے۔ باقی سارے تھیلے چھوڑ گئے، ایک تھیلا ساتھ لے گئے۔ اس تھیلے میں سال ہا سال کی ان کی شاعری تھی۔ کیا پتا جب بابا فریدؒ نے ان کے کندھوں سے ایک تھیلا اتارا ہو تو دوسرا شاعری کا بستہ رکھ دیا ہو۔ بابا فریدؒ خوش کلامی کا سمندر ہیں۔ اس سمندر سے ایک دو بوندیں بھی کسی کو مل جائیں تو وہ ندی سے دریا ہو جاتا ہے۔ یہ تو ازل کے بے کنار دریا تھے۔ باباؒ کی آشیر باد ان کی شاعری کے پرتو میں نظر آتی ہے۔ بابا فریدؒ کی پکار انہیں پڑھ کے کانوں میں آتی ہے۔ ایک ہمیشہ رہنے والی شاعری کے لیے جس تیسری آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایسے ہی آستھانوں سے ملا کرتی ہے۔

ان کی شاعری میں التجائیں، دعائیں، جدائی، انتظار اور خواب سب ان کے اپنے بیتے ہوئے ہیں۔ دیکھے ہوئے ہیں۔ ایک ایک خواب کو انھوں نے مہینوں نہیں برسوں تنہائی، انتظار اور دکھ کی دھوپ میں جلا جلا کے جلا بخشتی ہے۔ اس لیے مجھے پتا ہے ان کی شاعری کا کوئی شعر، کوئی بند کچا نہیں ہے۔ یہ شاعری پال میں پکائے ہوئے آم نہیں ہیں، درختوں کی ٹہنیوں پہ چڑھے چڑھے پکے ہیں۔

یہ وہ کلام ہے جو جڑوں سے اکھاڑ دینے والی آندھیوں کے بیچ میں رہ کے بھی اپنی مٹی سے جڑا رہا۔ ٹہنی سے نہیں گرا۔ بجلیاں کڑکیں، آندھیاں آئیں لیکن یہ سلامت رہا۔ دھوپ کا موسم آیا اور یہ پکتا رہا۔ آخر رم جھم برکھا رت آئی اور انہوں نے اپنے اونچے آدرش درختوں پہ جھولنے ڈال کے اپنے آنگن میں گری ہوئی خرد کی پکی فصل جمع کر لی اور ہماری دسترس میں رکھ دی۔ اس لیے کوئی اور ان کا شکریہ ادا کرے نہ کرے، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

o

عالمی شہرت یافتہ، ممتاز ناول نگار

ابدال بیلا کی کتابیں

سیرت پاک ﷺ

- آقا ﷺ

ناول (اُردو)

- دروازہ کھلتا ہے
- ماؤ میووال
- سائیں بگو شاہ
- دہلی کی ارجمند بانو
- تم
- جادو نگری
- ٹرین ٹو پاکستان

ہندی ترجمہ (ناول)......مترجم: ڈاکٹر کیول دھیر، انڈیا

- دروازہ کھلتا ہے
- ندی کنارے
- شاہ سائیں
- لال قلعہ
- تم
- ارمیلا
- بٹوارا

افسانوی مجموعے (اُردو)

- انہونیاں
- سن فلاور

- رنگ پچکاری
- زیرلبی
- عرضی
- لب بستہ
- بوندا باندی
- بین بجاؤ
- بیلا کہانی
- ابدالیات

رپورتاژ (اُردو)

- پاکستان کہانی

انتھالوجی، شخصیت (اُردو)

- مفتی جی

سندھی ترجمہ (افسانہ)...... مترجم: نیاز ندیم کندھر

- سن فلاور

پنجابی اور گرمکھی (افسانہ/شاعری)...... مترجم گرمکھی: افضل راز

- کیکراں بیٹھ کلی، گنے دی پوری

ڈینش ترجمہ (افسانہ)...... مترجم: نصر ملک، کوپن ہیگن

- ابدال بیلا کی کہانیاں

نیپالی ترجمہ (ناول)...... مترجم: گیتا تریپاٹھی، کھٹمنڈو

- تم

انگریزی ترجمہ (افسانہ)

Hunderd Short Stories by Abdaal Bela

Translation by Prof. Sajjad Sheikh

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

BOOKS OF ABDAAL BELA
तुम
लाल किला
उर्मिला
नदी किनारे
KN-829-023
Rs. 700.00
www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2768-2
ISBN-13 978-969-35-2768-1
9789693527681